جھروکے میں چاند

افسانے

بشریٰ رحمن

افسانے

بشریٰ رحمن

تاج محل

جویریہ نیچے لابی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی اور میں تیز تیز قدموں سے دوڑتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کئی کئی منزلہ ہوٹلوں میں بعض اوقات لفٹ نیچے آنے میں دیر لگاتی ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہوا کہ نمبر ۲ لفٹ اسی وقت گراؤنڈ فلور پر آ کر رکی تھی اور اس میں سے ایک چنگبری میم سوئمنگ کاسٹیوم پہنے باہر نکلی تھی۔ ایسے جیسے سپیرے کی پٹاری سے نکلی ہو۔ گو میم کا لباس مختصر تھا اور ہر مرد کو دعوت نظارہ دے رہا تھا' مگر میں نے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ میری اپنی محبوبہ دلنواز لابی میں موجود تھی اور میں عجلت میں اپنا کیمرہ اپنے کمرے میں بھول آیا تھا۔ اب بھاگا بھاگا اپنا کیمرہ لینے جا رہا تھا۔ میرا کمرہ پانچویں منزل پر تھا۔ میں نے لفٹ میں گھستے ہی دوسرے مہمانوں کی پرواہ کئے بغیر نمبر ۵ کو دبا دیا اور یہ جادوئی اڑن کھٹولا اوپر کو اٹھنے لگا۔ واقعی لفٹ کا نام لوگوں نے اڑن کھٹولا کیوں نہیں رکھ دیا۔ بڑی حیرت انگیز ایجاد ہے پر ابھی میں پوری طرح سوچ بھی نہ پایا تھا کہ پانچویں منزل آ گئی۔ لفٹ کا دروازہ کھولا اور میں جلدی سے باہر آ گیا۔ پھر بچوں کی طرح دوڑتا ہوا کوریڈور میں آ گیا۔ ہر ہوٹل میں ایک نیم تاریک کوریڈور ہوتی ہے۔ جس میں قطار اندر قطار کمرے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ یہاں دن رات بے شمار مہمان آتے ہیں۔ کوریڈور پر اسرار اسی کی طرح ۔۔۔۔۔۔کسی کو نہیں پہچانتی ۔۔۔۔۔۔۔نہ کسی کو ایک دوسرے کا پتہ بتاتی ہے۔

جونہی میں اپنے کمرے کے قریب پہنچا' چونک گیا۔ کمرے کی چابی میرے ہاتھ میں تھی مگر میرا کمرہ کھلا تھا میں گھبرایا ہوا کمرے کے اندر گھس گیا کہ آخر میری عدم موجودگی میں کس نے میرا کمرہ کھولا ہے۔ اندر ایک خاتون کھڑی بستر پر چادر الٹ رہی تھی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی وہ پلٹ کر مڑی اور چادر کا کونا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ یہ تو ہر ہوٹل کا دستور ہے کہ مہمانوں کے جانے کے بعد کمرے صاف کر دیئے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ایک ''ماسٹر کی'' ہوتی ہے اور عام طور پر کمرے صاف کرنے کے لیے خواتین ملازم ہوتی ہیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی لڑکی میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ مگر میں نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر ادھر ادھر اپنا کیمرہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ جاتے ہوئے غالباً میں نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا تھا۔ مگر اب وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بظاہر تو میں نظریں گھما کر کیمرہ ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر دل میں شک کر رہا تھا کہ کہیں اس خاتون نما لڑکی نے نہ اٹھا لیا ہو۔

وہ مجھے یوں ہراساں دیکھ کر بولی۔ ''ایکسکیوزمی سر' کین آئی ہیلپ یو سر؟''

ہوٹل کے ملازمین کے مخصوص انداز میں وہ انگریزی بولنا جانتی تھی۔ میں نے جیسے جبریہ اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ”محترمہ! میں یہاں اپنا کیمرہ چھوڑ گیا تھا اب نظر نہیں آرہا۔“

اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر ”آشا“ کہہ کر آواز دی۔

مجھے یوں لگا جیسے یہ بھی کوئی جادو کی آواز ہے۔ کیونکہ دوسری لڑکی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر اچانک الہ دین کے جن کی طرح دوسری لڑکی غسل خانے سے باہر آئی۔ اس نے ہاتھوں پر پلاسٹک کے دستانے چڑھائے ہوئے تھے غالباً وہ غسل خانہ مانجھ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو ذرا جھجک گئی۔ پہلی لڑکی نے بڑی شائستگی سے کہا۔

”ابھی یہاں ایک کیمرہ پڑا تھا۔“

”وہ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی آخری دراز میں رکھ دیا تھا۔“ آشا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”مبادا صفائی کرتے وقت گر کر ٹوٹ جائے ------سوری سر“

پہلی لڑکی ادب سے بولی۔ ”ہم مہمانوں کی چیزوں کو چھوا نہیں کرتے۔ اس نے احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہاں رکھ دیا تھا۔“

اس نے جھک کر دراز کھولی اور بڑی سرعت سے کیمرہ نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔ مجھے اور بکواس سننے کی فرصت نہ تھی، میں نے شکریہ کہہ کر کیمرہ اٹھایا اور باہر آ گیا۔

یوں میرے دل میں یہ احساس ضرور جاگا کہ اس ہوٹل کی لڑکیاں بڑی ذمے دار ہیں۔

میں جلدی جلدی نیچے آیا۔ جویریہ سراپا انتظار کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ ٹائٹ جینز کے ساتھ کریم کلر کا ڈھیلا ڈھالا بلاؤز پہنا ہوا تھا جو اس کے خوبصورت جسم کی قیامتوں کو چھپانے سے قاصر تھا۔ اس نے کالی عینک لگا رکھی تھی اور اپنے بے تحاشا لمبے بالوں کی پگڑی بنا کر سر پر جوڑے کی صورت میں رکھی ہوئی تھی، وہ بے حد خوبصورت بلا لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے لب آپ ہی آپ مسکرائے۔ میرا دل چاہا کہ اس کے دلکش سراپا کو کیمرے میں نہیں بلکہ آنکھوں اور ہونٹوں میں بند کر لوں۔ اس نے مجھے دیکھا تو پیشوائی کو بڑھی اور پھر کار کی چابی گھماتے ہوئے میرے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا اور ہم لابی کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔

باہر خاصی گرمی تھی۔ مگر جب دو جوان دل ساتھ ساتھ دھڑک رہے ہوں۔ تو موسم دور چلا جاتا ہے۔ جوانی کے دنوں میں صرف ایک موسم ہوتا ہے۔ محبت کا موسم۔

جویریہ نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ میں اس کے بالکل ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا اور اپنے کیمرے کے لینس درست کرنے لگا۔

یہ میرا دہلی میں تیسرا دن تھا۔

مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میں برسوں سے یہاں رہ رہا ہوں۔ یقیناً اپنائیت کا یہ احساس مجھے جویریہ نے اور اس کے خاندان نے دیا تھا۔ اصل میں جویریہ کی امی میری سگی خالہ ہیں اور وہ دہلی میں رہتی ہیں۔ میری ایک ہی خالہ ہیں اور میری امی کو اپنی اکلوتی بہن حلیمہ سے بہت محبت ہے۔ میری خالہ کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی شادی شدہ ہے اور امریکہ میں رہتی ہے۔ اور دوسری جویریہ ہے۔

ہم دو بھائی ہیں۔ ایک میں اور دوسرا اجمل۔

اجمل ابھی بہت چھوٹا ہے۔ میٹرک میں پڑھتا ہے۔ اس لیے امی جان اپنی زندگی کی کچھ خواہشیں میرے توسط سے پورا کرنا چاہتی ہیں۔ میری امی کی یہ دلی خواہش ہے کہ میں اپنی خالہ کی بیٹی جویریہ سے شادی کر لوں۔ گو خالہ حلیمہ کبھی کبھار کراچی آیا کرتی تھیں اور ہمارے ہاں ٹھہرا کرتی تھیں۔ اور مجھے بے تحاشا پیار بھی کیا کرتی تھیں۔ مگر میں نے ان کی بیٹی جویریہ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کبھی پاکستان نہیں آئی تھی اور میں اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں کہ جو لڑکی کو ٹھوک بجا کر دیکھے بغیر شادی پر رضامند نہیں ہوتی۔ یوں ٹھوک بجا کر تو میں کئی لڑکیاں کراچی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کے وقت اپنی امی کی پسند کو بھی ملحوظ رکھوں گا۔

اب جب گرمیاں آئیں تو امی نے مجھے دہلی جانے پر آمادہ کر لیا' میں نے ایک مہینے کی چھٹی لے لی۔ دلی اور آگرے کا ویزا لگوایا۔ کیونکہ مجھے تاج محل دیکھنے کا بچپن سے شوق تھا اور ہندوستان چل پڑا۔

امی نے ساری تفصیلات تو خالہ جان کو لکھ دی تھیں۔ مجھ سے صرف اتنا کہا تھا' اگر مجھے جویریہ پسند آ جائے تو میں فوراً اس سے نکاح کر لوں۔ رخصتی بعد میں ہو جائے گی۔

شاید جویریہ کو بھی کچھ اس قسم کی ہدایات کی گئی تھیں اس لیے کہ جویریہ نے مجھے ہوائی اڈے پر ہی متاثر کر لیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ ابھی امریکہ سے جرنلزم کی ڈگری لے کر آئی تھی۔ فر فر انگریزی بولتی تھی۔ مغربی لباس پہنتی تھی۔ انگریزی کیسٹ سنتی تھی۔ سارا دن مسکراتی تھی اور اس کے بھرے بھرے ہونٹ میرے دل میں گدگدی کرتے رہتے تھے۔

خالہ جان نے ائیر پورٹ پر بہت زور لگایا کہ میں ان کے ہاں ٹھہروں۔ مگر اباجی نے چلتے وقت علیحدہ لے جا کر مجھے کچھ ہدایات دی تھیں۔

انہوں نے کہا تھا۔

''بیٹا۔۔۔۔۔۔جس گھر میں رشتہ کرنا مقصود ہو اس گھر میں ٹھہرا نہیں کرتے۔ وہ لوگ مہمان پر غیر ضروری مدارات کا بوجھ لاد دیتے

ہیں اور اس کا اس طرح گھیراؤ کر لیتے ہیں کہ اس کے مشاہدے کی قوت مفلوج ہو جاتی ہے۔ دور رہ کر ان لوگوں کا جائزہ لینا چاہیے۔"

"دور کیسے رہوں؟" میں نے پوچھا تھا۔

"ہوٹل میں رہنا' کسی شاندار ہوٹل میں اور وہاں اس شان سے رہنا کہ نہ صرف تمہارا بلکہ تمہارے ملک کا نام بھی سر بلند ہو۔"

"جی ابا جی!"

میرے ابا جی کا ایک مبہم اشارا زندگی بھر کے لیے کافی ہوتا ہے۔

دہلی میں آ کر جب میں نے "تاج محل ہوٹل" کا انتخاب کیا تو میری خالہ اور خالو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ دہلی کا انتہائی خوبصورت اور مہنگا ترین ہوٹل ہے اور تو اور جویریہ بھی بے حد متاثر نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے اپنے گھر لے جانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر جب میں اپنی ضد پر اڑا رہا تو وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً وہ بھی اپنے حلقہ احباب کو یہ بتا کر متاثر کرنا چاہتے تھے کہ ان کا ہونے والا داماد' "تاج محل" میں رہ سکتا ہے۔

ابا جی نے ٹھیک کہا تھا۔ "تاج محل" ہوٹل نے میرا مرتبہ ان لوگوں کی نظر میں بہت بلند کر دیا تھا۔ ویسے تو میں ہوٹل میں برائے نام ہی رہتا تھا۔ سارا دن جویریہ کے ساتھ گھومتا رہتا اور رات کو بارہ ایک بجے آ کر سو جاتا اور پھر اگلی صبح ناشتہ کر کے نکل جاتا۔ دس بجے جویریہ مجھے لینے آ جاتی تھی۔ پہلے فون کر کے میرا پروگرام پوچھتی اور پھر آن وارد ہوتی۔

ان تین دنوں میں ہی حالات نے بتا دیا تھا کہ میں پھنس جاؤں گا' یہی بات تو میری خالہ اور میری امی چاہتی تھیں۔

میں نے مڑ کر جویریہ کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر عینک لگی تھی اور بڑی بے نیازی سے موٹر چلا رہی تھی۔ جوان لڑکی بڑی ظالم حقیقت ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔

کم بخت بڑی آسانی سے پہلو میں آگ لگا دیتی ہے۔"

"آج کہاں چلو گی؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں تم کہو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اصل میں مجھے تو تاریخی مقامات اور کھنڈر دیکھنے کا شوق نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا ـ ـ ـ ـ؟" اس نے اپنی کالی عینک اتار دی اور اپنی گیلی گیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر بولی۔

"تمہیں کیا دیکھنے کا شوق ہے؟"

''حسین خوبرو لڑکیاں۔''

''وہ تمہیں دلی میں کم نظر آئیں گی۔''

''میں نے دیکھ لیا ہے۔''

''پھر تمہیں کہاں لے جاؤں؟''

''اپنے سامنے بٹھائے رکھو۔''

اس پر وہ ہنسنے لگی۔

''تم ایسا کرو' تفضل کہ امریکہ چلے جاؤ اور وہاں اتوار کا دن کسی بیچ پر گزارا کرو۔''

''چھ سال امریکہ رہ کر آیا ہوں۔''

''اور بیچ پر بھی گئے ہو گے۔''

''ہاں' جاتا تھا۔''

''پھر۔۔۔۔۔۔؟''

''پھر مجھے امریکن عورت سے گھن آنے لگی۔''

''کیوں؟''

''عورت عریاں ہو تو اس کی جاذبیت ختم ہو جاتی ہے۔ ڈھکی ہوئی عورت کا حسن عجیب چیز ہوتا ہے۔''

جویریہ چپ ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔ ''تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی۔''

تو وہ بولی۔ ''مجھے سوئمنگ کرنے کا بہت شوق ہے اور ''تاج محل ہوٹل'' کا بہت شاندار سوئمنگ پول ہے' میں تو سوچ رہی تھی کہ ایک دن تمہیں ساتھ لے جاؤں گی اور خوب سوئمنگ کریں گے۔''

''چلوں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تمہارے ساتھ تو میں جہنم میں بھی جانے کو تیار ہوں۔''

وہ بھی ہنسنے لگی۔

''کدھر جا رہی ہو؟''

''قطب مینار۔۔۔۔۔۔۔دیکھو اگر کوئی دہلی آئے اور قطب مینار دیکھے بغیر چلا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس نے ہندوستان میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔''

''اور اگر کوئی دہلی آئے اور تمہیں دیکھے بغیر چلا جائے' تو تم لوگ اسے کیا کہتے ہو؟''

اس پر وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔

''تم صرف مجھے دیکھنے آئے ہو؟''

اس بار اس نے اپنی شفاف قاتل آنکھیں اٹھا کر میری جانب اس غرور سے دیکھا' جس میں صاف لکھا تھا کہ میں حسین عورت ہوں گھائل کر چکی ہوں یا گھائل کرنا جانتی ہوں۔

وہ سب جانتی تھی مگر میرے منہ سے اگلوانا چاہتی تھی۔ میں بہت سی لڑکیوں سے رسم و راہ رکھ چکا ہوں۔ عورت مرد کے منہ سے صرف ایک ہی جملہ سننے کی تمنائی ہوتی ہے کہ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے۔'' خواہ کسی سرزمین کی عورت ہو' کسی ملک کی ہو' کسی رنگ و ملت کی ہو۔۔۔۔۔۔۔ذرا سی اظہار محبت سے اس کی بے یقینی فطرت کو قرار آ جاتا ہے۔

ایسے موقعوں پر خوبصورت پر فریب جملے میں کئی لڑکیوں سے کہہ چکا تھا۔ مگر جویریہ سے چونکہ شادی کرنا مقصود تھی اس لیے مجھے عشقیہ انداز اختیار کرنا بھونڈا سا لگا۔ عمر پڑی ہے یہ سب بتانے کو۔

پھر ابھی میں اسے کچھ اور تنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔'' ہندوستان دیکھنے آیا تھا' مجھے کیا پتہ تھا' ہندوستان میں صرف تم ہی تم ہو۔''

''چالاک۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے دانت پیس کر ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھ دیا اور موٹر ایک دلخراش چیخ کے ساتھ اور تیز ہو گئی۔

میری خالہ دہلی کے صاحب حیثیت لوگوں میں سے ہیں۔ اسی لیے تو انہوں نے یہ جگہ چھوڑ کر مہاجر بننا پسند نہیں کیا تھا۔ ان کا عالیشان گھر ہے' جائیدادیں ہیں' کاروبار ہیں۔ یہ مجھے ان کا رہن سہن دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں معدودے چند مسلمان ہی صاحب حیثیت ہیں۔ یقیناً ان میں سے ایک میری خالہ بھی تھیں۔ یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

تمام دن میں جویریہ کے ساتھ گھومتا رہا تھا۔ رات کو ہم نے ایک لیٹ شو دیکھا تھا اور پھر تقریباً دو بجے رات میں تھک ہار کر اپنے کمرے میں آیا تھا۔

آ کر اپنے پلنگ پر لیٹا اور بستر کی گود میں دبا ہوا کمبل کھینچ کر نکالا تو مجھے اچانک خیال آ گیا کہ میرا کمرہ بے حد صاف تھا۔ غسل خانہ آئینہ نما چم چم کر رہا تھا۔ کمرے کی ہر شے قرینے سے لگی تھی۔ یعنی اس کمرے کے ساتھ کسی نے مشقت کی تھی۔ زندگی کا قرینہ کسی نہ کسی مشقت کا مرہون منت ہوتا ہے۔ جویریہ پری بنی سارا دن میرے ساتھ گھومتی تھی۔ ہم نے ریستوران میں کھانا کھایا۔۔۔۔۔۔ کافی پی۔۔۔۔۔۔ پکچر دیکھی۔۔۔۔۔۔ ہنسے کھیلے' محبت کی باتیں کیں۔

پھول بن بن کر تمام دن بکھرتی رہی تھی جویریہ۔۔۔۔۔۔

مگر جویریہ ہی کی طرح تھیں وہ لڑکیاں جو سارا دن ہوٹل کے کمرے صاف کرتی رہی تھیں اور چادریں بدلتی رہی تھیں۔

زندگی میں کتنے تضادات ہوتے ہیں؟

میں اس قدر تھک چکا تھا کہ زیادہ غور نہ کر سکا اور سو گیا۔

دوسرے دن تیار ہو کر میں کوریڈور میں نکلا تو کچھ لڑکیاں گلی میں کھڑی ہنس رہی تھیں۔ دو لڑکیاں صاف چادروں اور تولیوں سے بھری ہوئی ٹرالیاں گھسیٹ کر لا رہی تھیں اور ایک لڑکی نوٹ بک میں کچھ اندراج کر رہی تھی۔

''کرشنا۔۔۔۔۔۔''

ادھر سے آواز آئی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ تب میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی کل والی لڑکی تھی۔ اس لڑکی میں کوئی حسن نہیں تھا۔ پکا سانولا رنگ جو دہلی میں میں نے اکثر دیکھا تھا۔ بے حد دبلی پتلی' کس کے ایک چٹیا کر رکھی تھی۔ چہرے پر میک اپ نہ تھا۔ اور اس نے ہوٹل کا اوور آل پہن رکھا تھا۔ پتہ نہیں اس کی کیا عمر ہو گی؟ ویسے بھی بدصورت لڑکیوں کی عمر کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ میں بے نیازی سے چلتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا۔ آخر تو وہ ساری نوکرانیاں ہی تھیں۔

پہلا ایک ہفتہ میں اس قدر گھوما پھرا کہ تھک گیا۔۔۔۔۔۔ اور سوچا' ایک دن پورا سو کر گزارا جائے اور اس کے بعد امی جان کو مفصل خط لکھا جائے۔

چنانچہ اس رات جب جویریہ نے مجھے تین بجے رات کو چھوڑا تو میں آ کر بے سدھ ہو کر سو گیا۔ مگر سونے سے پہلے میں نے اپنے کمرے کے باہر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا ٹیگ لگا دیا۔ یہ میں نے جویریہ سے کہہ دیا تھا' آج سارا دن آرام کروں گا۔

سو سارا دن میں یوں سویا جیسے شرطیں باندھ کر سوتے ہیں۔ شام کے پانچ بجے فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی نے مجھے جگا دیا۔ بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف جویریہ تھی۔

برس پڑی۔

"خدا کی قسم' میں نے گھوڑے بیچ کر سونے کا محاورہ سو بار سنا تھا' آج اس کا مطلب سمجھ میں آیا ہے۔ کئی بار فون کر چکی ہوں۔ تم نے اٹھایا ہی نہیں۔ پھر میں نے آپریٹر سے کہا' وہ ملائے۔ اس نے بھی ہر بار "نو رپلائی" کا جواب دیا۔ پھر میں نے اس سے التماس کی کہ کسی کو کمرے میں بھیج کر پتہ لگائے کہ ماجرا کیا ہے۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ تم نے باہر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا ٹیگ لگا رکھا ہے۔ اللہ۔۔۔۔۔۔۔تم اس طرح سوتے ہو؟"

"جی" میں نے آہستہ سے کہا۔ "کسی حسینہ نے تھکایا ہو تو اسی طرح سوتا ہوں کہ پھر کوئی جگا نہیں سکتا۔ اس حسینہ کے سوا۔"

"سچی Its Terrible ________" اس نے لمبی سانس چھوڑ کر کہا۔ "اب بھی جاگے ہو یا نہیں؟"

"جی تو چاہتا ہے کہ کہہ دوں۔ ابھی نہیں جاگا ہوں' تم آ کے اپنے معطر ہاتھوں سے جگاؤ۔"

"میری بات سنو۔" وہ میرے فقرے پر لجائے بغیر بولی۔

"جلدی سے شاور کے نیچے کھڑے ہو جاؤ' ابھی طبیعت درست ہو جائے گی۔"

"پھر وہاں کھڑا رہوں' یا تمہارا انتظار کروں؟"

"تفقل۔۔۔۔۔۔" اس نے دانت پیسے۔ "You are a Limit....."

اس پر مجھے مزہ آیا' آخر کو لڑکی نکلی۔

کہنے لگی۔

"کتنی دیر میں تیار ہو جاؤ گے؟"

"کس قسم کی تیاری درکار ہے تمہیں؟"

"بھئی آج تم نے سارا دن سو کر گنوایا ہے۔ رات جاگنے کا پروگرام ہونا چاہیے۔"

"تم بتاؤ پروگرام"

"تمہیں معلوم ہے یہاں ہوٹل میں ڈسکو تھے ہے؟"

"ہاں!"

"تم آج رات مجھے انوائٹ کرو۔"

"تم آجانا' تکلف کی کیا بات ہے۔"

"باہر کے لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ صرف وہ لوگ آسکتے ہیں' جو ہوٹل میں ٹھہرنے والے مہمانوں کے دوست یا عزیز ہوتے ہیں یا جنہیں وہ بطور خاص مدعو کریں۔"

"ٹھیک ہے' ابھی میں ڈسکو تھے کی مینجمنٹ کو فون کروں گا۔"

"میں اپنے کچھ دوستوں کو بھی لے آؤں؟"

"لے آنا بھئی۔۔۔۔۔۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے' ہم تقریباً آٹھ لوگ ہوں گے۔"

"اچھا!" وہ بولی۔ "ممی پوچھ رہی ہیں' رات کا کھانا کہاں کھاؤ گے؟"

اسی وقت مجھے یاد آیا کہ آج دوپہر کو میں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شاید سویا رہا اور وقت نکل گیا۔

میں نے اسے بتایا تو وہ برس پڑی۔ "آخر اس طرح کیوں کر رہے ہو؟"

"اصل میں اتنے دنوں سے ضیافتیں کھا رہا ہوں' آج پرہیز کا موڈ تھا۔ ورنہ یہاں سے جاتے وقت نئی پتلونیں سلوانی پڑیں گی۔"

"اُفوہ' تفضّل تم بالکل عورتوں کی طرح اپنے فگر کا خیال رکھتے ہو۔"

"اور تم مردوں کی طرح اپنے جگر سے بے نیاز ہو۔"

اس پر وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا جلدی بتاؤ' کھانا کہاں کھاؤ گے؟"

"میرا خیال ہے کہ کھانا ہم سب اس ہوٹل میں کھائیں گے' تم اپنے دوستوں کو لے آنا۔ آج باہر جانے کا موڈ نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس وقت پانچ بج رہے ہیں' آٹھ بجے تک تم کیا کرو گے؟"

"پہلے چائے منگوا کر پیتا ہوں۔ پھر تمہاری ہدایت کے مطابق نہاؤں گا۔ تازہ دم ہو کر کراچی خط لکھوں گا۔ جب سے آیا ہوں' انہیں مفصل خط نہیں لکھا۔ آٹھ بجے لابی میں پہنچ کر تمہارا اور تمہارے دوستوں کا انتظار کروں گا۔"

"فرسٹ کلاس۔۔۔۔۔۔" وہ ایک دم سے بولی۔

"خالہ جان کو کیا لکھو گے؟"

اس کا عورتوں والا تجسس پھر بیدار ہو گیا۔

"انہیں لکھوں گا کہ دلی میں ایک بلا مجھے چمٹ گئی ہے۔ جان نہیں چھوڑتی۔ سوتے جاگتے میں تنگ کرتی ہے۔"

"انہوں نے اگر فیصلہ تم پر چھوڑ دیا تو کیا کرو گے؟"

"زنجیر ڈال کر اسے وطن لے جاؤں گا۔"

"یہ اس غریب کی سزا ہے۔"

"اور وہ کسی غریب الوطن کو ستاتی بھی تو ہے۔"

جب ٹیلیفون پر جوان لڑکی خود بخود چھیڑ رہی ہو تو آدمی کھل جاتا ہے۔

"میں نے تمہیں کب ستایا ہے تفضل ـــــــ؟" اس نے مصنوعی تردد سے کہا۔ "سارا دن تو تمہیں لیے لیے پھرتی ہوں۔"

"اور ساری رات ـــــــ؟"

اور وہ ہنسنے لگی۔

"شریر ـــــــ اچھا' اجازت دو۔ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ ٹھیک آٹھ بجے لابی میں پہنچ کر تمہیں فون کروں گی۔"

"میں تیار رہوں گا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ Reception پر فون کر کے چائے کا آرڈر دیا۔ پھر امی جان کو خط لکھنے لگا۔ ویسا ہی خط جس کی امی جان توقع کر رہی تھیں۔ آخر میں' میں نے لکھا تھا ـــــــ "میرا خیال ہے کہ میں نکاح کے بعد شادی کر کے آؤں گا اور اس کام کے لیے کچھ دن اور رکنا پڑا تو اپنا ویزا بڑھوا لوں گا' بار بار آنا جانا مجھے پسند نہیں ـــــــ"

میں خود ہی مسکرایا۔ میری امی جان جائیں گی کہ میں اسیر ہو چکا ہوں۔ میری عادت ہے' جب میں فیصلہ کر لیتا ہوں تو جلدی کام کو انجام تک پہنچا دیتا ہوں۔

رات کے آٹھ بجے میں تیار بیٹھا تھا کہ جویریہ کا فون آ گیا۔ اس نے کہا وہ سب دوستوں کے ساتھ نیچے لابی میں میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں نے اپنے اوپر خوشبوؤں کی بارش کی اور کمرہ بند کر کے نیچے آ گیا۔

جویریہ نے اپنے دوستوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں ایک لڑکی تبسم اور دو لڑکے سلیمان اور کریم مسلمان تھے' باقی دو لڑکیاں اور تین لڑکے ہندو تھے۔ میں انہیں تاج محل ہوٹل کے سب سے شاندار ریستوران ''حویلی'' میں لے گیا جہاں رات کو سنگیت اور رقص کا بندوبست بھی ہوتا ہے۔ خوبصورت چہلوں کے درمیان ہم سب نے کھانا کھایا اور قوالیاں سن سن کر سر دھنتے رہے۔ رات کے بارہ بجے ہم وہاں سے اٹھے اور ''ڈسکو تھے'' پہنچ گئے۔ اس نیم تاریک آرکسٹرا روم میں بے شمار جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈانس فلور پر مختلف رنگوں کی ہلکی ہلکی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں اور کچھ جوڑے بے تحاشا ناچ رہے تھے۔

ہم سب بھی ایک کیبن میں بیٹھ گئے اور اس قسم کے ہنسی مذاق کرنے لگے۔ جو نوجوان لوگ رات کے اس پہر میں کرتے ہیں۔

میں نے ان سب کے لیے فریش اورنج جوس کا آرڈر دیا اور ساتھ ہی کہہ بھی دیا۔ ''بھئی میں نے ناگ پور کے سنگتروں کی بہت شہرت سنی تھی' مجھے یہ سنگترے پسند نہیں آئے۔ آخر یہ سنگترے اتنے میٹھے کیوں ہوتے ہیں؟''

''کیوں سنگتروں کو کھٹا ہونا چاہیے' تفضل جی؟'' کملا نے اٹھلا کر کہا۔

''کھٹے تو انگور ہوتے ہیں۔'' نرملا نے شوخی سے کہا۔

''ہمارے ہاں انگور بھی کھٹے نہیں ہوتے۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''دراصل ہمیں دیکھتے ہی ہر شے میٹھی ہو جاتی ہے اور خود بخود شہد بن کر ٹپکنے لگتی ہے۔

''واہ۔۔۔۔۔۔'' اب تبسم مسکرائی۔ ''خود پسندی کی اس سے بڑی کوئی مثال نہیں۔ اس لیے آپ کو ترش سنگترے پسند ہیں۔''

''ہاں تبسم جی! سنگترے کو ذرا سا ترش ہونا چاہیے جس طرح حسین لڑکی تھوڑی سی ترش ہوتی ہے۔''

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

''آپ بڑے دلچسپ ہیں۔'' کیلاش بولا۔

''اسی لیے تو جویریہ نے گلے سے لگا لیا ہے۔''

اسی وقت میوزک کا پہلا دور ختم ہو گیا۔ سب چونک کر کھڑے ہو گئے۔ جب موسیقی کا نیا ریلا شروع ہوا تو ہمارا سارا گروپ فلور پر تھرک رہا تھا۔ مجھے ان سب نے پرجوش دعوت دی تھی اور میں ان پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے فلور پر چلا گیا تھا۔ امریکہ میں' میں نے ہر قسم کا ناچ سیکھا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں ان کے ساتھ ہاؤ' ہو کرتا رہا۔ تھرکتا رہا۔ پھر ہانپتا ہوا اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

جب ذرا دم میں دم آیا تو میں ناچنے والوں پر غور کرنے لگا۔ اس وقت پہلی مرتبہ مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ ناچنے سے بہتر یہ

ہے کہ رقص کرنے والوں کا دور بیٹھ کر جائزہ لیا جائے تب آپ پر حضرت انسان کی عجیب وغریب جبلتیں کھلتی ہیں۔ ناچنے والے کیسی کیسی مضحکہ خیز شکلیں اور زاویے بناتے ہیں۔ کس کس طرح اپنا آپ نمایاں کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ اپنے خاموش جذبوں کو اعضاء کی زبان دیتے ہیں۔

میں نے جوس کا ایک اور گلاس منگایا اور اس وحشیانہ رقص کو دیکھنے لگا۔

دو تین بار مجھے جویریہ نے اشارے سے بلایا مگر میں نے معذرت کر دی۔ ایک بار رقص میں شامل ہو کر میں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ میں اس میدان کا بھی شہسوار ہوں مگر اب دور بیٹھ کر نظارا کرنا چاہتا ہوں۔ بعض نظارے بھی دل میں اتر جاتے ہیں۔ میری طرح جو تھک جاتا تھا' وہ فلور سے ہٹ جاتا تھا اور اس کی جگہ نیا جوڑا آ جاتا۔ اب ایک حبشی جوڑا اور کچھ غیر ملکی جوڑے بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ جویریہ باری باری ہر لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی اور غضب کا ناچ رہی تھی۔ اس کا چنا ہوا دوپٹہ کھل کر دور جا گرا تھا اور چست پاجامے میں اس کی ٹانگیں یوں تھرک رہی تھیں جیسے بجلی کی ہوں۔ کمال اسٹیمنا تھا اس لڑکی میں۔ میں رشک سے اسے بار بار دیکھ رہا تھا۔ باقی لڑکیاں بھی تھک گئی تھیں اور اب میرے ساتھ بیٹھی جوس پی رہی تھیں۔ اب جویریہ اس حبشی کے سامنے آ گئی تھی۔ اور حبشی کسی گوری کے آگے کھڑا ناچ رہا تھا۔

غرض صبح چار بجے تک جویریہ بغیر توقف کے ناچتی رہی تھی۔ آخر میں سب نے تالیاں بجا کر اسے رات کی ہیروئین قرار دیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر جویریہ کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی کمر پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور اس کا ریشمی کرتہ کمر کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ میں نے اس کی گیلی کمر کو اپنی گرم ہتھیلیوں میں تھاما اور ہم "ڈسکو تھے" کے نیم تاریک ہال سے باہر آ گئے۔ روشنی میں' میں نے دیکھا جویریہ کا گورا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھیگے بھیگے لگ رہے تھے' اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں لال ڈورے تھے۔ اور وہ ذرا بھی تھکی ہوئی نہیں لگ رہی تھی' میرا جی چاہ رہا تھا اس نیم مدہوشی کے عالم میں' میں اسے تھامے ہوئے کہیں دور نکل جاؤں جہاں شیشہ و جام ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اس سے شادی کرنا تھی اس لیے میں نے انہیں باہر جا کر خدا حافظ کہا۔ باہر رات کافی گرم تھی ۔۔۔۔۔۔ بلکہ اب تو صبح کی ہوائیں دبے پاؤں چل رہی تھیں۔ یہ ہوائیں بھی گرم تھیں۔ شاید انہوں نے جویریہ کے رخساروں کو چھو لیا تھا۔ رخصت کے وقت ہم ایک دوسرے کو شب بخیر کی بجائے صبح بخیر کہہ رہے تھے۔

میں تھکا ہارا' اپنے جذبوں کے زور سے ٹوٹا پھوٹتا کمرے میں آیا تو میرا کمرہ اسی طرح منتشر اور گندہ تھا جیسے چھوڑ گیا تھا۔ غسل خانے میں جا بجا پانی بکھرا تھا۔

صبح حسب معمول جب میں تیار ہو کر کوریڈور میں نکلا تو وہی لڑکی جس کا نام کرشنا تھا' ٹرالی گھسیٹتی آ رہی تھی۔ میں نے وہاں رک کر

بڑے غصے سے کہا۔ ''کل آپ نے میرا کمرہ کیوں نہیں صاف کیا تھا؟''

وہ سہم گئی اور ذرا پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''سر! چھ بجے تک تو آپ کے کمرے کے باہر ڈونٹ ڈسٹرب کی تختی لگی تھی' چھ بجے میری ڈیوٹی آف ہو جاتی ہے۔ ویسے میں ہوٹل کی مینجمنٹ سے پوچھوں گی انہوں نے۔۔۔۔۔۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں کھسیانا ہو کر آگے چل دیا۔

آٹھ بجے تو میں نے کمرہ چھوڑا تھا اور واقعی ڈونٹ ڈسٹرب کا ٹیگ نہیں اتارا تھا۔ جلدی جلدی واپس کمرے کی طرف گیا۔ ٹیگ ابھی تک لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے اتارا اور دور پھینک دیا۔

جب میں واپس جا رہا تھا تو وہ شرمندہ سی لڑکی نظریں جھکائے میرے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ بے چاری فاقہ زدہ' کمزور اور بدصورت لڑکی۔۔۔۔۔۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔

اس قسم کی نیم خواندہ لڑکیاں صفائی کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہیں۔۔۔۔؟

ان سے بھلا کون شادی کر سکتا ہے؟

میرے پاس صرف دلی اور آگرے کا ویزا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگلے ہفتے آگرہ چلا جاؤں اور شہرہ آفاق تاج محل اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ جب میں نے جویریہ کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔

''آگرہ میں اور تم اکٹھے جائیں گے۔''

''کیوں بھئی۔۔۔۔۔۔؟''

''ہاں'' اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

''وہاں جا کے تم کوئی قسم کھانا چاہتی ہو؟۔۔۔۔۔۔ کیا وہ قسم یہاں نہیں کھائی جا سکتی؟۔۔۔۔۔۔ کھاؤ میرے سر کی قسم۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر کہنے لگی۔

''تفضل! مجھے ایک بات کا ڈر ہے۔''

''کیا۔۔۔۔۔۔؟''

''پاکستان کے لوگ بہت۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے مذہبی قسم کے ہیں' مذہبی لوگ پرانی اقدار کے پابند ہوتے ہیں اور ہم لوگوں نے تو یہاں مذہبی اقدار اور پرانی روایات کی زنجیریں توڑ دی ہیں۔''

''تم نے دیکھا ہوگا کہ امریکہ اور یورپ کی کئی عورتیں پاکستانی مردوں سے شادیاں کر لیتی ہیں۔''میں نے پوچھا۔

''ہاں دیکھا ہے۔''

''اور پھر ان کے ساتھ آ کر پاکستان میں رہنے لگتی ہیں۔''

''ہاں ہاں-------''

''وہ کیوں آجاتی ہیں حالانکہ ہمارے اور ان کے کلچر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''صرف محبت کے ناتے پر۔عورت جب محبت کرتی ہے تو اپنا ایمان بھی محبت پر نچھاور کر دیتی ہے۔محبت میں وہ زمین بن جاتی ہے جس پر ہل چلایا جاتا ہے اور جو انواع واقسام کی نعمتیں اگلتی ہے۔شرط محبت ہے جویریہ''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔اسے میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔شاید میں نے زیادہ مشکل لفظوں کا سہارا لیا تھا۔ بہرحال-------اس کا اک اک نقش محبت کے تاثر میں ڈوبا ہوا تھا اور مجھے امید تھی کہ میں جلدی اسے سمجھا لوں گا۔

تین ہفتے ہو گئے مجھے دلی آئے ہوئے اور میں نے دلی کا چپہ چپہ دیکھ لیا تھا۔ طے یہ پایا کہ اگلے ہفتے میرا جویریہ سے نکاح ہو جائے گا اور پھر میں اور جویریہ ''تاج محل'' دیکھنے جائیں گے۔

پھر واپسی کا پروگرام بنائیں گے۔

اس روز ہم دن بھر آوارہ گردی کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے۔لیکن ایک جگہ جب میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے پتہ چلا کہ میرا بٹوہ کہیں گر گیا ہے۔اسی میں پاسپورٹ اور ضروری کاغذات بھی تھے۔اس بات نے مجھے ہراساں کر دیا۔گو جویریہ نے مجھے کافی تسلی دی کہ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرا دے گی اور اگر میرا پاسپورٹ نہیں ملا تو مجھے جلدی دوسرا پاسپورٹ دلوا دے گی۔مگر جیسے میرے سارے حوصلوں پر پانی پڑ گیا۔بہرحال دن گزر گیا۔رات کے نو بجے اس نے مجھے ہوٹل کے باہر ہی اتار دیا۔میں لفٹ میں بیٹھ کر اوپر آیا اور پھر مردہ قدموں سے چلتا ہوا کوریڈور پار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ غیر ملک کی سرزمین پر پاسپورٹ کتنی بڑی طاقت ہے اور جب جیب میں پاسپورٹ نہ ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے' تن میں روح نہیں ہے۔چابی کو گھماتا میں آگے بڑھا تو کوئی جھپٹ کر میرے سامنے آ گیا۔دیکھا تو کرشنا تھی۔اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اور بھی غصہ آیا۔

اس وقت وہ ہوٹل کے یونیفارم میں نہیں تھی۔میں نے بڑی ناگواری سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے آنچل کی اوٹ میں چھپا ہوا میرا بٹوہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

"کرشنا۔۔۔۔۔۔۔" میں ایک دم چیخا۔ "یہ آپ کو کہاں۔۔۔۔۔۔۔؟"

اس نے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ "آج جب آپ کوریڈور میں سے جلدی جلدی گزر گئے تھے تو شاید یہ آپ کی جیب سے نکل کر راہ میں گر گیا تھا۔ اسی وقت میں ادھر سے گزری تو میں نے کسی مہمان کا سمجھ کر اٹھا لیا۔ پاسپورٹ کھول کر دیکھا تو اندر آپ کی تصویر تھی۔ عام طور پر ہم ہوٹل کے مہمانوں کو نہیں پہچانتے۔ روز کئی آتے ہیں' کئی جاتے ہیں۔ اگر میں آپ کو نہ پہچانتی تو یہ بٹوہ Reception پر دے آتی مگر اس روز آپ سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ ہمارے ہمسائے ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں۔ میں نے پرس اٹھا کر خود رکھ لیا۔ چھ بجے تک آپ کا انتظار کیا مگر آپ نہیں آئے تو میں گھر چلی گئی تھی۔ اب دوبارہ آئی ہوں' یہ سوچ کر کہ آپ کو یہ بٹوہ نہ ملا تو آپ کس قدر پریشان ہوں گے۔"

اس وقت کرشنا مجھے اتنی اونچی مورتی لگی کہ میرا دل چاہا کہ میں اس کے قدم چھو لوں۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا' لوگ اور بیرے جا رہے تھے اور ہمیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے لہجے میں بڑی نرمی اور شفقت سمو کر کہا۔

"آپ ذرا میرے کمرے میں تشریف لائیں گی؟"

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

میں نے کہا۔ "یہاں کھڑے ہو کر بات کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ پلیز تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائیں۔"

وہ ڈرتی جھجکتی میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کے اندر آتے ہی میں نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور پھر بولا۔ "کرشنا! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ خدا کی قسم اگر یہ بٹوہ نہ ملتا تو میری ساری خوشی غارت ہو جاتی۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا' تاکہ اس غریب لڑکی کی کچھ مدد کر سکوں۔

"یوں تو اس احسان کا کوئی مول نہیں کرشنا۔۔۔۔۔" میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ "مگر میری طرف سے شکریہ کے طور پر۔"

اس نے میرے ہاتھ کو وہیں روک دیا اور جلدی سے بولی۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے گا' ورنہ مجھے بہت دکھ ہو گا۔ آپ نہیں جانتے میں نے یہ سب کیوں کیا۔ بس اب مجھے جانے دیں۔"

"نہیں کرشنا!" مجھے اس لڑکی پر ترس آیا۔ "آپ اپنے احسان کا بوجھ مجھ پر ڈال کر جا رہی ہیں۔"

''سر پلیز' میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ مجھے جانے دیں۔''

''کرشنا!'' میں نے ذرا زور دے کر کہا۔ ''تمہیں تمہارے بھگوان کی سوگندھ''

''میں کرشنا نہیں ہوں۔'' وہ ایک دم چیخی۔ ''کم از کم آپ مجھے کرشنا نہ کہیں۔''

وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے اس کے کانپتے ہوئے وجود کو پکڑ کر اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ جذبات کے جس اسٹیج پر وہ پہنچ چکی تھی' وہاں میں اس سے سب کچھ اگلوا سکتا تھا۔ میں نے اسے پانی کا ایک گلاس پلایا۔ تسلی دی اور اسے ہمسائیگی کا واسطہ دیا کہ وہ سب کچھ مجھے بتا دے۔

بڑی دیر کے بعد بولی۔

''آپ سے جھوٹ بولنے کو جی نہیں چاہا اور زندگی میں پہلی بار جب آپ نے کرشنا کہا تو مجھے برا لگا۔ ورنہ یہاں پر ہر کوئی مجھے کرشنا کماری ہی سمجھتا ہے۔ اصل میں میرا نام فاطمہ ہے' میں مسلمان ہوں اور میری ایک بیمار ماں ہے۔ میں نے بی اے تک پڑھا ہے' نوکری حاصل کرنے کے لیے یہاں نام بدلنا پڑتا ہے۔ آپ یقین کیجئے' میں نے صرف اپنا نام ہی بدلا ہے' دل اور مذہب نہیں بدلا۔ آپ اس دیس سے آئے ہیں جہاں کے ہم خواب دیکھتے ہیں۔ میرا دل نہیں چاہا کہ آپ مجھے کرشنا کہہ کر بلائیں۔''

''ماں کے علاوہ تمہارا اور کون ہے یہاں؟''

میرا لہجہ یکا یک بدل گیا۔

''اور کوئی نہیں۔'' اس نے آنسو صاف کر لیے۔

''سب عزیز پاکستان چلے گئے ہیں۔ بچپن میں باپ بھی ہندو مسلم فسادات میں شہید ہو گیا تھا۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میری ایک پھوپھی کراچی میں رہتی ہیں ان کے بیٹے سے بچپن میں میری منگنی ہو گئی تھی۔ ماں نے بہت خط لکھوائے۔ ان کو بلوایا مگر انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی وہیں کر دی۔ تب سے میں ملازمت کر رہی ہوں۔ بھلا بچھڑنے والوں کو کون ڈھونڈنے آتا ہے؟''

اس بدصورت لڑکی کے چہرے پر سوز بکھر آیا تھا۔

اس کی کلائیوں کی پتلی پتلی ہڈیاں اس کی مشقت اور مجبوریوں کی داستان سنا رہی تھیں۔ اس کا ہرا دوپٹہ اس کے دل کی بات چھپانے سے انکار کر رہا تھا اور اس کی سانولی پیشانی پر سجدوں کے دو نشان رو رہے تھے۔

''اب مجھے اجازت دیجئے۔''

وہ کھڑی ہوگئی' مجھے پتہ چل گیا وہ کیوں اتنی مہذب زبان بولتی تھی۔

''سنیئے!''

میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹ اپنی جیب میں واپس رکھ لیے۔

''ہم مذہب ہونے کے ناتے ہی کیا آپ میری ایک التجا مانیں گی؟''

''جی''

''کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھایئے۔''

''جی؟''

اس نے حیران حیران' جذبوں سے خالی خالی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''میں آپ کا مہمان ہوں' ہمسایہ ملک سے آیا ہوں' آپ کا ہم مذہب ہوں' کیا آپ مجھے یہ اعزاز نہ بخشیں گی؟''

''جی ضرور بخشوں گی۔'' اس نے نظریں جھکا لیں۔ اسے میرے خلوص پر اعتبار آ گیا تھا'' بلکہ مجھے اس قابل سمجھ کر آپ مجھے بہت بڑا اعزاز بخش رہے ہیں۔ ورنہ میں اس قابل ہرگز نہیں ہوں۔ میں تو اس ہوٹل کی ادنیٰ سی ملازمہ ہوں۔''

''میں کل رات آٹھ بجے آپ کا انتظار کروں گا۔'' میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''اس ہوٹل میں نہیں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''جہاں آپ کہیں گی۔''

میں نے اس کے ساتھ ہوٹل اور وقت طے کر لیا تو وہ چپکے سے کمرے سے نکل گئی۔ جیسے آہ دل سے نکل جاتی ہے۔

دوسری رات میں وقت سے پہلے کناٹ پیلس کے اس ہوٹل میں پہنچ گیا تھا اور کھانے کی میز پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ڈرتی جھجکتی اندر آئی۔ اس نے ایک سستی سی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ بے جان آنکھوں میں کاجل کی ایک لکیر تھی۔ آج وہ اچھی لگ رہی تھی۔ بس اتنی جتنی ایک جوان عورت اچھی لگ سکتی ہے۔

وہ چپکے سے آ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ مشکور مشکوری مجوب مجوب سی۔

میں نے بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کے لیے اس کی ماں کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اور بہت سے لایعنی سوال کیے۔

اتنے میں کھانا آ گیا۔

وہ جلدی جلدی ہر شے نکال کر میرے آگے رکھنے لگی۔

اس کے مشقت کرنے والے ہاتھ دیکھ کر یکایک مجھے جویریہ کے خوبصورت اور ملائم ہاتھ یاد آ گئے۔ آج میں نے بڑی مشکل سے جویریہ کو ٹالا تھا کہ جس شخص نے مجھے بٹوہ لا کے دیا ہے' آج اس کو میں نے کھانے پر مدعو کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ تب کہیں جا کر اس نے میری جان چھوڑی تھی ورنہ وہ تو ساتھ آنے پر ہر ہر طرح آمادہ تھی۔

جویریہ کا خیال آتے ہی مجھے ''ڈسکو تھے'' والی رات یاد آ گئی۔ اس کا والہانہ انداز۔۔۔۔۔۔۔ ناچنا۔۔۔۔۔۔۔ تھرکنا ۔۔۔۔۔۔۔ قہقہے لگانا۔۔۔۔۔۔۔ وہ زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ جو کسی نوجوان کے خوابوں کی آماجگاہ بن سکتی تھی۔ اردگرد ہوٹل میں ویسی ہی لڑکیاں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں' طرح دار' طرار' شوخ' چہکتی ہوئی۔

فاطمہ ڈری سہمی اپنی پلیٹ پر جھکی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا صاف ستھرا کمرہ اور چم چم کرتا غسل خانہ یاد آ گیا۔ میرے کمرے کا غسل خانہ اس قدر صاف ہوتا تھا کہ اس میں سے اپنا چہرہ بھی نظر آتا تھا۔ میں دو عورتوں کے ہاتھوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

ایک عورت کے ہاتھ دل گرماتے ہیں اور رقص کرتے سے جذبات میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ دوسری عورت کے ہاتھ گھر کی ہر شے میں نمایاں ہوتے ہیں اور تھپک تھپک کر لوریاں دیتے ہیں۔

ساری دنیا میں ہر کرشمہ عورت کے دو ہاتھوں کا ہے۔

ایک ہفتے کے بعد میں فاطمہ سے شادی کر کے اسے پاکستان لے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ دلہن بنی کھڑی تھی۔ اس نے ایک سرخ بنارسی ساڑھی باندھ رکھی تھی اور اس نے سانولی انگلیوں میں صرف ایک ڈائمنڈ کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ صرف یہی دو چیزیں میں اس غریب الوطنی میں خرید سکتا تھا۔ جب ہم پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو اندر لاؤنج میں آ کر بیٹھتے ہی فاطمہ نے آہستہ سے پوچھا۔

''آپ کو کہیں اس بات کا افسوس تو نہیں کہ آپ تاج محل دیکھے بنا جا رہے ہیں؟''

''نہیں فاطمہ''

میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہر انسان کو اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی تاج محل ضرور تعمیر کرنا چاہیے جسے انسانیت ہمیشہ یاد رکھے۔''

◆◆◆

بددعا

سہاگ رات اگر بن آہٹ کے گزر جائے تو دلہن کو تعجب ہوتا ہی ہے نہ صرف تعجب بلکہ رنج' دکھ' صدمہ۔۔۔۔۔۔۔۔ جو بھی کہہ لیں کہ جو تصور صدیوں سے سرخ کپڑوں کے ساتھ وابستہ چلا آیا ہو اس تصور کے معنی بدلنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔

آمنہ پر بھی یہ پہاڑ پہلی رات ہی گرا۔

جب کسی پر پہاڑ آن گرتا ہے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ آمنہ کے اندر بھی توڑ پھوڑ کا عمل جاری تھا۔ وار کاری تھا۔ جعفر رات گئے اندر آیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سے اس کی بے حسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا۔

''مجھے افسوس ہے۔''

''کس بات کا؟''

آمنہ کا رواں رواں کمان بن گیا۔

کافی دیر خاموشی طاری رہی۔

وہ کہنے کو الفاظ ڈھونڈتا رہا اور آمنہ سننے کو ہمت مجتمع کرتی رہی۔ آمنہ نے تو ہمت مجتمع کر لی مگر جعفر کو صحیح الفاظ نہیں ملے۔ جوتے اتارے' کپڑے بدلے' تکیہ اٹھا کر صوفے پر چلا گیا۔

اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر پھر بھی۔۔۔۔۔۔۔ آمنہ کچھ سننا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر لاوے کا پکنا پسند نہیں تھا۔ زندگی کے کڑے لمحوں میں جی چاہتا ہے نا۔۔۔۔۔۔ کہ زلزلہ آ جائے' طوفان آ جائے۔ کچھ تو ہو۔ جس سے غیر یقینی اور مبہم لفظ ٹوٹے۔

''میں آپ کی توقع کے خلاف کر رہا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں۔''

فقرے کو توڑ مروڑ کے جعفر نے ادا کر دیا اور منہ پھیر کر سو گیا۔

آمنہ کے گھونگھٹ میں آگ لگ گئی۔ گھونگٹ بھڑ بھڑ جلنے لگا اور نیر جھر جھر بہنے لگے۔ اس نے آنچل کی آگ کو خون کے آنسوؤں سے بجھایا۔ خوب رو چکنے کے بعد اٹھ کر کپڑے بدلے منہ دھویا اور بستر پر واپس آ گئی۔

جعفر سچ مچ سو رہا تھا۔

وہ کڑیل جوان جس کے ساتھ تین ماہ پہلے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ منگنی پر اس نے جعفر کو بھر کے دیکھا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' گورا رنگ' گھنی مونچھیں' سیاہ خوبصورت بال' بھرے بھرے ہونٹ' ہاتھ پاؤں مضبوط' چال میں وقار' سوٹ میں لاٹ صاحب لگتا تھا اور شلوار قمیص میں جیالا گھبرو' پیشے کے لحاظ سے وکیل تھا۔ آمنہ نے جب بھی اسے دیکھا' نیا تصور باندھا۔

کبھی کبھی وہ فلموں کا سین نظر میں رکھ کے سوچتی جب سیاہ کوٹ پہن کر عدالت میں جاتا ہوگا' تو می لارڈ' می لارڈ کرتا ہوا کتنا اچھا لگتا ہوگا۔ بالکل فلم کے ہیرو کی مانند حسین وخوبرو لگتا ہوگا۔

بس فلموں ہی میں تو اس نے وکیل دیکھے تھے۔ پھر کبھی کبھی وہ تنہائی میں سوچا کرتی کہ وہ جعفر سے یہ ضرور پوچھے گی کہ وکیل ہر فقرہ شروع کرنے سے پہلے می لارڈ کیوں کہتے ہیں؟

اور آیا وکیلوں کو فلمی کٹہرے کے باہر عام عدالتوں میں بھی اتنی لمبی تقریر کرنے اور ڈائیلاگ بولنے کی اجازت مل جاتی ہے؟

اور ہاں وہ یہ تو ضرور پوچھنا چاہتی تھی کہ فلموں میں ہمیشہ جج کو ایک ڈمی کی صورت میں کیوں استعمال کرتے ہیں؟ جو گاہے گاہے میز بجا دیتا ہے یا آخری حکم سنا دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے' مقدمے کی ساری کارروائی کا بوجھ ہیرو وکیل نے ہی اٹھا رکھا ہے۔

''بھئی یہ جج کس لیے ہوتے ہیں آخر؟''

اور اصلی زندگی میں تم کب جج بنو گے؟''

کیونکہ اسے سفید' سفید کنپٹیوں والے' معمر' مدبر اور باوقار سے جج بہت اچھے لگتے تھے۔

اور پھر کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچا کرتی کہ جب پہلی رات جعفر کو زیادہ تنگ کرنا مقصود ہوگا تو وہ اسے می لارڈ کہہ کر چھیڑے گی مگر می لارڈ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

جیسے آج اس کی شادی نہیں ہوئی۔ جیسے کسی نئی نویلی' کانچ کی گوری نے اس کے کاشانے میں قدم نہیں رکھا' گویا آج شہنائیاں اس کے آنگن میں نہ بجی تھیں۔

آمنہ پر عذاب کے لمحے زینہ زینہ کر کے اترنے لگے۔

اب اتنی بچی بھی نہ تھی۔ کئی کہانیاں اور واقعات سن چکی تھی۔ ڈھیروں کے حساب سے جو انگریزی ناول پڑھے تھے اور کتابیں جو کچھ بتا رہی تھیں' آج اس کے الٹ ہو رہا تھا۔

کیا ہوگا؟

کیا ہوگا؟

ٹھک ٹھک اس پر ہتھوڑے برسنے لگے۔

آج کی رات جاگنے کی رات تھی‘ مگر جلنے کی رات نہ تھی۔ اندیشوں‘ فکروں اور صدموں نے اسے نڈھال کر دیا۔

ساری رات آنسوؤں میں گزر گئی۔

صبح موذن کی آواز اس نے اپنے کانوں سے سنی اور جب اجالا ٹوٹ کر بکھرنے لگا تو اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ باہر جا کر دیکھنا چاہتی تھی‘ دنیا وہی ہے یا بدل گئی۔ کیونکہ کمرے کے اندر تو اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔

دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر سامنے مصلے پر بیٹھی ہوئی اپنی ساس پر گئی۔ ملگجے اجالے میں پہلے تو ایک ہیولا سا نظر آیا۔ مگر جب اس نے اپنی دکھتی ہوئی آنکھوں کو اچھی طرح کھول کر دیکھا تو سامنے نماز کی چوکی پر اس کی ساس بیٹھی کلام پاک پڑھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز اس نے بھی سن لی تھی‘ اس لیے نظر اٹھا کر دیکھا۔

اور پھر اس کی نظر آمنہ کے چہرے پر پڑ گئی۔

آمنہ نے محسوس کیا کہ ذرا سی دیر کو اس کی ساس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا تھا۔ بوڑھی آنکھوں میں تعجب کی بجلی کوندی تھی۔ مگر وہ سوالیہ نشان بنی آمنہ کو تکے جا رہی تھی اور آمنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا‘ وہ دروازہ بند کر دے یا دروازے میں سے ہٹ جائے۔ یا کسی بہانے سے باہر چلی جائے رات کو اتنا سوچ چکی تھی کہ ذہن شل ہو گیا تھا۔ اتنا جاگ چکی تھی کہ اعصاب مردہ ہو گئے تھے۔ ایک لمبی جمائی لے کر اس نے دروازے کے پٹ کھول دیئے۔

باہر زمانہ تھا جو بانہیں پھیلائے افواہوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اندر اس کی تقدیر سو رہی تھی۔

خود ہی اس کی ساس چل کر اس کے قریب آ گئی۔

دانا تھی۔

تردد سے پوچھا۔

”خیریت سے ہو؟“

”جی!“

ساس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر جمی تھیں اور آمنہ کا چہرہ دل کا آئینہ بنا ہوا تھا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ جسے جعفر کے خراٹے توڑ رہے تھے۔ سامنے پھولوں کلیوں سے لدا پلنگ نظر آ رہا تھا۔ جس پر جعفر نہیں سویا تھا۔ اس کی ساس نے ایک نظر میں معاملہ تاڑ لیا۔

"غسل کے لیے گرم پانی چاہیے؟"

اس کی ساس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔۔" ایک میکانکی انداز میں آمنہ کے منہ سے نکل گیا۔ اسے اپنی جرات پر حیرت ہوئی اور بڑی خجل مندی سے اس نے ساس کی طرف دیکھا۔

"باہر آ جاؤ۔"

اس کی ساس نے آہستہ سے کہا۔

شادی کے تھکے ہارے مہمان ادھر ادھر بکھر کر سو رہے تھے۔

آمنہ دھیرے دھیرے مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی آئی اور نماز والے تخت کے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

ساس نے کلام پاک کا وہ صفحہ ختم کیا۔ دعا مانگی۔۔۔۔۔۔ قرآن کو چوم کر جزدان میں لپیٹا' پھر اٹھ کر اسے طاق میں رکھ دیا۔ اور سامنے آ کر آمنہ کے منہ پر پھونک ماری۔

اس پھونک سے آمنہ کو بڑی ٹھنڈک کا احساس ہوا جیسے روشنی اور ہوا کی جانب ایک کھڑکی کھلی ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پپوٹے ایک دوسرے سے ملے تو جلن کا احساس بڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنی ساس کے سینے سے لگ کر خوب روئے ورنہ اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

آنکھیں کھولیں تو ساس جا چکی تھی۔

اس نے سر کرسی کے ساتھ ٹکا لیا۔ بادِ سحری کے ٹھنڈے جھونکے اس کے تپتے ہوئے جسم کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے لگے صبح کا رنگ سفید ہونے لگا۔ جانے صبح کی چڑیوں نے اس کے کان میں کیا کہا کہ وہ پھر سے زار و قطار رونے لگی۔ بن آواز کے آنسو بن ماں کے بچوں کی طرح چپ چاپ' آگے پیچھے گرتے چلے گئے۔

اس کی ساس چائے کی دو پیالیاں اٹھائے آ گئی تھی۔

چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ساس کو دیکھا تو ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

ساس نے ایک پیالی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی اور اپنی پیالی تپائی پر رکھ دی۔ پھر اسے اپنے ساتھ تخت پر بٹھا لیا اور اس کی کمر پر یوں اپنا ہاتھ پھیرنے لگی جیسے اسے خاموشی کی زبان میں تلقین کر رہی ہو۔

محبت کرو' محبت کرو۔۔۔۔۔۔۔

راستہ دشوار تو ہے مگر منزل دور نہیں۔

ساس کے ہاتھوں میں ایک خاص بات تھی۔

یہی خاص بات اسے لے ڈوبی۔ پہلے دن ہی اس کا اپنی ساس کے ساتھ ایک گہرا سمجھوتہ ہو گیا۔

ساس نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ مگر جانے اس نے کیسے سب کچھ سن لیا تھا۔

حالانکہ تھوڑی دیر پہلے وہ سوچ رہی تھی کہ ماں کو ایسے بیٹے کی شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ ماں چور ہے۔

ڈاکو ہے۔

گنہ گار ہے۔

مگر یہ ماں گنہگار نہیں۔ اس کا دل کہے جا رہا تھا۔

جب آمنہ نے صبر کے گھونٹ کی طرح' جرعہ جرعہ کر کے چائے پی لی تو ساس نے پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی اور بولیں۔

"چپ چاپ جا کے نیم گرم پانی سے نہالو۔ میں نے غسل خانے میں رکھ دیا ہے اور پھر سو جاؤ۔ میں تمہیں گیارہ بجے جگا لوں گی۔"

اس نے نظر بھر کر ساس کی صورت کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر تردد ہی تردد تھا۔ نگاہ میں وسوسے تھے۔ اس گورے نورانی چہرے پر کرب کی ایک لکیر آ کر ٹھہر گئی تھی' جھریاں سہم گئی تھیں۔ اور کمزور وجود شرمسار لگ رہا تھا۔ آمنہ آہستہ سے اٹھ کر آ گئی اور امی جان کے کہے پر عمل کیا۔

گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ ذرا دن ابھرتے ہی ولیمے کا شور اور ہنگامہ جاگ اٹھا۔ اس کے بعد ساس اور بہو میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور آمنہ ولیمے کا سبز جوڑا پہنے یوں سارا دن مقفل سی رہی' جیسے وہ کوئی خاندانی سربستہ راز ہو۔

کچھ دن اور اسے یونہی مقفل رہنا تھا اور حالات کا جائزہ لینا تھا۔ اپنے ڈوبتے ابھرتے جذبات کو عروسانہ روایتی شرم و حیا کے پردے میں چھپانا تھا۔

کہ حیرت انگیز طور پر دوسری رات وہ سب ہو گیا جو کہ پہلی رات ہونا تھا۔ اگر پہلی رات ایک صدمے سے دوچار ہو کر گزری تھی تو دوسری رات بھی کچھ کم تعجب خیز نہ تھی۔

جعفر نے آ کر بڑے پیار سے اس کے ہاتھ میں سہاگ کی نشانی ایک انگوٹھی ڈال دی اور پھر۔۔۔۔۔۔۔

پھر کیا۔۔۔۔۔۔۔زندگی ازدواجی پٹڑی پر معمول کے مطابق چلنے لگی تھی۔ مگر ایک کانٹا سا آمنہ کے پہلو میں آ کر اٹک گیا تھا۔ اس نے اپنے لبوں سے "سی" کی آواز تو نہ نکلنے دی مگر اس پھانس کی کسک اکثر اپنے کلیجے میں محسوس کرتی تھی۔ دو ایک بار اس نے پہلی رات کی زیادتی کے بارے میں جعفر سے پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر جعفر ٹال گیا۔

جعفر سے زیادہ اسے صغرا بی بی کا احترام تھا۔

صغرا بی بی کے دو ہی بیٹے تھے۔ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ دونوں بچوں کو اپنے پروں تلے پالا۔ بڑا بیٹا ناصر ایک سرکاری ملازم تھا اور دوسرا بیٹا جعفر وکیل تھا۔ بڑے بیٹے نے دس سال پہلے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ بیوہ کی اس بڑی حویلی کے دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک میں ناصر اور اس کی بیوی ستارہ رہتے تھے اور دوسرے حصے میں صغرا بی بی اور جعفر میاں رہتے تھے۔

بیوگی کے بعد صغرا بی بی کی ساری زندگی عبادت اور تہجد میں گزری تھی۔ محلے کے لوگ انہیں پیر و مرشد کی طرح مانتے تھے۔ وہ ستائیسویں رجب سے جو روزے رکھنا شروع کرتیں تو پھر شعبان' رمضان روزے ہی رکھے چلے جاتیں۔ اس لیے محلے کے لوگ بچوں کو دم درود کرانے کے لیے ان کے پاس لایا کرتے تھے۔ چھوٹے موٹے وظیفے پوچھنے کو چلے آتے اور نہیں تو گھریلو جھگڑوں سے بچنے کے لیے وعظ نصیحت ہی سننے چلے آتے۔

جب ناصر نے ایک بدنام طبقے کی عورت کو گھر لانا چاہا تو صغرا بی بی کا تمام زہد و تقویٰ چیخ اٹھا۔ انہوں نے مقدور بھر مخالفت کی' سمجھایا' دھمکایا' مگر عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ولی عہد گھر کا تخت و تاج تج دینے کے درپے تھا۔۔۔۔۔۔۔تو صغرا بی بی اپنا ماتا کا گلا گھونٹ کر اپنے ہاتھ سے اسے گھر میں لے آئیں۔ خودسر بچوں کے بے مہار جذبوں کے منہ پر والدین اپنے بناوٹی فیصلوں کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔

گھر میں بدزبانی' بداخلاقی اور بے حیائی اور سب کچھ اس سے ملتا جلتا آ گیا۔

ستارہ کو معلوم تھا کہ ماں اس شادی کے حق میں نہ تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ سارا محلہ ان کی مانتا ہے۔ اس لیے' محلے کو سنانے کے لیے دن رات اونچی اونچی آواز میں بولا کرتی ذرا ذرا سی بات پہ مشتعل ہو اٹھتی۔ صغرا بی بی کے سامنے ناصر کو ننگی ننگی گالیاں دیا کرتی۔ وہ

چاہتی تھی کسی دن صغرابی بی زبان کھولے اور وہ سارے محلے کے سامنے ان کے مصلے کی دھجیاں بکھیر دے ان کی چوٹی پکڑ کر انہیں گھر سے باہر نکال دے۔

صغرابی بی نے چپ کا عارفانہ پیالہ پی رکھا تھا۔ اس لیے آنکھوں سے دیکھتی اور کانوں سے سنتی رہ جاتیں۔

جلد ہی ناصر کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا پاؤں موری کے کیچڑ میں جا پھنسا تھا۔ اب تن اور تن کے کپڑوں کیوں کر صاف رہ سکتے تھے۔ جبکہ ستارہ بیگم اس کے دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اب اپنا نہیں بچوں کا مستقبل اس کے پیش نظر تھا اس لیے وہ ستارہ اور بچوں کو اپنی ماں کے زیر سایہ رکھنا چاہتا تھا جبکہ ستارہ جلد از جلد یہ گھر چھوڑ کر چلی جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنا گھر اپنی مرضی سے کسی اور محلے میں آباد کرنا چاہتی تھی جہاں صرف اس کے جاننے والے اور اس کے چاہنے والے ہوں۔

لیکن ناصر ایک زخم کھا چکا تھا اور دوسرا نہیں کھانا چاہتا تھا اسے یہ تو اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ ستارہ بدسلیقہ پھوہڑ بدزبان اور بد لحاظ عورت ہے۔ صورت اور جوانی کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اور اپنی صورت اور جوانی پر وہ گھمنڈ بھی بہت کرتی تھی۔ جس عورت کو اپنی جوانی اور اپنی صورت پر ناز ہو وہ اچھی ماں کیسے ہو سکتی ہے؟

ناصر نہیں چاہتا تھا کہ ستارہ اس کی ماں سے الگ ہو۔ اس نے اپنی زندگی ایک فرشتہ صفت ماں کے ساتھ گزاری تھی اور اسے پتا چل گیا تھا کہ جنت اور جہنم میں کیا فرق ہے۔

شروع شروع میں تو ناصر پیار سے اپنی بیوی کو سمجھاتا رہا مگر جب اس کا ٹیڑھا پن نرمی سے دور نہ ہو سکا تو پھر سختی اور تشدد پر اتر آیا کہ بدزبان عورت کا یہی آخری علاج ہے۔

ان لڑائیوں کا رخ ستارہ نے صغرابی بی کی طرف موڑ دیا۔ ہاتھ نچا نچا کر صغرابی بی کو گالیاں دیا کرتی اور محلے والوں کو سنا سنا کر کہتی کہ اس مکار بڑھیا نے میری زندگی اجیرن کر چھوڑی ہے۔

ان دنوں جب گھر جہنم کا نقشہ پیش کر رہا تھا اور محلے والے شور و شرابے کی آوازیں سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے۔ چھوٹا بیٹا جعفر وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کراچی گیا ہوا تھا۔

کبھی کبھار جب وہ چھٹیوں میں آتا تو اسے اپنے گھر کی فضا بڑی عجیب لگتی۔ ایسے جیسے ہر شے توپ کے دہانے پر رکھی ہو۔ وہی ماں تھی۔ وہی گھر تھا۔ وہی ماحول تھا۔ مگر جا بجا کانچ کے ٹکڑے بچھے ہوئے لگتے۔ ہر وقت یوں لگتا جیسے تلوے زخمی ہو جائیں گے یا ہتھیلیوں پر آبلے پڑ جائیں گے۔

اور جب وہ بار بار گھر آنے لگا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ یہاں اتنا تناؤ کیوں ہے؟

ستارہ کے ملنے جلنے والے نیچ اور آوارہ لوگ گھر میں بلا روک ٹوک آتے تھے۔ ستارہ کے ٹھٹھے سارا محلہ سنتا تھا' اس کی گالیوں سے کوئی کان محفوظ نہ تھا۔ روزانہ بلا ناغہ میاں بیوی میں جوتم تو تکرار ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔

اور جس رات گھر میں جنگ ہوتی' اس سے اگلی صبح ستارہ بن ٹھن کر گھومنے نکل جاتی۔ وہ رات گئے واپس آتی' کوئی مائی کا لال پوچھنے والا نہ تھا' وہ کہاں جاتی ہے؟ اور کیوں جاتی ہے؟

جعفر جوان تھا' باشعور تھا۔ حالات کا جائزہ لیتے ہی اس کا غیرت مند خون اچھلنے لگا۔ ایک رات اپنی ماں کے پاؤں دابتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

''امی جان! اگر بھائی جان کی غیرت مر گئی ہے تو میں اس عورت کو ٹھیک کر دوں گا۔ میں اسے بتا دوں گا کہ شریفوں کے ساتھ رہنے کے طور طریقے کیا ہوتے ہیں۔''

''نہیں' تم اپنی پڑھائی مکمل کرو۔'' امی نے بڑی نرمی سے بات کی۔ ''تم ان معاملوں میں نہ الجھو' شوہر جانے اور بیوی جانے۔''

''نہیں امی'' جعفر کا منہ سرخ ہو گیا۔ ''ہم نے بھی اسی محلے میں رہنا ہے اور سر اٹھا کے جینا ہے' دیکھئے گا میں اس عورت کا مزاج درست کر دوں گا۔''

''اپنا لب ولہجہ درست کرو بیٹے' وہ تمہاری بھابی ہے۔''

''یہ تو ایک اتفاق ہے کہ وہ میری بھابی ہے۔ میری بہن بھی ہوتی تو میں اس کے ٹکڑے کر دیتا۔''

''بیٹا!'' صغرا بی بی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''اس طرح باتیں نہ کرو' میرا جی ہولنے لگا ہے' برے کے ساتھ برا بننے کی کوشش نہیں کرتے۔''

''اور حد سے زیادہ اچھا بننے والوں کو بے غیرت اور بزدل کہتے ہیں۔''

''تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں؟''

صغرا بی بی چاہتی تھیں کہ وہ جلدی سے چلا جائے۔

مگر وہ ان کی بات کا جواب دیئے بغیر اٹھ گیا۔

اتفاق سے باہر نکلتے ہی اس کا سامنا ستارہ سے ہو گیا جو اس وقت بنی ٹھنی نخرے دکھاتی جانے کہاں سے چلی آ رہی تھی۔ اس نے

جعفر کی خون آلود نگاہ جب اپنے چہرے پر محسوس کی تو یوں اٹھلائی جیسے اس نے جعفر کی ہنسی اڑائی ہو۔اور اس طرح مسکرائی جیسے اس نے جعفر کے منہ پر تھوکا ہو۔

جعفر کا خون کھول اٹھا۔وہ مٹھیاں بھینچتا ہوا اس کے قریب سے نکل گیا۔ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا' اس خوبصورت بلا کا آگے بڑھ کر گلا گھونٹ دے۔

وہ ایک خونی نگاہ۔۔۔۔۔۔۔

وہ ایک نفرت کی نگاہ ستارہ بیگم کے لیے ایک کھلا چیلنج بن گئی تھی۔

وہ خوب جان رہی تھی کہ جعفر اس سے کس حد تک نفرت کرتا ہے۔کیسی ۔۔۔۔۔۔نظروں سے اسے دیکھتا ہے اور اس کا انداز تخاطب کس قدر ہتک آمیز ہوتا ہے؟

اول تو اس سے بات کرنے سے کتراتا تھا اور کبھی موقع مل جائے تو ہمیشہ یوں بات کرتا جیسے اس کے مقابل انتہائی گھٹیا شے ہو۔

ایک دن جب ستارہ بن سنوری' اکڑ دکھاتی کہیں جانے کو نکلی تھی' جعفر اس کے راستے میں آ گیا اور بولا۔''کہاں جا رہی ہو؟''

''تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟'' اس نے اپنا ہاتھ نچا کر کہا۔

''میں ناصر کا چھوٹا بھائی ہوں۔''

''چھوٹے ہو تو چھوٹے بنے رہو ورنہ ابھی تمہارا پتا پانی کر دوں گی صاحبزادے''

''بھائی جان نے مجھے سب اختیارات دے رکھے ہیں۔یہ مت سمجھنا کہ اس گھر میں سب لوگ بے غیرت ہیں۔'' یہ کہہ کر جعفر نے راستہ چھوڑ دیا۔مبادا اس کا ہاتھ اٹھ جائے یا کوئی اور بدمزگی ہو جائے۔

بس خرابی یہیں سے شروع ہوئی۔

جعفر نہیں جانتا تھا کہ نگاہ بدتاک میں کھڑی ہے' ورنہ وہ اتنا بڑا چیلنج نہ کرتا۔

وہ حقارت کی نگاہ جو اس نے ستارہ پر ڈالی تھی' ستارہ کے کلیجے کے پار اتر گئی۔وہ ایسی عورت تھی' انتقام پر آئے تو بجلی بن کر خاکستر کر ڈالے۔

خوب جانتی تھی' مرد کی غیرت کو کیسے پھونکا جاتا ہے۔

جعفر کا ایک ہی تو شغل تھا۔بڑا مجلس باز آدمی تھا۔رات گئے دوستوں کی بیٹھک میں بیٹھا رہتا۔دنیا بھر کے موضوع زیر بحث

رہتے۔ گھر میں ضعیف ماں تھی۔ بدزبان بھابی بھی اور ایک مسلسل نحوست تھی۔ اس لیے وہ گھر سے دور دور رہا کرتا تھا۔ خصوصاً رات کو بارہ ایک بجے گھر واپس آیا کرتا تھا۔

ایک رات جب صغرا بی بی اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی اور جعفر رات کے دو بجے اپنے دوستوں کے ساتھ آخری شو دیکھنے کے بعد گنگناتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔۔۔۔۔۔۔

اعصاب پر رومانوی فلم کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ شام ڈھلے بارش ہوئی تھی اور ابھی تک سوندھی مٹی کی کنواری خوشبو سارے عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ جی کے آس پاس جلترنگ سے بج رہے تھے۔ کبھی کبھی ایسا موقع آتا ہے کہ جوانی کا لوہا آپ ہی آپ تپ جاتا ہے۔ اس وقت کون چوٹ مارتا ہے' یہ نظر نہیں آتا۔ مگر لوہے پر چوٹ لگ جاتی ہے۔ جانے کیسے سارے گھر کی بتیاں چلی گئیں۔

اور جب وہ ٹٹولتا ہوا اپنے بستر کی سمت بڑھا تو دو نرم و گداز گرم گرم تجربہ کار ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔ ریشمی سرکتی ہوئی رات ان ہاتھوں پر آ کر رک گئی اور گھپ چپ چور اندھیرا' تن من پر چھا گیا۔ نوجوان تھا مگر شریف تھا۔ دریا میں تھا مگر خشک تھا۔ قصے سن چھوڑے تھے۔ کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ بہت کچھ جانتا تھا مگر عمل کے میدان میں کورا تھا۔

اس کا کورا بدن بھڑ بھڑا لاؤ دینے لگا۔

اس وقت وہ کڑکڑاتے سوکھے کاغذ کی طرح بن گیا۔ جس کو ذرا سی آنچ پھونک ڈالتی ہے۔

آنکھ کھلی تو وہ نفس کا دریا پار کر چکا تھا۔

اسی وقت کمرے میں روشنی ہوگئی۔ ستارہ بیگم قہقہے لگانے لگی اور جعفر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

جانے کب وہ چھل پیری بی اس کے خرمن کو پھونکنے چلی آئی تھی۔

''تم وکیل ہو اور جانتے ہو اس جرم کی سزا کیا ہے؟ اگر آج اسی وقت۔۔۔۔۔۔۔ میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں تو تمہاری اور تمہارے بھائی کی کیا عزت رہ جائے گی اس شہر میں؟''

جعفر کا شرمسار سر جھک گیا۔

''تم نے اپنے بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تمہارے خاندان اور تمہاری مکار ماں کی بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو۔ آنکھیں بند رکھو اور میرے اشاروں پر چلتے رہو۔''

وہ چپ رہا۔

''اگر کسی دن بھی جوش جوانی میں الٹی سیدھی بکواس کی' تو میں تمہیں پورے شہر میں ذلیل کردوں گی۔''

وکالت پڑھنے والا' ماں کا پیارا پیارا بچہ' رات کو دیر تک بیٹھ کر ماں کے پاؤں دبانے والا' کالی ڈائن کے منتر میں پھنس چکا تھا۔

یہ سب کیسے ہوگیا؟

یہ سب کیسے ہوگیا؟

اس کارواں رواں ہتھوڑے برسانے لگا۔

ماں۔۔۔۔۔۔تو گھر سے کیوں چلی گئی۔ ماں' لوہے کا خود' آہن کی دیوار' دعاؤں کا سایہ' کیا دعاؤں کی دیوار میں بھی نقب لگ جاتے ہیں۔

ماں! مجھے پچھل پیری کی کالی چڑیل نے لوٹ لیا ماں!

صغراں بی کے لیے یہ باعث حیرت تھی کہ یکا یک جعفر کا رویہ ستارہ کے ساتھ بدل کیوں گیا ہے۔ پہلے تو وہ جب صحن میں کھڑی ہو کر بولتی تھی تو وہ ابا کی پرانی زنگ آلود بندوق اٹھا کر لے آتا تھا' اینٹ پتھر پر ہاتھ رکھ دیتا تھا' لپک لپک کر باہر جاتا تھا اور ستارہ کو چٹیا سے پکڑ کر نکالنے کے در پے تھا اور کہا کرتا تھا۔

''بھائی جان بھی بے غیرت ہیں جو اس بچ کے ساتھ گزارا کر رہے ہیں۔ میں ہوتا تو اب تک اس سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہوتا۔''

مگر اب جب ستارہ واہی تباہی بکا کرتی فحش کلامی کرتی' بچوں کو چیخ چیخ کر ناصر کو گالیاں بکا کرتی تو وہ اپنے بھائی جان کو پکڑ کر باہر لے جاتا۔ انہیں دست درازی کرنے سے باز رکھتا اور سارا قصور انہیں کے سر تھوپ دیتا۔

صغراں بی حیران حیران' جعفر میاں کا مکھڑا تکتی رہ گئیں اور اس کی چھٹیاں بھی ختم ہوگئیں۔ وہ کراچی سدھارا۔

دل میں تو وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ آئی بلا ٹل گئی ہے۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب وہ اپنے آپ کو سنبھال لے گا اور یہ ذرا سی لغزش یا بھول اس راستے کا پتھر نہیں بنے گی۔ اب پھر وہ اپنا رویہ سخت کرے گا۔

مگر اگلی چھٹیوں میں جب وہ یہ سب کچھ بھول بھال کر دوبارہ گھر آیا تو ستارہ ایک رات موقع پا کر' سولہ سنگھار کیے یوں اس کے کمرے میں چلی آئی جیسے اس کی رکھیل ہو۔

''دیکھو بھابی۔۔۔۔۔۔''

جعفر بل کھا کر یوں کھڑا ہوگیا' جیسے اس کے بستر پر سانپ چڑھ آیا ہو۔

"تم میرے بھائی کی عزت ہو۔میرا تمہارا احترام کا رشتہ ہے۔"

"اے مارو گولی احترام کے رشتے کو' عورت مرد کا صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے اور جب تم نے ایک بار احترام کی اس مصنوعی دیوار کو توڑ دیا تو اب کیوں دوسری جانب کھڑے ہو؟"

"پہلے بھی تم نے ---------- تم نے ----------" وہ نوخیز لڑکیوں کی طرح ہکلانے لگا۔

"تم نے میرے ساتھ زبردستی کی تھی۔"

ستارہ یوں قہقہہ لگا کر ہنسی جیسے کوٹھے کی بالکونی پر کھڑی ہو اور بولی۔ "تم تو ایسے باتیں کر رہے ہو' جیسے تم نادان بچے تھے' کچھ بھی نہ جانتے تھے' میں نے تمہیں ورغلایا تھا۔اے' آج کل کی کنواریاں اگر تمہاری باتیں سن لیں تو شرم سے پانی پانی ہو جائیں میں بھلا تمہاری رضامندی کے بغیر پیش قدمی کیسے کر سکتی تھی؟"

جعفر سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا۔

"خدا کے واسطے بھابی' میرے کمرے سے چلی جاؤ۔"

"اے' دنیا کے سامنے بے شک بھابی کہہ لیا کرو' مگر میں اس گھر میں تمہاری معشوقہ بن کر رہنا چاہتی ہوں۔"

"کچھ خدا کا خوف کرو بھابی! اپنے اوپر نہیں تو میرے اوپر ترس کھاؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے اپنی نظروں سے اس طرح نہ گراؤ کہ میں مرد بن کر زندہ نہ رہ سکوں۔"

"کہاں چلی جاؤں' تم ہی بتاؤ۔وہ زنخا جو مجھے بیاہ کر لایا ہے' اس قابل نہیں کہ میں اس کی بیوی کہلاؤں۔تم ہی بتا دو' کیا کوئی تیسرا ٹھکانہ ڈھونڈوں؟"

"بھابی ----------"

جعفر چیخا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شریف زادیاں اس قسم کی زبان استعمال کرتی ہیں۔

ہاں ہاں' اجازت دے دو۔میرے باہر آنے جانے پر تمہی کو اعتراض ہے ورنہ تو اس شہر میں میرے اور بھی عاشق ہیں۔"

اور یہ جعفر بھی جانتا تھا۔ستارہ جیسی آوارہ لڑکیوں کو ہر جگہ عاشق مل جاتے ہیں۔وہ جس طبقے سے آئی تھی۔وہاں لڑکی کا جوان اور حسین ہونا ہی بہت بڑی خوبی ہے۔

جعفر سوچ میں پڑ گیا۔

اس کو گردن لٹکائے دیکھ کر ستارہ شیر ہوگئی۔

''دیکھو جعفر سیدھے سیدھے میرے ساتھ سمجھوتہ کرلو ورنہ چیخ چیخ کر دنیا کو بتادوں گی کہ تم نے مجھے لوٹا ہے۔ یاد رکھو تمہاری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کرسکے گی اور زہر کھا کر مرجائے گی۔ اور تمہارا بھائی تمہاری جان کا دشمن ہوجائے گا۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ اور شہر والے جن کے آگے تم گردن اکڑا اکڑا کر چلتے ہو تمہارے منہ پر تھوکیں گے۔''

جعفر جانتا تھا۔ قانون کی زبان میں اسے بلیک میل کرنا کہتے ہیں۔ وہ قانون کے اسرار و رموز بھی جانتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ پہلی لغزش کے بعد جان چھڑا لینا آسان ہے مگر۔۔۔۔۔۔

وہ کالی جادوگرنی کے منتر میں اسیر ہوتا گیا۔ دلدل میں پاؤں رکھا تو اندر ہی اندر دھنستا چلا گیا۔ پہلے پہلے خوف کے مارے مجبوری کے تحت۔۔۔۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ عادتاً

نشے کی لت عادت کی لت سے جلدی پڑ جاتی ہے۔ ''حی علی الصلوٰۃ'' کی آواز اس طرح قدم نہیں پکڑتی' جس طرح گھنگھرو کی آواز اور طبلے کی تھاپ پکڑ لیتی ہے۔

جعفر کو یوں دن دیہاڑے جھکی جھکی نظروں سے صحن عبور کرتا دیکھ کر صغرا بی بی نے اپنے سینے پر صبر کی صلیب رکھ لی۔

صلیب کیوں نہ رکھتی' ایک دن لڑائی جھگڑے کے دوران ستارہ بیگم نے ہاتھ نچا کر صغرا بی بی سے کہا تھا۔

''مکار بڑھیا' اپنے چھوٹے بیٹے پر فخر نہ کیا کر' بڑا تو قضا سے گیا ہے چھوٹا رضا سے جائے گا۔ بڑے کا غم چھوڑ اور اب چھوٹے کی جان کو رویا کر۔''

صغرا بی بی جی جان سے لرز گئی۔

اس نے چھوٹے بیٹے پر دم درود بھی زیادہ کرنے شروع کر دیئے تھے۔ مگر آدم خور بلا' دم درود کے بیچوں بیچ اس کے بیٹے کی شاہ رگ کے قریب پہنچ گئی تھی۔

صغراں بی بی کی زمانہ شناس نگاہیں' جعفر کے لیے ایک مناسب دلہن ڈھونڈنے میں سرگرداں ہوگئیں جبکہ جعفر نے سرے سے شادی سے انکار کر دیا۔

یہ وہ بچہ تھا جو ہمیشہ کہتا تھا۔

''امی جان! آپ کی پسند سے شادی کروں گا' میری ایسی بیوی ڈھونڈ لایئے گا جو آپ کے پاؤں دھو کر پیئے۔''

مگراب وہ شادی کے نام سے بدکتا تھا۔

اورستارہ ببانگ دہل ہر ایک سے کہتی پھرتی تھی' وہ اس گھر میں جعفر کی بیوی کا وجود برداشت نہ کر سکے گی۔ جعفر میری اجازت کے بغیر شادی کر کے تو دیکھے۔"

پھر بھی صغراں بی بی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ بال آخر انہیں آمنہ میں وہ سب کچھ نظر آیا' جس کی وہ متلاشی تھیں۔ نیک والدین کی بیٹی تھی اور صغراں بی بی نے اس سے نیک امیدیں وابستہ کرلیں۔

ماں نے جب زبان دے دی تو جعفر مجبور ہو گیا۔ مسلسل انکار کا کوئی جواز بھی نہ پیش کر سکا۔

ستارہ بھوکی شیرنی کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتی پھر رہی تھی۔ بال آخر مہمانوں کی آنکھ بچا کر اس نے جعفر سے وعدہ لے لیا کہ وہ پہلی رات اپنی دلہن کے ساتھ بے حسی اختیار کرے گا ورنہ۔۔۔۔۔۔۔"

ورنہ۔۔۔۔۔۔۔

جعفر بزدل بن چکا تھا۔ اس نے وعدہ نبھایا۔

بعدازاں یہ بات آمنہ کو کسی طرح معلوم ہو گئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں وہ جان گئی تھی۔ یہ کہ۔۔۔۔۔۔۔ بیڈروم میں جعفر سہا سہا کیوں رہتا ہے؟ کھل کر محبت تو کیا' بات نہیں کر سکتا۔ تعلق وہ سا نہیں' جیسا چاہنے والے میاں بیوی کا ہوتا ہے۔ بس' جیسے وہ اپنا فرض نبھا رہا ہو۔

گھر والوں کو جو باتیں نظر نہیں آتیں' وہ دنیا والوں کو بڑی جلدی نظر آ جاتی ہیں۔ اور افواہوں کے بگولے بھی جلدی آمنہ کے کانوں تک پہنچ گئے۔

وہ اس ہرنی کی مانند بولائی بولائی پھرتی تھی۔ جس کو جسم کے اندر زخم لگا ہو۔ اور اپنی ٹیس دکھا نہ سکتی ہو۔

مگر جب تک آدمی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے' یقین نہیں کرتا۔ جانے کب تک وہ آس اور یاس کی سولی پر لٹکتی رہتی کہ ایک دن آنکھوں نے بھی دیکھ لیا۔

ایک روز اچانک وہ میکے سے جلدی لوٹ آئی۔ صغراں بی گھر پر نہ تھیں' سیدھی اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

اندر داخل ہوئی تو پاؤں زمین نے پکڑ لیے۔

ستارہ جعفر کے بستر پر یوں بیٹھی تھی جیسے کل کی بیاہی دلہن ہو۔ اس نے آمنہ کو دیکھا تو مٹکتی ہوئی اٹھی' لہرا کر دوپٹہ جعفر کے نیچے

سے کھینچ کر نکالا۔ پھر آمنہ کی طرف حقارت سے دیکھ کر اس نے فرش پر تھوک دیا اور سینہ تانے یوں باہر نکل گئی جیسے اس نے آمنہ کے منہ پر جوتا رسید کر دیا ہو۔ ہر چند کہ آمنہ نے بہت سی باتیں سن رکھی تھیں' یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر آمادہ نہیں تھی۔

نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

کان اور آنکھیں بند رکھنا چاہتی تھی۔

کہ اس کی کوکھ میں ایک ننھا سا دل دھڑک رہا تھا۔

اس لمحے اس نے دیکھا کہ جعفر ڈھٹائی سے پڑا رہا اور ستارہ اس پر تھوک کر چلی گئی تو اس کے اندر سوئی ہوئی عورت زخم خوردہ ناگن بن کر جاگ اٹھی۔

جعفر نے اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھا تو جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔

آمنہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اب اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ مزید اس گھر میں رہے۔ جب اپنا سارا سامان باندھ کر آمنہ اچھی طرح رو چکی' تو صغرا بی بی کمرے میں آ گئی۔

اس نے آمنہ کی سوجھی سوجھی آنکھیں دیکھیں تو اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اب تک آمنہ' صغرا بی بی کو معاف کرتی آئی تھی' مگر آج اس کا دل صغرا بی بی کی طرف سے بھی میلا ہو گیا تھا۔ منہ موڑے یوں بیٹھی رہی جیسے آج اسے کسی کی پروا نہ ہو۔

صغرا بی بی تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی' پھر اس نے آمنہ کے زانو پر کمزور ہاتھ رکھ دیا اور اپنی لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولی۔

''تم جا رہی ہو بہو' میں تمہیں جانے سے نہیں روک سکتی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید میں بھی ایسا ہی کرتی۔ مگر بیٹی! عیار دشمن کے لیے محاذ خالی چھوڑ دیا جائے تو اسے جی بھر کر لوٹنے کھسوٹنے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں کمزور تھی۔ میرا محاذ کمزور تھا۔ جانے کب میں سوکھے درخت کی طرح گر جاؤں۔ میں نے یہ محاذ تمہارے سپرد کیا تھا۔ مجھے معلوم ہے۔ تم ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہو۔ اپنا حق چھین سکتی ہو۔ بدی کو نیکی میں بدل سکتی ہو۔ تمہارے پاس گرم خون ہے' جوانی ہے' تدبر ہے' وقت ہے' زمانہ ہے' میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ ماں ہونے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔ بیوی کا اپنے شوہر پر اس کی ماں سے زیادہ حق ہوتا ہے۔ تم اس سے نہیں' اپنے حق سے منہ موڑ کر جا رہی ہو۔''

آمنہ نے پلٹ کر دیکھا۔

صغرابی بی کا نورانی سا ہاتھ اس کی گود میں پڑا لرز رہا تھا۔ یہ ہاتھ بھیک مانگ رہا تھا۔

یہ ہاتھ جس نے پالنے میں بیٹے جھلائے' یہ ہاتھ التجا کر رہا تھا' رو رہا تھا' فریاد کر رہا تھا' لرز رہا تھا۔

آمنہ کی آنکھوں سے پھر نیر بہنے لگے۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے سامان کی طرف دیکھا اور پھر صغرابی بی کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

یہ سر اٹھنے کے لیے جھکا تھا۔ اس لیے نوخیز و نوعمر آمنہ نے آگہی کا ایک اور پیالہ پیا اور چپ کی چادر اوڑھ لی۔ رات گئے جعفر یوں اپنے کمرے میں داخل ہوا جیسے بلی پانی میں بھیگ کر اندر آتی ہے۔

آمنہ سو نہیں رہی تھی۔ مگر اس نے یہی تاثر دیا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔

اپنی بند پلکوں کے جھرو کے ذرا ذرا سے وا کر کے' وہ جعفر کا جائزہ لینے لگی' جعفر اس کے پلنگ پر لیٹنے کی بجائے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

جعفر اپنی ماں کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ آمنہ کے پاس بیٹھ کر خوب پی لیتا تھا۔ امی کمرے میں آ جائیں تو فوراً سگریٹ چھپا دیتا تھا۔

آمنہ نے دیکھا' اس وقت وہ مسلسل کش لے رہا تھا اور بہت بجھا بجھا لگ رہا تھا۔

اس کا چہرہ کسی عیاش آدمی کا چہرہ نہیں لگ رہا تھا' ایک مجبور آدمی کا پچھتاؤں میں ڈوبا چہرہ تھا۔

یکا یک آمنہ کا غصہ اور نفرت کہیں روپوش ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ وہ نیکی کی اتنی بڑی فصیل ہے کہ اس پورے خاندان کو بچا سکتی ہے۔

عورت پر عورت کا جادو نہیں چلتا۔

عورت ہی عورت کا توڑ ہوتی ہے۔

اس دنیا میں جتنے گھر برباد ہوئے وہ بدقماش عورتوں کی وجہ سے ہوئے اور آباد گھروں میں بھی نیک عورتوں کی وجہ سے اجالا ہے۔

مرد کو کیا دوش دیں کہ عورت کے معاملے میں قدرت نے اس کے اندر ایک جھول رکھا ہے' اس جھول کو ہمیشہ نیک عورت پر کر دیتی ہے۔

عورت کو اس لیے نیکی' ٹھنڈک اور دل کا سرور کہا گیا۔ گھر کی رونق کہا گیا۔ مرد کی عاقبت کہا گیا۔

عورت کو مرد کی خطا' ماں کی طرح معاف کر دینی چاہیے۔

آمنہ۔۔۔۔۔۔۔۔آمنہ۔۔۔۔۔۔۔۔

آمنہ کے اندر جیسے کوئی رونے لگا۔

اتنی بڑی تو کب سے ہو گئی؟

بات دراصل یہ ہے۔اس نے دل میں سوچا۔ایک فاحشہ اور بے غیرت عورت سے ہار مان لینا تو کوئی دانشمندی نہیں۔ ہر عورت ایسے میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

امی ٹھیک کہتی ہیں۔

اپنا حق' اپنی زمین' اپنی جگہ' اپنا آپ کیوں چھوڑا جائے' آج وہ میرا گھر برباد کر رہی ہے' کل کسی اور کا کرے گی۔

میرا دشمن جعفر نہیں' ستارہ ہے اور مرد کبھی اپنی کمزوری تسلیم نہیں کرتا۔مرد کو اپنا جھول نظر نہیں آتا۔مرد اپنے آپ کو عقل کل سمجھتا ہے۔اس سے الجھنے سے فائدہ۔۔۔۔۔۔؟''

آمنہ نے کروٹ بدل لی اور جعفر کو جی بھر کر سوچنے کا موقع دیا۔جانے کب جلتی کڑھتی وہ سو گئی۔

صبح اٹھی' جعفر کو ناشتہ کرایا' معمول کے مطابق سب کام کیے۔

دوسری رات جعفر کمرے میں آیا۔تو بھی وہ چپ رہی۔

تیسری رات۔۔۔۔۔۔جعفر خود ہی پھٹ پڑا' آمنہ کو ہنسی آئی۔مرد اپنی ذہنی اذیت کا بوجھ بھی زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکتا۔

''جو کچھ کہنا ہے' کہتی کیوں نہیں ہو؟''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہنا۔'' آمنہ نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر اتنے دنوں سے تھوتھنی کیوں پھلا رکھی ہے؟''

''میں نے تو نہیں پھلا رکھی۔''

''الو کی پٹھی۔۔۔۔۔۔''

وہ ایک دم گرم ہوا۔پھر اسے خود ہی شرم آئی کہ وہ کیوں آمنہ کو گالی دے رہا ہے۔آمنہ نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔

اسی وقت آمنہ نے سوچا' اگر یہ سننا چاہتا ہے تو میں کیوں اب چپ ہوں۔آواز کو اور آہستہ کر کے بولی۔

''جعفر! میں تنگ دل عورت نہیں ہوں۔ میں نے اس گھر میں آتے ہی بہت کچھ سنا تھا' چاہتی تو تمہاری زندگی اجیرن کر سکتی تھی' اور اب بھی۔۔۔۔۔۔۔لیکن ایسا ہے کہ میں سب دیکھا سنا معاف کر دوں گی' تم اب اس حرافہ سے قطع تعلق کر لو۔''

''اپنی حد میں رہو آمنہ۔۔۔۔۔۔۔۔'' جرم کرنے کے باوجود جعفر کے اندر کا مرد غرایا۔

''یہ حد تو ہم دونوں کے لیے ہے جعفر۔۔۔۔۔۔'' آمنہ نے بڑے سکون سے کہا۔ ''اور شرع و قانون نے بنائی ہے۔''

''تم مجھ سے زیادہ قانون کو شرع کو نہیں جانتیں۔'' اس نے پلٹ کر وار کیا۔

آمنہ سنبھل گئی' بات یوں نہ بنے گی۔

وہ قصور ماننا بھی چاہتا ہے اور نہیں بھی ماننا چاہتا۔

''جعفر۔۔۔۔۔۔'' وہ بڑے پیار سے بولی۔ ''عام آدمی کا بلیک میل ہونا تو سمجھ میں آتا ہے' مگر کسی قانون دان سیانے آدمی کا۔۔۔۔۔''

''بکواس مت کرو' آمنہ''

جعفر کھڑا ہو گیا اور چپل پہننے لگا۔

''یوں نہ جاؤ جعفر۔۔۔۔۔۔'' آمنہ نے کھڑے ہو کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''میں پچھلے حساب نہیں مانگ رہی۔ میں نے بڑے خلوص سے یہ پیشکش کی ہے کہ آؤ نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کریں جو کام تم نہیں کر سکتے' وہ میں کر سکتی ہوں۔''

جعفر نے اسے زور سے دھکا دے کر اپنا بازو چھڑایا۔ وہ دور پلنگ پر جا گری اور وہ باہر نکل گیا۔

جعفر کے عدالت چلے جانے کے بعد آمنہ نکل کر برآمدے میں بیٹھ گئی۔ صغرا بی باورچی خانے میں نوکر کو سودا سلف لانے کے بارے میں سمجھا رہی تھی۔ اب آمنہ صغرا بی سے اس قدر مانوس ہو گئی تھی کہ دونوں مل کر گھر کا سارا کام کر لیا کرتیں۔ آمنہ جعفر کے جانے کے بعد سایہ بنی صغرا بی کے ساتھ رہا کرتی۔ آمنہ نے برآمدے میں بیٹھتے ہی ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

سامنے صحن میں آہٹ ہوئی تو نظر اٹھا کر دیکھا۔ ستارہ صحن سے گزری چلی جا رہی تھی۔ ستارہ کے اب چار بچے تھے۔ اس نے اس وقت دوپٹہ نہیں اوڑھا۔ اس کا جسم ایسا ہی تھا' جیسا چار بچوں کی ماں کا ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو خوب کس کسا کر رکھا کرتی تھی۔ رنگت گو ابھی تک گوری تھی مگر چہرے پر مہاسوں کے اتنے سیاہ نشان پڑ چکے تھے جو اس کے اعمال کی نشاندہی کو کافی تھے۔

مٹکتی ہوئی ستارہ اپنے گھر سے نکلی تھی اور لہراتی ہوئی صحن کا چکر لگا کے سینہ تانے ادھر سے ادھر چلی گئی۔ جاتے جاتے آمنہ پر ایک حقارت آمیز طنزیہ نگاہ بھی ڈالتی گئی۔

آمنہ کے لیے صغرابی بی جتنی ٹھنڈی اور میٹھی تھی' ستارہ اتنا ہی کڑوا نیم کا درخت تھی۔ اس گھر میں ستارہ کی ہستی کو وہ ابھی تک سمجھ نہ پائی تھی۔ گھر کا ہر فرد ستارہ سے ڈرتا تھا اور تو اور' جعفر بھی اس کا سامنا ہوتے ہی زرد ہو جاتا اور کوشش کرتا کہ بیڈ روم میں اس کا ذکر بھی نہ آنے پائے۔ ستارہ گھر میں اس رشوت خور تھانیدار کی طرح رہتی تھی جو سارے محلے سے رقم بھی بٹورتا ہے اور سب کے کالے کرتوتوں سے واقف بھی رہتا ہے۔

''بھائی صاحب آپ کو معلوم ہے اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟'' بہت دن تک سوچ کر آمنہ ایک دن موقع پا کر ناصر کے کمرے میں چلی گئی۔

ناصر اس کو دیکھ کر بوکھلایا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

''میں تمہاری بات سمجھا نہیں بی بی''

''آپ اتنے معصوم نہیں ہیں کہ دس سال سے اس گھر کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور پھر بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ میں عورت ہوں اور مجھے اس گھر میں آئے چند ماہ ہوئے ہیں اور میں سب کچھ جان گئی ہوں۔ آپ کیسے مرد ہیں؟''

ناصر سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا۔

''میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ بزدل ہیں اور معاف کیجئے گا' بے غیرت بھی ہیں۔'' آمنہ نے غصے سے کہا۔ ''آپ کا اپنا گھر تو آپ کی رضا سے برباد ہوا تھا میرا گھر کیوں برباد کر رہے ہیں؟''

''میں سب جتن کر کے ہار گیا ہوں' وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔'' ناصر نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''تو پھر میں کیا کروں' اسے قتل کر دوں؟''

''بے غیرت کہلوانے سے قاتل کہلوانا زیادہ اچھا ہوتا ہے ناصر بھائی۔ لیکن آپ شاید نہیں جانتے' قتل آپ کر چکے ہیں جب آپ ایک پنچ عورت کو بیاہ کر لائے تھے تو آپ نے اپنی ماں کو قتل کیا تھا' اپنے باپ کے وقار اور خاندانی ناموس کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا تھا۔ جب آپ نے اس عورت کو بے محابا آزادی دی تھی اور اس کے کرتوتوں پر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں تو آپ نے اپنے اندر ایک

شریف ماں کے بیٹے اور ایک غیور شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ اتنے قتل کرنے کے باوجود آپ دہرے قتل کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میرا ۔۔۔۔۔۔ میرے بچوں کا ۔۔۔۔۔۔ میرے شوہر کا ۔۔۔۔۔۔ مگر یاد رکھئے میں عورت ہوں اور میرے سامنے بے غیرتی کا یہ ناٹک زیادہ دیر تک نہیں کھیلا جائے گا۔ آپ اس وقت میرا ساتھ نہیں دیں گے تو مجھے کھل کر سامنے آنا پڑے گا۔ مجھے پھوڑے کا اندر ہی اندر بہنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے نشتر زنی میں ہی نجات نظر آتی ہے ۔۔۔۔۔۔ بولیں' آپ میرا ساتھ دیں گے؟"

ناصر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"بی بی! تم نے میری غیرت کو اس طرح للکارا ہے کہ آج زمین میں گڑ جانے کو دل چاہتا ہے۔"

"زمین میں گڑنے سے کسی کا بھلا نہ ہوگا۔ اس زمین کے اوپر رہنے کے لیے جگہ بنایئے۔ آپ کو اپنے بچوں کے لیے مجھے اپنے شوہر کے لیے زندہ رہنا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" وہ بولے۔ "میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم جو کہو گی وہ کروں گا۔ اس صورت حال سے میں بھی تنگ آ چکا ہوں۔"

"مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ میں آپ کو منظر پر نہیں لاؤں گی۔ مگر توقع رکھوں گی کہ آپ میری اسکیم میں شامل ہیں۔"

جوں ہی وہ مڑی' سامنے ستارہ آ گئی۔

خوب میک اپ تھوپ کر جانے اس وقت اچانک کیسے ٹپک پڑی تھی۔

"او ذلیل ۔۔۔۔۔۔" وہ ایک دم غرا کر بولی۔ "حرام زادی! میرے شوہر کے کمرے میں کیا کر رہی ہے؟"

آمنہ رسان سے مسکرائی۔

"وہی جو تو میرے شوہر کے کمرے میں کرنے جایا کرتی ہے۔"

"کمینی' کتی' تیری یہ مجال کہ میرے ساتھ اس طرح بولے۔"

"طوائفوں کے ساتھ اسی طرح بولا جاتا ہے۔" آمنہ نے بھی دو بدو جواب دیا۔

"زبان کو لگام دے ورنہ ابھی مزا چکھا دوں گی۔"

"بدکردار عورتیں کسی کو مزا نہیں چکھا سکتیں۔" آمنہ نے کہا۔ "ڈٹ کر میدان میں اترنا تو شریف عورت کا کام ہے۔"

"اچھا!" ستارہ غرا کر بولی۔

''آ لے تیرا شوہر شام کو تجھے وہ جوتے لگواؤں گی کہ تو یاد رکھے گی۔ اپنے سامنے تیری چٹیا پکڑ کر اس گھر سے نکلواؤں گی۔''

''میرا شوہر تیرا کیا لگتا ہے؟'' آمنہ بولی۔ ''اری جا بڑی دیکھی ہیں تیرے جیسی' سستی عورتیں۔۔۔۔۔۔۔مرد کا کیا ہے' وہ تو طوائف کے پاس بھی جاتا ہے۔ دو ٹکے کی عورت کے پاس بھی جاتا ہے' مگر پھر بیوی کے پاس واپس آ جاتا ہے۔ تیری حیثیت ایک جوتی کے برابر ہے۔ جب تک آرام دیتی ہے' پہن لی جاتی ہے پھر اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دی جاتی ہے۔''

''واہ واہ۔۔۔۔۔۔۔'' ستارہ نے ہاتھ نچائے۔ ''آج تیری ایسی جرات کہ تو اس گھر میں میرے سامنے منہ لگنے آئی۔ یہاں کسی کو اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ میرے معاملے میں بولے۔''

''میں تمہارے واہیات معاملوں میں بولنے نہیں آئی' اپنے معاملے میں بولنے آئی ہوں۔''

''تو میرے شوہر کے کمرے میں کیوں آئی؟''

''یہی تو میں تجھ سے پوچھنے آئی تھی' بلکہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ تیرا شوہر کیسا ہے کہ تو اس کے ہوتے ہوئے دوسرے مردوں کو گرماتی پھرتی ہے۔''

بس اتنا سننا تھا کہ ستارہ نے آگے بڑھ کر آمنہ کو دبوچ لیا۔ آمنہ اپنے بچاؤ میں چیخنے چلائی۔۔۔۔۔۔۔تو صغرا بی چیخ و پکار کی آوازیں سن کر ننگے پاؤں دوڑتی آئیں۔

ناصر نے آگے بڑھ کر آمنہ کو چھڑا لیا۔ آمنہ کے چہرے پر ستارہ نے اتنے ناخن مارے تھے کہ لہو کی سرخ سرخ لکیریں اس کے آنسوؤں کو بھی لال کئے جا رہی تھیں۔

ہانپتی ہوئی آمنہ کو دور بٹھا کر ناصر لپک کر آیا اور اس نے ستارہ کو دھنک کر رکھ دیا۔ آج اس کی غیرت بھی جاگ اٹھی تھی۔ مگر صغرا بی بیچ میں آ گئی۔

وہ نہیں چاہتی تھی۔ گھر کا آنگن جنگ و جدل کا نقشہ بن جائے۔

بپھری ہوئی ستارہ نے اپنے آپ کو ناصر کی گرفت سے چھڑایا اور لپک کر صغرا بی کو دبوچ لیا۔

''بڈھی ڈائن' میں آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

مغضوب الغضب درندے کی مانند اس نے صغرا بی کے گریبان کو پکڑ کر اس کے سر کو دیوار پر اتنی زور سے مارا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔

شام تک اس نے دم توڑ دیا۔

خون کچھ باہر بھی نکلا تھا' خون کچھ دل کے اندر بھی رہا تھا۔

ہارٹ فیل ہوا۔۔۔۔۔۔دماغ کی رگ پھٹ گئی۔۔۔۔۔۔یا شرم کے مارے اس نے پردہ کرلیا۔وہ جو بھی مشہور کرتے مناسب تھا۔ورنہ حقیقت یہ تھی کہ صغرا بی بی کو ستارہ کے خونی پنجے نے چاٹ لیا تھا۔

کیا ہو گیا؟

اور کیا ہوگا؟

اس خیال سے ایک شب جعفر گھر سے نکل گیا' کہاں؟ کس طرف؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔

باقی اس گھر میں کیا رہ گیا تھا جو آمنہ وہاں رہتی۔پھر زچگی کے دن بھی قریب آ رہے تھے۔وہ اپنا سامان لے کر میکے آ گئی۔

اس نے تو اپنا حق چھیننا چاہا تھا' اس کو اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑا تھا۔

جب ننھی سی کلی اس کے پہلو سے ہوئی تو اس نے اسے گود میں لٹا کر بے تحاشا آنسو بہائے۔

پہلے بچے کا جنم خوشیوں کے خزانے لے کر آتا ہے۔اس کی بیٹی پیدا ہوئی تو اسے معلوم بھی نہ تھا' اس کا باپ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیوں چھوڑ کر چلا گیا؟

بچی ایک سال کی ہوئی تو مشورہ دینے والے پالتو بلی کی طرح قریب آ کر بیٹھ گئے۔جب شوہر لاپتہ ہو جائے۔جب کڑ کڑ کرتی جوانی پچھلے پہر سونے نہ دے اور جب ایک ننھی معصوم جان بلک بلک کر روئے۔۔۔۔۔۔تو پھر سب ایک ہی مشورہ دیتے ہیں۔

آمنہ نے کئی بار سوچا۔اس نے اس شادی سے کیا پایا تھا؟ ایک بچی جو برسات کے اولوں کی طرح اس کی گود میں آ گری تھی۔

اسے تو سہاگ کی وہ رات بھی نصیب نہ ہوئی تھی جس کے لیے اس نے اپنی کوری جوانی کا دان دیا تھا۔پھر وہ کس برتے پر انہونی بات کا انتظار کر رہی تھی۔

جب کوئی محبت کا مذاق اڑائے تو محبت بے معنی اور بھونڈی ہو کر رہ جاتی ہے۔

آمنہ نے بہت دن تک سوچ سوچ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔بی اے کے بعد اس کی شادی ہو گئی تھی۔اب اپنی تعلیم مکمل کر کے وہ نوکری کرنا چاہتی تھی۔اس کے دل میں کوئی خواب تھا نہ ارمان۔ایسے جیسے پھولوں کی تلاش میں وہ کانٹوں کی نگری میں جا نکلی تھی اور انجانے میں تلوے لہولہان کر لیے تھے۔

انہی دنوں جب بچی کی بوتل کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کتابوں کو لیے بیٹھی رہا کرتی تھی' اسے ایک خط ملا۔

ابوظہبی

آمنہ!

گناہوں کی تلافی بھاگ جانے سے نہیں ہوتی۔ اب جب میں نے ملازمت تلاش کر لی ہے' گھر لے لیا ہے۔ تنہائی میں اپنے آپ کو جی بھر کے ملامت کر لی ہے تو مجھے کفارہ ادا کرنے کی ایک ہی صورت نظر آئی ہے۔ تم نے اگر مجھے معاف کر دیا ہو تو بچی کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ اس طرح آنا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ساتھ کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ ماضی کی تلخ یادیں بھی وہیں چھوڑ دینا۔ ہم نئے ماحول میں نئے ساز و سامان کے ساتھ' نئے سرے سے اپنی زندگی کی ابتدا کریں گے اور اگر تم میں معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ ٹکٹ واپس بھیج دینا جو آج تمہارے نام رجسٹری کر رہا ہوں۔

خطا کار ۔۔۔۔۔۔۔ جعفر

ستارہ نے اپنی دانست میں آمنہ کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ مگر جب اس نے سنا' آمنہ اپنے شوہر کے پاس چلی گئی ہے تو نئے سرے سے اس کے اندر بھونچال سے اٹھنے لگے۔ اب تو صغرا بی بی بھی نہیں تھی۔ جس پر وہ وقت بے وقت اپنا غصہ نکالا کرتی تھی۔ اور اب صرف ناصر رہ گیا تھا۔ سو وہ صبح و شام ناصر کے پیچھے پڑی رہتی۔ ناصر کیا کرتا۔ اس نے چپ کا روزہ رکھ لیا۔ ستارہ جیسی عورت کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ناصر کی خاموشیوں نے ستارہ کو اور دیوانہ کر دیا۔

ایک رات ۔۔۔۔۔۔۔ جب وہ حسب معمول اپنی زبان کی تیز تلوار چلا رہی تھی' ناصر نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔ جب اسے ناصر کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں تو اس پر غیض و غضب کا جن سوار ہو گیا۔

غصے سے بھری ہوئی اٹھی' باورچی خانے سے تیز چھری نکال کر لے آئی اور ناصر کے نرخرے پر پھیر دی۔ صابر شوہر دو منٹ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ یہی چھری جب وہ اپنے بچوں پر آزمانے لگی تو شور مچ گیا۔

پولیس آ گئی اور ستارہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی گئی۔

اس کے والدین رسوخ والے تھے' پیسہ کمانا جانتے تھے تو لٹانے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔

مہینوں مقدمہ چلتا رہا۔ سب پر امید تھے کہ ستارہ چھوٹ کر گھر آ جائے گی مگر کچھ فیصلے اللہ تعالیٰ خود کر ڈالتا ہے۔ ستارہ جیل میں بھی

ہذیانی انداز میں اونچے اونچے چلایا کرتی تھی۔ لوگوں کے سر پھاڑنے کو دوڑتی۔ ایک روز اس نے اپنا سر سلاخوں کے ساتھ دے مارا تھا۔ اس کے بعد اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔

ایک سال ہسپتال میں رہی۔ مگر اچھی ہونے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ایسی حالت ہوگئی کہ ہسپتال والوں نے عافیت اسی میں جانی کہ اسے ہسپتال سے رخصت کردیں۔ لیکن ایسی اولاد کو ماں باپ کتنے دن سنبھال سکتے ہیں؟

اب بھی شام نگر کے ایک گاؤں میں لوگ ایک پگلی کو دیکھتے ہیں۔ وہ سارا دن بالکل عریاں حالت میں کوچہ کوچہ گلی گلی پھرتی ہے۔ غیرت مند لوگ اسے پکڑ کر کپڑے پہنا دیتے ہیں مگر وہ پھر اپنے لمبے ناخنوں اور غلیظ دانتوں سے کپڑوں کو تار تار کردیتی ہے۔ اس کی شکل اتنی بھیانک ہوچکی ہے کہ دیکھنے والے کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔ گلیوں کے بچے اس کی تواضع اینٹ پتھر سے کرتے ہیں۔

کوئی ترس کھا کے کھانا کھلا دیتا ہے' کوئی پانی پلا دیتا ہے' ورنہ وہ سارا سارا دن آوارہ گھومتی ہے اور سڑکوں پر سے غلاظت اٹھا اٹھا کر کھاتی رہتی ہے۔

ہاں یہ بات البتہ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ پگلی شہر بھر میں کہیں بھی گھومتی ہے' رات کو ایک مزار پر آ کے پناہ لیتی ہے۔

پو پھٹتی ہے تو وہ بددعا کی طرح مزار کی آغوش سے نکلتی ہے اور شہر کی جانب رخ کرتی ہے۔

اور جب رات سیاہ ہونے لگتی ہے تو بچھڑے بچے کی مانند مزار کی سمت لوٹ آتی ہے۔ لوگ اس مزار کو ''بڑی مائی'' کا مزار کہتے ہیں اور سنا ہے ''بڑی مائی'' کا نام صغراں بی بی تھا۔

جان پدر

بیوی تو سالن روٹی کی طرح ہوتی ہے۔ بھوک لگی اور سالن روٹی کھالی۔ ہر روز کی سالن روٹی بھوک مٹاتی رہتی ہے' مزہ نہیں دیتی۔ وہ مزہ جو کبھی کبھی مرغن قسم کے اشتہا انگیز سجے سجائے کھانوں میں ہوتا ہے۔ جرمنی کے کھانے کے ہر کورس میں سلاد کو اس طرح سجا کر پیش کرتے ہیں کہ بے اختیار نگلنے کی بجائے کلیجے میں اتار لینے کو جی چاہتا ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عزیز دوست ازراہ محبت اپنے ساتھ کسی بڑے اور مشہور ہوٹل میں لے جاتا ہے۔ تب وہ ہوٹل کا منقش مینو ہاتھوں میں پکڑ کر یوں دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔۔۔۔۔آ اور دو عالم کی کسی چیز پر ہاتھ رکھ۔

اظہر پر آج وہی مالا مال کر دینے والا دن آیا تھا۔

اظہر ان مردوں میں سے تھا جو گھر کے بد مزہ کھانے کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی باہر کی چمکیلی اور خوبصورت رکابی میں منہ ضرور مارتے ہیں۔ اگر بہت دن تک وہ گھر کے کھانے پر قناعت کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا سارا نظام انہضام بگڑ گیا ہے اور کھٹی ڈکاروں کی صورت میں وہ اٹھتے بیٹھتے اپنی بیوی سے الجھتا رہتا۔

پتہ نہیں سچ ہے کہ افسانہ۔ ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا۔

''یار تمہاری اچھی خاصی بیوی ہے پھر تم دوسری عورتوں کے پاس کیوں جاتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''کھانا کھانے کے بعد فروٹ کھانے کو دل کیوں کرتا ہے؟''

آج کی دعوت فروٹ والی دعوت تھی۔ جو اس کے عزیز دوست اشتیاق احمد نے دی تھی۔ ایک ہفتے بعد اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہونے والی تھی۔ اصولاً تو شادی کی دعوتیں شادی کے بعد ہی ہوتی ہیں' مگر اس دعوت کی نوعیت ہی جدا تھی۔ یہ وہ خراج ہے جو ایک مرد دوسرے مرد کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ ویسے تو اس کا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ وہ ولیمے کے روز ایک زبردست مجرا کرائے گا۔ اپنی دل پسند گلوکارہ کو بلوائے گا۔ مگر کچھ دوستوں نے کہا تھا' مجمع اکٹھا کر کے گانا سننے سے کیا فائدہ ہوگا۔ خصوصاً ان شادی شدہ دوستوں کو جن کی بیویاں بھی ساتھ ہوں گی۔ اور جیب سے نوٹ نکالتے وقت ان کے ہاتھوں پر عقاب جیسی نگاہ رکھیں گی۔ اس لیے اس ''شبینہ پروگرام'' کا بندوبست کیا گیا تھا۔

اظہر نے کل رات اپنی بیوی سے کہا تھا۔''اشتیاق شاپنگ کے سلسلے میں کراچی جانا چاہتا ہے۔''

''تو۔۔۔؟''

''مجھے بھی ساتھ لے کر جانا چاہتا ہے۔تم جانتی ہونا'ایک ہفتے بعد اس کی شادی ہے اور میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔''

''واپس کب آؤ گے؟''

''بس دو تین دن میں' زیادہ دن تو رک نہیں سکتے وہاں۔''

''کہاں ٹھہرو گے؟''

''اس کے ساتھ ہی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔''

بیوی خاموش ہو گئے۔روکنے کا جواز ہی نہ تھا۔جبکہ وہ اشتیاق اور اس کے خاندان کو خوب اچھی طرح جانتی تھی بلکہ خوب آنا جانا تھا۔

اظہر جاوید مست ہاتھی کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔جب بھی اس کے لیے حجلہ عروسی کا اہتمام کیا جاتا۔وہ اپنی تمام تر مردانہ برتری کے ساتھ اندر آیا کرتا تھا۔اس میں چھا جانے کی طاقت تھی۔وہ اسیر نہیں ہوتا تھا' بے دم کر دیتا تھا۔شکار نہیں تھا' شکاری تھا۔ بھیک نہیں مانگتا تھا' سانپ کی طرح پھنکارتا تھا۔اور پھنکارنے والے مردوں کو عام طور پر بجی سجائی عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔حسن کی دکان کے سب بھاؤ اور بے شمار داؤ پیچ تر ے وہ جانتا تھا۔

مگر جب وہ اندر داخل ہوا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ کمرہ ضرورت سے زیادہ روشن ہے۔اس نے چھت کو دیکھا' چاروں دیواروں کو دیکھا' پھر زمین کی طرف دیکھا۔یہ فاضل روشنی اس کے وجود کی تھی۔

وہ اس کے قریب آ گیا۔صبح اشتیاق نے کہا تھا۔

''آج میری طرف سے یہ آخری دعوت ہے۔مگر یہ ایسی دعوت ہے جسے آپ ساری عمر نہ بھلا سکیں گے۔میں نے کراچی کے نگینے تلاش کیے ہیں۔اور آپ کی سیج کی انگشتری میں سجا دیے ہیں۔دیکھتے ہیں آج کی رات کون بچ نکلتا ہے۔''

''اسے نگینہ نہیں کہتے۔'' اظہر جاوید نے سوچا۔''یہ کسی کے آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے۔'' اس نے ایسی بہت سی رات کی رانیاں دیکھ رکھی تھیں۔سب کے چہرے تقریباً ایک سے ہوتے تھے اور ہتھکنڈے بھی سکھائے پڑھائے ہوئے بے تحاشا میک اپ میں لتھڑے ہوئے چہرے' مکار کے کاجل سے آراستہ آنکھیں اور لب نعلین پر سفید جھوٹ کی لالی۔۔۔۔۔۔ان چہروں کو اگر مرد صبح کے وقت دیکھیں تو قے کر دیں۔اظہر نے نظر بھر کے اس عورت کا سراپا اور چہرہ پھر دیکھا' اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔جو اسے

دکان پر ٹنگی ہوئی رانوں سے منفرد کر رہی تھی۔ جسے اظہر جیسا گوشت کا بیوپاری محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اظہر اپنی زبان کے مہروں کا استعمال خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ جب اطلس و کم خواب کے اندر ریشمی بساط بچھی ہوتی۔ تو وہ خوب سوچ سمجھ کر چال چلتا تھا۔ حالانکہ اس رات والے کھیل میں مات اور جیت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ مگر وہی مردانہ خو بو۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں شیر خود مار کے شکار کھاتا ہے۔ مگر جب شیر پنجرے کے اندر ہو تو اپنی انا کی تسکین کی خاطر اپنے راشن کے گوشت میں پنجے گاڑنے لگتا ہے۔

بے نیازی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر اس نے گولڈن لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

''اللہ آپ یونہی کھڑے رہیں گے یا ہمیں بیٹھنے کو کہیں گے۔ آپ کے استقبال میں کھڑے کھڑے ہماری ٹانگیں دکھنے لگیں۔''

اظہر نے چونک کر سر اٹھایا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تھا۔ تو وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی یہ ادا بھی اسے اچھی لگی تھی۔ اور اب اس کا شائستہ لب و لہجہ اسے گھائل کر گیا تھا۔ وہ کش لے کر زور سے ہنسا اور بولا۔

''بہت نازک ہو تم' اگر میں تمہیں ساری رات کھڑا رکھوں تو؟''

''بندی تو آپ کی غلام ہے' مگر سزا دینے سے پہلے جرم ضرور بتا دیجئے گا۔''

اظہر قہقہہ لگا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ دراصل اس کے لیے اس طوفان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ تپش اس کی قوت برداشت سے زیادہ تھی۔ پر اس کے منہ سے نکلا ہوا فقرہ ''بندی تو آپ کی غلام ہے۔'' اظہر کو مدہوش کر گیا۔ یہی ایک فقرہ مرد کو لوٹ لیتا ہے۔ اور ساری زندگی ہوس کے کھوٹے سکے جیب میں ڈالے وہ اس فقرے کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے۔ کاش بیویاں یہ بھید جان سکیں۔

''تمہارا جرم یہی ہے کہ تم بہت حسین ہو۔ حسین بھی ہو' شائستہ کلام بھی۔'' وہ مڑ کے آیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں جیت کے سارے رنگ تھے۔ کجرے میں ڈوبی اس کی سیاہ آنکھوں کی اصلی چمک کہہ رہی تھی ''اب بچاؤ فضول ہے۔'' اس کے چہرے کی مسکراہٹ عجیب تھی۔ مسکراہٹ تھی یا اسرار کی گرہ۔

''مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو؟'' اظہر نے مرد بنتے ہوئے کہا۔

''کیا گھور گھور کر دیکھنے کا حق صرف مردوں کو ہے۔ خود تو ہر زاویے سے عورت کو گھورتے ہیں۔ وہ بیچاری ذرا نظر بھر کے دیکھ لے تو انہیں برا لگتا ہے۔''

''یہ تو غیر قدرتی سا ہے۔ عورتیں مردوں کو اس طرح نہیں تاڑا کرتیں۔''

''مرد خوبصورت ہو تو عورت اپنے اصول کی دیوار توڑ دیتی ہے۔''

یہ دوسری مات ہے۔ اس کا پیادہ جگہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ آج کی رات سارے پیادے، اسپ، فیل، شاہ سب مارے جائیں گے۔ اظہر نے اس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھوں سے اپنے وجود کا سارا دباؤ ڈالا اور بولا۔

"بیٹھ جاؤ اور یہ بتاؤ کہ یہ بات تم مجھ سے پہلے کتنے مردوں سے کہہ چکی ہو؟" اگرچہ یہ چال باوقار نہ تھی، مگر اظہر کو بازی آگے لے جانا تھی۔

"جتنی عورتوں سے آج تک آپ سچ بول سکے ہیں۔"

"ہم مرد جھوٹ بالکل نہیں بولتے۔ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔"

"ہم ہی عورتیں ساری زندگی جھوٹ بولتی ہیں کہ پہلا جھوٹ بولنے کا سلیقہ ہمیں مرد ہی سکھاتے ہیں۔"

"تم بڑی ہوشیار عورت ہو۔"

اظہر نے پھل والی پلیٹ اٹھالی۔ اور انگور کا ایک دانہ توڑ کر اپنے منہ میں ڈالا اور دوسرا دانہ اس کے ہونٹوں میں رکھ دیا۔

"یہ ہوشیاری بھی تو حضور کی دین ہے۔" یہ کہہ کر اس نے انگور کا دانہ دوبارہ اپنے دانتوں میں دبالیا۔ اس طرح جیسے وہ اظہر کو کچل دینے کی قوت رکھتی ہو۔

"ہوشیار عورت خطرناک لگتی ہے۔"

اظہر نے انگور کا دوسرا دانہ کھایا۔

"حالانکہ مرد خطروں سے کھیلنا پسند کرتا ہے۔"

"کیا مناظرہ شروع کر رکھا ہے۔" وہ ایک دم گرجا۔

"تم ڈائیلاگ کا مقابلہ کرنے آئی ہو؟"

"میری یہ مجال" وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں اسرار ہی اسرار تھا۔ لمحہ بھر کو اظہر چونکا۔ ایک بگولہ سا قریب آیا تھا۔ پھر گول گول چکر کاٹتا دور چلا گیا۔

"اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔آپ ہی کوئی بات کیجئے۔"

وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ کوٹ اتار کر ہینگر پر لٹکا دیا۔ اور پھر کنگھی سے اپنے بال درست کرنے لگا۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی وہ خوبصورت مرد ہے یا یہ حرافہ اپنا خنجر آزما رہی ہے۔

"اور نہیں تو میرا نام ہی پوچھے۔"

اظہر آ کر پلنگ پر چت لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ لیے۔

وہ گھنگھرو بجاتی آئی اور اس کے بوٹ کے تسمے کھولنے لگی۔

"تم جیسی عورتوں کا کوئی ایک نام تو نہیں ہوتا۔ ہر رات نیا نام رکھ لیتی ہو۔"

"یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ اصل میں رات کے سودے میں ہمارا نام ہی بکتا ہے۔ جیسا گاہک دیکھا' ویسا نام رکھ لیا۔ کم از کم ہم عورتوں کو ہر رات نیا نام رکھنے کی تو آزادی ہے نا۔ شاید اسی آزادی کو استعمال میں لانے کے لیے ہم یہ ڈھونگ رچاتے ہیں۔"

"اُفوہ!" اظہر نے بیزار ہو کر منہ پھیرا۔ "مجھے تم عورتوں کی یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ ذرا ہمدردی جتاؤ' چھالے کی طرح پھوٹ پڑتی ہیں۔ مجھے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں ملی جو اس رات اپنی درد بھری کتھا نہ سنانا چاہتی ہو۔"

"تو پھر آپ نے کتنی عورتوں کی دکھ بھری داستان اب تک سنی ہے؟"

"پہلے پہل تجربہ نہیں تھا' تو یہ بک بک سن لیا کرتے تھے۔"

"اور اب تجربہ کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔"

"تم جانتی ہو' ہم تو وقت کی تھکن اتارنے کے لیے تم لوگوں کے پاس آتے ہیں۔ ایسی فضول کہانیاں سنانے کے لیے ہماری اپنی عورتیں ہیں۔ جو اٹھتے بیٹھتے ہمارے مظالم اور اپنی تکلیفوں کے قصے بیان کرتی رہتی ہیں۔"

اس نے اظہر کی جرابیں اتاریں اور ان کو بوٹ میں ڈال دیا۔ بالکل گھریلو عورت کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر بولی۔

"میں آپ کو کوئی گیت سناؤں؟"

"نہیں' جب سے ٹیلیویژن آ گیا ہے' ہمیں گانے سننے کی حسرت نہیں رہی۔"

"میرا خیال ہے آپ کے دل میں تو کوئی حسرت بھی نہیں رہی۔ بڑے عرصے سے تمناؤں کا چمن سیراب کرتے آ رہے ہیں۔ تھک گئے ہوں گے۔ لایئے میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

اس نے اظہر کی ٹانگوں پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو اظہر کے اندر جھکڑ چلنے لگے۔ اسے یوں محسوس ہوا' اس کی پائنتی ایک نقاب پوش عورت بیٹھی ہے۔ جس کے سارے وجود کو دیکھنے کے باوجود وہ محسوس نہیں کر سکتا۔ مرد کو اس وقت بہت بے چینی ہوتی ہے جب وہ عورت کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"پہلے تم غسل خانے میں جا کر اپنا منہ دھو کے آؤ۔ مجھے اتنے زیادہ میک اپ سے وحشت ہوتی ہے۔"

وہ آرام سے کھڑی ہوگئی۔ اپنا قوس وقزح کے رنگوں والا دوپٹہ اتار کر صوفے پر رکھ دیا۔ مسکرائی اور بڑی تابعداری سے گھنگھرو بجاتی غسل خانے میں چلی گئی۔

اظہر نے جھک کر دیکھا۔ اس نے سیاہ سینڈل پہنے ہوئے تھے اور عنابی نیل پالش لگائی ہوئی تھی۔ مگر اس کے پاؤں میں جھانجھنیں نہیں تھیں۔ تو یہ گھنگھروؤں کی آواز کہاں سے آئی تھی۔ اس کے پیکر میں جلترنگ تھے کیا؟

وہ صرف منہ ہی دھو کر نہیں آئی' جوڑا کھول آئی تھی۔ لمبے لمبے بال کندھوں پر بکھر گئے تھے اور چہرہ شیشے کی طرح بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ تولیے سے اپنے ہاتھ اور کہنیاں پونچھتی ہوئی آئی پلنگ کے قریب کھڑی ہوگئی۔ اظہر نے اس کا چہرہ دیکھا۔

پھر دیکھا۔۔۔۔۔۔۔

پھر دیکھا۔۔۔۔۔۔۔

اب تو کوئی نقاب نہ تھا' اس ملیح چہرے پر۔ میک اپ کے ساتھ ہی دلنوازی کی ادا بھی اتر گئی تھی' سوز تھا' اداسی تھی۔ ایک پامال کی ہوئی' نوچی کھسوٹی ہوئی شام اتر رہی تھی۔ جب وہ بڑی دیر تک بت بنا اس کو دیکھتا رہا تو وہ آہستہ سے پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"یہ ضد تمہاری تھی کہ میں میک اپ کی تہہ اتار دوں۔ یہ خوف مجھے تھا کہ تم میرے چہرے کی ندی پار نہ کر سکو گے۔"

اس نے آگے بڑھ کر بتی بجھا دی۔

"ہم جیسی عورتوں کے چہروں پر کوئی نہ کوئی نقاب رہنا ہی چاہیے۔۔۔۔۔۔۔ ہے نا؟"

اظہر نے ہلکی سی سرگوشی سنی اور پھر مے خانے کا در کھل گیا۔

پھر نہ جانے کیسے ہوا۔ اظہر کو یوں لگا جیسے پھولوں کے ڈھیر میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ خوشبو اس کے سینے پر خنجر چلا رہی ہے۔ اور روشنی کی دھار سے لہو کی کرن پھوٹ رہی ہے۔

اس نے سوچا۔ تمام تر کوشش کے باوجود آج کی بازی وہ لوٹ کر لے گئی اور وہ مات کھا گیا۔ ورنہ مات جیسا احساس کیوں جاگ رہا ہے؟

اس نے عورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر چھوڑا تھا۔ ایک وہ جو صرف بیویاں بنانے اور بچے پیدا کرنے کو بھیجی جاتی ہیں اور دوسری ۔۔۔۔۔۔ رات کی رانیاں"

رات جن کے چہرے کو اجالوں میں نہلا دیتی ہے۔اور صبح جن کے مکھڑوں کو سیاہ کر دیتی ہے۔

آج یکا یک وہ سوچنے لگا۔"عورت کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے۔اور وہ بے حد خطرناک ہوتی ہے۔پورا پورا مرد اس کی جھولی میں آگرتا ہے اور اپاہج ہو جاتا ہے۔"

"ذرا بتی جلاؤ۔اور میز پر سے میرے سگریٹ اور لائٹر اٹھا کر دو۔" وہ بیوی نہیں تھی لیکن وہ حکم چلا رہا تھا۔وہ اٹھ کر گئی اور سگریٹ لے آئی۔سگریٹ کا کش لے کر اظہر نے اسے غور سے دیکھنا چاہا۔وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنے بال سمیٹ رہی تھی۔

وہ چہروں کے کھوج میں نکل کھڑا ہوا۔تاکہ اس کے چہرے پر اسرار ڈھونڈ سکے۔پچھتانے لگا کہ اس کا نام کیوں نہ پوچھ لیا۔کچھ بھی ہو۔نام شخصیت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔یہ ہر رات ایک نیا نام رکھتی ہیں تو کیا ہوا۔ایک رات کے نام سے ایک رات کا اسرار کھل جاتا ہے۔

اظہر کو سوچوں میں گم دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔آکر پلنگ پر بیٹھ گئی اور بولی۔

تمام رات اس انتظار میں گزار دی میں نے کہ تمہیں میرا نام یاد آجائے گا۔میری کوئی ادا' کوئی بات ذہن میں آجائے گی' مگر اب ۔۔۔۔۔۔رات ۔۔۔۔۔۔رات گزر گئی ہے۔جانے سے پہلے بتا دوں۔میرا نام بتول ہے اجو۔اور یہ بھی یاد رکھنا کہ آج میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار اپنا اصل نام بتایا ہے۔"

"بتول۔۔۔۔۔۔"

اظہر کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا اور تکیے کا ذرا سا کونا جل گیا۔

محلہ "ونگ گراں" میں مولوی عطاالٰہی صاحب رہتے تھے۔وہ محلے کی مسجد کے موذن تھے۔دن کے وقت محلے کے بچوں کو مسجد کے دالان میں کلام پاک پڑھایا کرتے تھے۔کبھی کبھی جب امام صاحب چھٹی پر ہوتے تو وہ جماعت کی امامت بھی کرتے تھے۔طبعاً نیک' حلیم' بردبار اور متقی انسان تھے۔رزق حلال پر ایمان رکھتے تھے۔اس لیے محلے کے گھروں کی روٹیاں قبول نہیں کرتے تھے۔ان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔بڑے دونوں بیٹوں کو دینی تعلیم دے کر انہوں نے تبلیغ کے لیے افریقہ بھیج دیا تھا اور چھوٹے دونوں بیٹے دوبئی میں کاروبار کرتے تھے۔سب سے چھوٹی بیٹی جو مولوی صاحب کی بہت لاڈلی تھی' ہر وقت آنکھوں میں سرمے کی طرح رکھتے تھے۔انہوں نے اسے صرف آٹھ جماعتوں تک پڑھایا تھا۔اور کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھے۔تاکہ شرع کے حکم کے مطابق اس کو جلدی سے اپنے گھر بھیج دیں۔مولوی صاحب کے مکان کے اوپر ایک چوبارہ تھا۔جس میں دو کمرے' ایک غسل خانہ اور برآمدہ تھا۔

جب ان کے چاروں بیٹے ملک سے باہر چلے گئے تو انہوں نے وہ چوبارہ کرائے پر اٹھانا شروع کر دیا۔

وہ اپنے گھر میں شور ہنگامہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے چوبارہ بال بچوں والے کو دینے کی بجائے ہمیشہ طالب علموں کو دیا کرتے۔ دو یا چار طالب علم وہاں ٹکے رہتے۔ کچھ آمدنی بھی ہو جاتی۔ یہ سلسلہ کئی سالوں سے چلا آ رہا تھا۔

اظہر جاوید کی آوارگیوں سے تنگ آ کر اس کے والد نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تو وہ اپنے دوست کی مدد سے اس چوبارے میں آ گیا۔ کتنے سالوں سے وہ اکنامکس کا ایک پرچہ دے کر بی اے پاس نہ کر سکا تھا۔ یہاں وہ طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا مگر علم کی اسے طلب نہ تھی۔ طلب اسے کسی اور شے کی تھی۔ اور وہ شے گلی کوچوں میں نایاب نہ تھی۔

اتفاق سے چھٹیوں کا موسم آیا تو باقی طالب علم گھر چلے گئے۔ اظہر جاوید کو وہیں رہنا تھا۔ اس کے لیے مولوی صاحب کے دل میں بھی اترنا تھا۔ گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا' جمعہ کی نماز میں شامل ہوتا' کبھی کبھی مولوی کی بیوی کو جنہیں سارے محلے والے ''بیوی جی'' کہتے تھے' سودا سلف بھی لا دیتا۔

پھر ایک روز اس کی نظر بتول پر جا پڑی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ چودہ سالہ بتول گھر بھر کے کپڑے دھو کر چلچلاتی دھوپ میں باہر صحن میں کھڑی رسی پر ڈال رہی تھی۔ اس کی باریک قمیض بھیگ گئی تھی۔ دھوئے ہوئے کپڑے اس نے سر پر رکھ چھوڑے تھے۔ جن میں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک کر اس کی قمیض پر ڈیزائن بنا رہا تھا۔ وہ ایک ایک کپڑا نچوڑتی اور پھیلاتی جاتی۔

اظہر نے اوپر اپنے کمرے میں کھڑے ہو کر اچھی طرح دیکھا۔ گلاب کی ڈال پر ننھے ننھے غنچے آ رہے تھے۔ چہرے پر کچے آم کا بور تھا۔ سوندھی سوندھی خوشبو اس کے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اظہر نے سوچا' ذرا لڑکی کو جگایا جائے۔

مرد کی نگاہ کے زاویے بدل جائیں تو سوئی ہوئی لڑکی جاگ اٹھتی ہے۔ بتول کبھی کبھی ہمسایوں کے گھر جا کر ٹی وی دیکھا کرتی تھی۔ ٹی وی میں جو نہ دیکھ سکی تھی' وہ اسے اظہر کی آنکھوں میں نظر آ گیا تھا۔ اس لیے نگاہوں کے تبادلے جاری ہو گئے تھے۔

ایک دن اظہر جب بیوی جی کو سودا دینے گیا تو باورچی خانے سے نکلتے وقت دھیرے سے بولا۔ ''کبھی اوپر آؤ نا؟''

وہ بت بنی اسے دیکھتی رہ گئی۔

نظروں کے تصادم کے بعد کیا ہوتا ہے۔ وہ نہ جانتی تھی۔ سارا دن بے قرار پھرتی رہی۔ ہینڈ پمپ میں سے پانی نکالنے لگتی تو اس کا ہینڈل ایک چیخ کے ساتھ کہتا۔ ''کبھی اوپر آؤ نا!''

رات کو تھک ہار کے صحن میں سوتی تو چاند چہرے پر جھک آتا اور کہتا۔ ''کبھی اوپر آؤ نا''

''اوپر تو کچھ بھی نہیں۔'' وہ اپنے آپ سے کہتی۔ ''مگر اوپر کیا ہے؟'' اس کا اپنا آپ پوچھتا۔ ایسے لگتا جیسے وہاں ادراک اور شعور کی گٹھڑیاں پڑی ہیں۔ وہ کوئی گٹھڑی کھول کر دیکھنا چاہتی تھی۔''

ایک روز بیوی جی کے پیٹ میں بہت درد اٹھا تو اظہر انہیں اسپتال لے گیا۔ ٹیکہ لگوایا اور دوائیں لے کر گھر چھوڑ گیا۔ اپنے سامنے اس نے بیوی جی کو دوائی پلائی اور اگلی خوراک کا وقت بتول کو بتایا۔ پھر بیوی جی سے بولا۔ ''میں اوپر اپنے کمرے میں ہوں' جب ضرورت پڑے بلا لیجیے گا۔''

بیوی جی نے دعائیں دیں۔ جاتے جاتے اس نے بتول کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب چار بجے ان کو دوا دینی ہے۔ مجھ سے وقت پوچھ کر ان کو دوائی دے دینا۔''

اور بس ایک نظر اس کو دیکھ کر چلا گیا۔ بتول کو ایسے لگا جیسے وہ جاتے جاتے کہہ گیا ہے۔ ''کبھی اوپر آؤ نا!''

مگر اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

ابھی چار بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے کہ بتول اوپر آ گئی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ ایک دم باہر نکل آیا۔

''اوہ تم ہو؟۔۔۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟''

''اماں تو جاگتی نہیں۔ چار بجنے والے ہیں۔ میں نے بہت جھنجھوڑا۔ بہت جگایا۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ وہ رات کی جاگی ہوئی تھیں' ان کو آرام کرنے دو۔''

ایک عیار مسکراہٹ اظہر کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ وہ کیسے بتا دیتا کہ آج بیوی جی کی دوائی میں اس نے تھوڑی سی نیند کی دوا ملا دی ہے۔

''اندر آ جاؤ۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''ڈرو نہیں' میں ابھی تمہارے ساتھ جا کر انہیں دیکھوں گا۔ ابھی انہیں آرام کرنے دو۔''

وہ ڈرتی جھجکتی اندر آ گئی۔ کوئی اس کے ذہن کے قریب کہہ رہا تھا۔ ''اندر نہ جاؤ' اندر نہ جاؤ۔'' ان آوازوں سے بچنے کے لیے وہ دوڑ کر اندر آ گئی۔

اندر تو کچھ بھی نہیں تھا' ایک اندھیرا کمرہ' دو چارپائیاں' میلے کپڑے اور لکھنے کی میز۔۔۔۔۔۔۔ ادراک اور آگہی کی بند گٹھڑیاں کسی کونے میں نہ تھیں۔ اور اس کمرے میں آنے کے لیے وہ پچھلے ایک ہفتے سے بے قرار تھی۔ وہ پلٹ کر جانے لگی تو اظہر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جب وہ لوٹی تو ادراک کی سب گٹھڑیاں کھل چکی تھیں۔ معصوم ذہن بعض باتوں کو نہ سمجھنے کے باوجود ان باتوں کا تمنائی رہتا ہے۔ آٹھ دن تک اظہر' بیوی جی کو نیند کی دوا پلاتا رہا۔ وہ گہری نیند سوتی رہیں اور بتول بند کوٹھڑی کی بھول بھلیوں میں کوئی نیا

راستہ تلاش کرتی رہی۔

بیوی جی ٹھیک ہو گئیں تو یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ کتے کے منہ کو لہو لگ جائے تو کہیں نہ کہیں سے گوشت اٹھا لاتا ہے۔ چھٹیوں کے تین مہینے اظہر جاوید نے بیوی جی اور مولوی جی کی جی جان سے خدمت کی۔ دعائیں لیں۔ محلے میں سر جھکا کے چلتا۔ محلے کی بیٹیوں کو نظر اٹھا کر نہ دیکھتا۔ ہر بزرگ عورت کو سلام کرتا۔ اس زمانے میں ایسا شریف لڑکا۔۔۔۔۔۔لوگ حیرت زدہ رہ جاتے۔

چھٹیاں ختم ہونے سے ایک ہفتہ پہلے اچانک مولوی صاحب کے دونوں چھوٹے بیٹے آ گئے تو ایک دن موقع پا کر اظہر نے بتول سے کہا۔ ”بتول میں گھر جا رہا ہوں' اپنی ماں کو لانے۔“

وہ صرف اس کی صورت دیکھتی رہی۔

”میری ماں آ کے تمہارا رشتہ مانگے گی۔“

مگر بتول چپ چاپ بیٹھی زمین کی طرف دیکھتی رہی۔

”تمہیں کیا ہوا بتول؟“ اظہر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کچھ تو بولو۔“

”دیکھو' اجو مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟“

بتول نے اپنے جسم پر سے چادر ہٹا دی۔

اظہر کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے ہنس کر بولا۔ کچھ نہیں' ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم میرا انتظار کرنا اور دیکھو میرا نام ہرگز کسی کو مت بتانا۔“ اس کا پھول سا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر دوبارہ بولا۔ ”کسی کو نہیں بتاؤ گی نا؟“

”نہیں“ اس نے منفی انداز میں سر ہلایا۔

”شاباش' اگر تم نے میرا نام بتا دیا تو سب کام خراب ہو جائے گا۔“

اظہر اگلے دن چلا گیا۔ کچی عمر کی فصیل پر کسی نے نقب لگا دیا تھا۔ بتول کچھ جانتی تھی' کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس سارا دن اپنے آپ کو چادر میں چھپائے رکھتی۔ ویسے بھی مولوی صاحب لڑکیوں کو زیادہ تعلیم کے خلاف تھے۔ بیوی جی' بتول کو اکیلے کہیں جانے نہیں دیتی تھی۔ اسے زمانے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی انہوں نے مگر چادر کے اندر اندر اس نے ایک زمانہ دیکھ لیا تھا۔

جس دن چادر کی یہ چاردیواری ہٹی' گھر میں زلزلہ آ گیا۔ مولوی صاحب کچھ کھا کے ایسا سوئے کہ اٹھ نہ سکے۔ بھائیوں نے بے حیا' کمینی' آبرو باختہ کو اتنا مارا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی۔ دھکے دینے تک کا عالم تو یاد تھا' اس سے آگے کیا ہوا کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

اس کی آنکھ اسپتال کے جنرل وارڈ میں کھلی تھی اور وارڈ کی جمعدارنی جھاڑو بغل میں دبائے چٹخارے لے لے کر سب مریضوں کو اس کی آمد کا قصہ سنا رہی تھی۔

"اے میں کل صبح سات بجے دوسری بس سے اتری تھی۔ ایک کچلی ہوئی لاش کے قریب یہ پڑی ہوئی تھی۔ بس والا اس کے خصم کو کچل کے بھاگ گیا تھا۔ میں نے دیکھا' یہ حاملہ تھی تو اسے اٹھوا کر اسپتال میں لے آئی۔"

بتول نے اتنا سنتے ہی دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اسے خوب مارا تھا۔ اماں چھڑانے آئیں تو ایک ڈنڈا ان کے سر پر بھی لگا تھا۔ پھر بھائیوں نے چٹیا سے پکڑ کر پچھلی رات اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اور کہا تھا۔ "خبردار لوٹ کر ان راستوں پر مت آنا۔ ہم کل اماں کو لے کر دوبئی چلے جائیں گے' ہم تیری کالک اپنے منہ پر نہیں لگائیں گے اور کبھی وطن واپس نہیں آئیں گے۔"

پتہ نہیں کیسے وہ چل پڑی تھی۔ چلتی رہی تھی۔ جب جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی ہوں تو بصارت آنسوؤں سے دھندلا گئی ہو ذہن پر صدموں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں تو پاؤں آپ ہی آپ چلتے رہتے ہیں۔

شاید وہ بے ہوش ہو کر گر گئی ہوگی کوئی ٹرک کسی مجبور کو کچلتا ہوا گزر گیا ہوگا۔ مگر یہ ٹرک کچلے ہوئے انسانوں پر سے کیوں نہیں گزرتے جن کی دنیا میں کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔

نرس آ گئی' اس کا ماتھا چھوا تو وہ جاگ گئی۔

"ہوش میں ہو تم؟" نرس نے یہ کہہ کر تھرمامیٹر اس کے منہ میں رکھ دیا۔

"اری آ و ری' ہوش میں آ گئی ہے۔"

سارے جنرل وارڈ میں شور مچ گیا۔ زرد رو مدقوق اور بیمار عورتیں اس کے سرہانے اکٹھی ہونے لگیں۔

"اے یہ سب کیسے ہوا؟"

"کہاں سے آ رہے تھے تم دونوں؟"

"تیرے خصم کو کمیٹی والے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"ہے ہے بے چاری کتنی جوان جہان ہے۔"

"اری تجھے کچھ خبر ہے' تیرا خصم گزر گیا۔"

ایک بوڑھی عورت نے اس کا شانہ ہلایا۔ کیونکہ وہ سب عورتوں کو ایسے دیکھ رہی تھی' جیسے ساکت ہوگئی ہے۔

''اسے رلاؤ۔''

ایک اور لنگڑی بڑی بی آگے بڑھی۔

''کیوں بے چاری کو تنگ کرتی ہو۔'' نرس ایک دم کھڑی ہوگئی۔ تمہاری ہی بہو بیٹیوں کے برابر ہے۔''

''چھوڑ دو اس غریب کو' اور اپنے اپنے بستروں پر جاؤ۔''

پتہ نہیں ان الفاظ میں کیا تھا۔ بتول پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

شام کو نرس آئی۔ تو پھر ساری خواتین نے اپنے کان اس کے بستر پر بھیج دیے۔

''کون سا مہینہ ہے تجھے۔۔۔۔۔؟''

وہ چارٹ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور بتول پاگلوں کی طرح اسے تک رہی تھی۔ یہ مہینہ کیا ہوتا ہے؟ کچھ ایسا تھا جو اس نے چادر میں چھپایا تھا۔ چادر ہی کو پتہ ہوگا سب' وہ تو بس دن بہ دن اپنا پھولتا ہوا پیٹ دیکھ رہی تھی۔

''تیرا کام چالو ہوگیا لگتا ہے چھوری؟'' ایک عورت بے تاب ہو کر آگے بڑھی۔

''کچھ پتہ نہیں' کچھ پتہ نہیں' کچھ پتہ نہیں' بس مجھے چھوڑ دو۔'' وہ ہذیانی انداز میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

اسی رات نرس نے بتایا کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔

''اس چھوری سے ذرا تصدیق تو کرلو۔'' بی اماں لنگڑاتی ہوئی آگئیں۔ ''کہیں آٹھ ماہی تو نہیں پیدا ہوگئی' آٹھ ماں کا بچہ بچتا نہیں' ہاں۔''

''کاش یہ لڑکی مر جائے، مر ہی جائے۔'' بتول نے سوچا۔ ''میں کیا کروں گی' اس کو لے کر۔''

کاغذات پر کرتے ہوئے نرس نے پوچھا۔ ''اس کے والد کا نام؟''

نہ جانے کس طرح معصوم سی بتول کے منہ سے ایک دم ''اظہر جاوید مرحوم'' نکل گیا۔

صدمے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اعصاب کو شل کر کے قویٰ کو مردہ کر دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو سارے انسانی نظام کے اندر ایک برقی رو دوڑا دیتے ہیں۔ بتول کے جسم میں صدمات نے ایک برقی رو دوڑا دی۔

اسپتال میں ایک نیک بی بی آیا کرتی تھیں۔ وہ جنرل وارڈ کے مریضوں کو کھانا' پھل اور پیسے دے جایا کرتی تھیں۔ اسپتال کے سارے مریض ان کے منتظر رہتے اور ان کے گن گاتے نہ تھکتے تھے۔ ایک دن مسز عالمگیر آئیں تو بتول کے سرہانے کھڑی رہیں۔

وارڈ کی عورتوں نے جلدی جلدی بتول کی داستان درد بیان کر دی۔ وہ اکثر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے پوچھا کرتیں۔

''بیٹی کیسی ہو؟''

نہ ان کے ہاتھ میں ماما جیسی گرمی تھی' نہ ان کے لب و لہجے میں والدین جیسی شفقت تھی۔ مگر ان کا انداز میٹھا تھا اور یہی انداز بتول کو جل تھل کر جاتا تھا۔ ایک دن انہوں نے پوچھ لیا۔

''بیٹی' فارغ ہو کر کہاں جاؤ گی؟'' تو بتول کی بند آنکھوں کا چشمہ کھل گیا۔ آنسو بہت سے بھید ظاہر کر دیتے ہیں۔ جس دن نرس اسے بتا رہی تھی کہ اب تم ٹھیک ہو گئی ہو اور کل تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ تو اس روز مسز عالمگیر نہ جانے کیسے آ گئیں۔ اور اس کے قریب بیٹھ کر اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے گرم آنسو پونچھتی رہیں۔ پھر اس کے چہرے کے قریب منہ لا کر بولیں۔

''اگر تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں تو میرے ساتھ چلو' اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی۔''

''بیٹی۔۔۔۔۔؟''

اس نے پہلو میں لیٹی ہوئی نرم گرم ننھی سی چیز کو دیکھا۔ گناہ کی وادی میں فرشتے کیوں جنم لیتے ہیں۔ اور یہ میری کون ہے؟ کیا ناتا ہے اس کا مجھ سے؟''

دوسرے دن جب نرس اس کی پراسرار خاموشی پر بڑبڑا رہی تھی' مسز عالمگیر گاڑی لے کر آ گئیں اور وہ چپ چاپ ان کے ساتھ چل دی۔

''تم نے بیٹی کا کیا نام رکھا ہے؟''

''وارڈ کی سب عورتیں اسے پھول کہتی تھیں' تو میں نے پھول ہی لکھوا دیا۔''

''تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟''

بتول۔۔۔۔۔۔اس کا جی چاہا کہہ دے بتول۔ مگر رک گئی۔ ''ایک سال پہلے میرا نام بیٹی تھا' مگر اب صرف دھول ہوں۔''

''نہیں نہیں' تم تو بڑی پیاری لڑکی ہو' کسی بھلے خاندان کی معلوم ہوتی ہو۔''

بتول کے آنسو بہنے لگے۔ یہ بھلے خاندان کا تازیانہ کب تک اس کو زخمی کرے گا۔ منہ کالا کرنے والیاں بھلے گھر کی بھی ہوں' نصیب برے ہوتے ہیں ان کے۔

''جو جی میں آئے کہئے' میں آپ کی خادمہ ہوں۔''

''ہم تمہیں نین تارا کہا کریں گے۔'' وہ محبت سے بولیں۔

انہوں نے اس کا سامان ایک کمرے میں رکھوا دیا۔ اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے محبت دی۔ آسرا دیا۔ اعتماد دیا۔ اس کی بچی کو اپنی اولاد جانا۔ تو وہ کیسے سر اٹھا سکتی تھی۔

ایک سال بعد جب اس کی روح اور جسم کے زخم بھر گئے۔ پھول نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کر دیا تو مسز عالمگیر اسے زندگی کی اس ڈگر پر لے آئیں۔ جو روشنیوں کا لبادہ اوڑھ کے اندھیروں کی سمت جاتی تھی۔ یہ تو وہ بہت دن پہلے سمجھ گئی تھی۔ اس گھر میں بہت سی لڑکیاں تھیں۔ کوئی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی' کسی کو فلموں کا شوق بے یقین راستوں پر لے آیا تھا' کوئی مطلقہ تھی اور کوئی بیوگی کی گدڑی اوڑھ کر آئی تھی۔ جانے مسز عالمگیر کو یہ سب لڑکیاں کہاں سے مل گئی تھیں۔ سب کی سب ٹھکرائی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ مگر مسز عالمگیر انہیں سچے موتی بنا کر پیش کرتی تھیں۔ سب اعلیٰ لباس پہنتی تھیں' پیٹ بھر کر کھانا کھاتی تھیں اور ہر وقت خوش رہتی تھیں۔ کیونکہ سب نے باہر کی دنیا کا مزا چکھ لیا تھا۔ مسز عالمگیر کی چھایا میں کم از کم سکون اور تحفظ ضرور تھا۔

ایک دن بتول نے اپنی کہانی مسز عالمگیر کو سنا دی۔ وہ ضمیر کا بوجھ لے کر اس گھر میں نہیں رہ سکتی تھی اور جانا چاہا تو مسز عالمگیر نے کہا۔ ''نین تارا' اس دنیا میں قدم قدم پر اظہر جاوید ہیں۔ کس کس سے بچوگی؟ ایک بچی کا بوجھ تو اٹھا سکتی ہو' بہت سے گناہوں کے بوجھ کیسے اٹھاؤ گی؟ ایک بار اپنے اندر کی عورت کو کچل دو۔ ضمیر کا گلا گھونٹ دو۔ بچپن کی آوازوں پر چھری پھیر دو۔ بار بار مرنے جینے کا کھیل نہ کھیل سکوگی۔ جو دروازے ایک بار بند ہو جائیں وہ دوسری بار دستک پر بھی نہیں کھلتے۔ یہاں میں تمہارے سر پر ہوں۔ ہر قسم کا تحفظ دے رہی ہوں۔ تمہاری بیٹی تعلیم حاصل کرے گی اور تمہیں وہ کرنا ہوگا جو سب لڑکیاں کرتی ہیں۔''

''جسم کا کھیل'' اس نے دل میں سوچا۔

''دیکھو' کال گرل اور طوائف میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' مسز عالمگیر بولیں۔

''اچھے اچھے' امیر اور مہذب لوگوں کے پاس جانا ہوتا ہے اور کبھی کبھار۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ بھی ایک قسم کا کاروبار ہے۔''

اور مسز عالمگیر اسے کاروبار کے اسرار و رموز سکھانے پر تل گئیں۔ انگریزی سکھائی' فیشن سکھایا' عشوہ طرازیوں کے فن سے آگاہ کیا۔ ہر رات نئے روپ کے ساتھ کھیلنے کا سلیقہ بخشا۔ بتول کو پھول کی فکر تھی۔ وہ تو سکول جانے لگی تھی اور زندگی آسائشوں کی سیج پر لیٹا ہوا ایک سانپ بن گئی تھی۔

اب تو بتول سارے شہر میں نین تارا کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ بلکہ نئی آنے والی لڑکیوں کی استاد بھی وہی تھی۔ مسز عالمگیر بیمار رہتی تھیں۔ سارا کاروبار بتول کے ہاتھ میں تھا۔ وہ یوں خوش رہتی تھی جیسے کبھی غمگین نہ ہوئی تھی۔ ایک روز احساس کی چھری پکڑ کر اس

نے مولوی عطاالٰہی کو اپنے وجود سے نکال کر ذبح کر دیا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں وہ اذان کی آواز نہ سن سکتی تھی۔ جونہی اذان کی آواز ابھرتی وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر اندر چلی جاتی۔ سولہ سال ہو گئے تھے۔۔۔۔۔۔ سولہ طویل سال۔

اظہر نے حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے اس کی طرف دیکھا۔ وہی چہرہ تھا۔ معصوم' انجان' بے گناہ۔۔۔۔۔۔۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین' زیادہ طرح دار ہو گئی تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ سولہ سال اس کا رس نچوڑتے ہوئے گزرے ہیں۔ کچھ دیر پہلے اسی عورت سے وہ مات کھا گیا تھا۔ جو اس کی تجربہ گاہ کی پہلی پہلی بھینٹ بنی تھی۔

''اجو! عورت پہلے مرد کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ مگر مرد سب سے پہلی عورت کو اس طرح ذہن سے نکال دیتا ہے جیسے کوئی زمین پہ تھوک کے دوبارہ اس طرف نہ دیکھنا چاہے۔ جانے مجھے کیوں امید تھی کہ ایک بار اس بازار میں تم سے ضرور ملاقات ہو گی۔ تم اندر داخل ہوئے تو میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں ہر مرد کے لیے کھڑی نہیں ہوتی۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ قاتل کی تصویر ہمیشہ مقتول کی آنکھوں میں رہتی ہے۔''

اظہر بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹتی رہی۔

''اجو۔۔۔۔۔۔'' اس نے اپنی اسرار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔ ''مرد کی شکست یہ ہے کہ وہ اس کو طوائف بنا ہوا دیکھ لے جس کو اس نے پہلے پہل پامال کیا تھا۔ اس کے کئے ہوئے گناہ کا بوجھ تمام عمر عورت اٹھائے پھرتی ہے اور پھر ایک روز وہ اسی کے گھر کا گاہک بن کے جاتا ہے۔ اپنا لوٹا ہوا مال خریدنا پڑے تو مرد کو بڑی خفت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ جان کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی اپنا شغل ترک نہیں کیا۔''

پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی۔

''تمہارے کتنے بچے ہیں اجو؟''

کس قدر وثوق سے وہ پوچھ رہی تھی۔ اظہر کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بڑی بیٹی اس وقت دس سال کی تھی۔ ایک دن اظہر اپنے گھر میں داخل ہوا تو بچوں کے لڑنے کی آوازیں آئیں۔ وہ ان کے کمرے کی طرف نکل گیا۔ بڑی بیٹی نازی' ماں کے دوپٹے کی ساڑھی بنائے' فرش پر بیٹھی تھی اور سب بہنوں اور بھائی سے کہہ رہی تھی۔

''تم دروازے سے اندر آؤ اور مجھے ناچنے کے لیے کہو۔ جب میں ناچنے لگوں تو میری طرف پیسے پھینکنا۔''

پیسے پھینکنے کے موقع پر بچے لڑ پڑتے تھے۔

اظہر نے سنا تو ایک تھپڑ کس کے نازی کے منہ پر مارا۔ پھر اپنی بیوی کے پاس آ کر بولا۔ ''بند کرو یہ وی سی آر کی مصیبت۔ تمہیں کچھ علم ہے تمہارے بچے گھر میں کیا کچھ کرتے رہتے ہیں۔''

اس رات مارے غیرت کے وہ سو نہیں سکا۔ رات بھر اسے یوں لگا جیسے نازی سرد ہواؤں میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی ہے۔ ''جان بابا! میرے بازوؤں میں آؤ۔'' وہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔

''اچھا جو۔۔۔۔۔۔'' بتول نے گھڑی دیکھی۔ ''ہمارا ساتھ ختم ہوتا ہے۔ تم ایسے بیٹھے ہو جیسے تمہیں سکتہ ہو گیا ہے۔ مگر میں جاتی ہوں۔ اجالا پھیلنے والا ہے اور ہم تو صرف اندھیرے کے ساتھی ہیں۔ تم نے میری کسی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ خدا حافظ''

''سنو'' اظہر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

وہ جاتے جاتے رک گئی اور مسکرا کر دیکھا۔ بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

اظہر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ لڑکی کہاں ہے؟ میرا مطلب' وہ بچی کہاں ہے؟''

''وہ بچی۔۔۔۔۔۔ میری یا تمہاری بچی؟''

اب بتول ایسے ہنسی جیسے نائیکہ ہنستی ہے۔ پھر جیسے اس کی ہنسی میں کانٹا چبھ گیا' جانے کے لیے قدم اٹھایا مگر رک گئی۔ کچھ سوچا۔ بڑی ہمت کر کے اظہر کی طرف دیکھا اور بولی۔

''وہ لڑکی تمہارے دوست کے کمرے میں ہے۔''

◆◆◆

داغ سجدہ

''آ گئے مالک؟''

جنت نے قدموں کی چاپ کو پہچانا اور پیشوائی کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔

''آج تو بہت تھک گیا ہوں جنت۔''

عرشی آتے ہی دھم سے بستر پر گر گیا اور جنت ریڈیو کے پاس اپنے مخصوص کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ عرشی کچھ دیر آنکھیں موندے بے سدھ اپنے بستر پر پڑا رہا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ نرم اور گداز بستر اسی کے انتظار میں آراستہ تھا۔ خوبصورت ریشمی رضائی' تہ لگا کر پائتی کی طرف رکھی تھی۔ دونوں تکیے ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ بستر کی شفاف چادر پر ایک سلوٹ نہ تھی۔ یہ سب جنت کی سلیقہ شعاری اور حسن ذوق کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اسے اس بات کا کہاں تجربہ تھا کہ آرام دہ اور مصفا بستر پر سونے سے بھی ایک گونہ تھکن دور ہو جاتی ہے۔ آتش دان میں ہیٹر جل رہا تھا۔ ہلکی روشنی کا ٹیبل لیمپ آن تھا اور سامنے دیوار کے ساتھ ریڈیو اپنی سبز روشنی گلابی میز پوش پر بکھیر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی تانیں اس سبز روشنی سے چھن چھن کر سارے ماحول کو رومانٹک بنا رہی تھیں اور سانولی سلونی سی جنت۔ جسے عرشی اکثر ''پیراڈائز آن ارتھ'' کہتا تھا' ریڈیو والی تپائی کے قریب قالین کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔

کمرے کی ساری فضا اسے مانوس اور محبت بھری محسوس ہوئی۔ واقعی گھر میں ایک عورت کا وجود انتہائی ضروری ہے۔ خواہ وہ خوش سلیقہ نوکرانی ہی کیوں نہ ہو۔

اسے کچھ سال پہلے کی وہ زندگی یاد آ گئی جب وہ نیا نیا اس شہر میں آیا تھا اور ماں سے دور اس نے دو سال اسی مکان میں' اسی شہر میں' مسافروں اور بے وقوفوں کی طرح گزار دیے تھے۔ جرابیں' بنیانیں' قمیصیں۔ اسے کبھی دھلوانے کا خیال ہی نہ آتا تھا جب ضرورت ہوتی نئی خرید لاتا۔ نتیجتاً جب دو سال بعد اس کی ماں اس کے گھر آئی' تو اس نے پچاس جوڑے گندی جرابوں کے' بیس بنیانیں اور بتیس میلی قمیصیں ادھر ادھر سے اکٹھی کر کے دھلوائی تھیں۔ بس اسی روز گھر میں ایک مقدس تبدیلی کا گمان ہوا تھا۔ گھر کی اس صاف ستھری فضا سے جہاں اس کے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی وہاں وہ سہم بھی گیا تھا۔ صاف ستھرے کمروں میں وہ اس طرح سہم سہم کر قدم رکھتا گویا وہ کوئی بچہ ہو....... جس نے ابھی پاؤں چلنا سیکھا ہو....... اور میلے کپڑے اتار کر ان کے لیے کوئی مناسب جگہ

ڈھونڈنے کے لیے وہ اس طرح ہراساں نظر آتا کہ اگر اس نے یونہی چار پائیوں پر کپڑے پڑے رہنے دیئے تو اس کے عیب کے کھل جانے کا اندیشہ ہوگا۔

پھر رفتہ رفتہ وہ اس صفائی سے بھی پریشان رہنے لگا تھا۔ ماں صاف صاف فرش پر ایک تنکا بھی برداشت نہ کر سکتی تھی جب دیکھو فرش یوں چم چم کر رہے ہیں جیسے ابھی کوئی بنی سنوری دلہن اپنے روپ کی تصدیق کرانے فرش پر جھانکنے چلی آئے گی۔ اس احتیاط اور سلیقے سے وہ اکتا بھی گیا تھا۔ پر اس میں اسے ایک اطمینان اور ٹھنڈک بھی محسوس ہوتی تھی۔ پھر ایک سال بعد ہی اس کے صاف ستھرے آنگن چمکدار فرش اور گھر کے مقدس سے سلیقے کو نظر لگ گئی۔

رات کو زلزلے کا ایک ہلکا سا جھٹکا آیا اور برآمدے کا ایک ستون اماں کے اوپر آن گرا۔ ماں کی ضعیفی اس ستون کی متحمل نہ ہو سکی اور تو اور بوا عظمت بے چاری جس نے اماں کے رنڈاپے میں ان کا ساتھ دیا۔ عدم کو بھی ساتھ ہی چل پڑیں۔ اگلے وقتوں کے لوگوں میں کتنا ایثار اور کتنی وفا تھی۔

ہوا یوں کہ اس رات بوا عظمت کو شدید بخار تھا۔ اماں اسی کی خاطر اپنی چار پائی برآمدے میں نکال لائی تھیں۔ ضعیف سی جان۔ جانے کب کوئی ضرورت پڑ جائے اور آوازیں دیتے دیتے گلا سوکھ جائے۔ اسے تو کسی شے کی ضرورت نہ پڑی۔ البتہ ملک الموت کو ان دونوں کی ایک ساتھ ضرورت آ پڑی۔ بدنصیب جنت برتن صاف کرنے کے بعد رسوئی میں ہی سو گئی تھی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی ماں کے پہلو سے چمٹ کر سونا بھول جاتی اور اس کی اماں کب اسے اپنے سے جدا کرنے پر راضی ہوتی تھی۔ بس جاتے جاتے ایسا دھکا دے کر گئی کہ اس کی تو دنیا ہی ڈول گئی۔

عرشی نے سر اٹھا کر ریڈیو کے قریب بیٹھی ہوئی جنت کو دیکھا۔ وہ گھٹنوں پر اپنا سر رکھے اس انہماک سے موسیقی میں کھوئی ہوئی تھی۔ گویا وہ اس کے ہر سر تال سے واقف ہو۔ عرشی کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کوئی غیر ملکی اسٹیشن لگا رکھا تھا اور کسی رقص کی پیاری سی دھن بج رہی تھی۔

''اگر میں کچھ روز اور رات کو دیر سے آتا رہا تو یہ جنت مجھے بھی مغربی موسیقی کا رسیا بنا دے گی۔'' عرشی نے اس کی محویت کو توڑنا اچھا نہ جانا اور جھک کر اپنے جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔

اماں آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ یوں جیسے وہ نامراد جانے کے لیے ہی آئی تھی۔ کتنا ارمان تھا اسے عرشی کی بہو لانے کا اسی کارن وہ اس مرتبہ بوا عظمت کو بھی ساتھ لے آئی تھی کہ دونوں مل کر اس کے لیے چاندی سی بہو ڈھونڈیں گے اور شاید اسی کارن وہ عظمت کو بھی

ساتھ لے گئی تھیں۔ شاید چاند نگر سے کوئی ایسی بہو ڈھونڈ کر ان کا بھیجنے کا ارادہ ہو۔ عرشی کے پاس تو وہ سانولی سلونی۔ من بھاؤنی جنت کو چھوڑ گئی تھی۔

پہلے پہل تو جنت بھی اس کے لیے ایک مصیبت بن گئی تھی۔ اس نے اس مصیبت کو کئی لوگوں کے کندھوں پر ڈالنا چاہا۔ مگر سبھی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ جب اماں اور بوا عظمت کا غم ہلکا ہوا تو عرشی نے جنت سے کہا۔

''تم اپنے گھر واپسظ

''یہیں اپنے محلے کے کئی کھاتے پیتے گھرانے ہیں۔ اس طرح میرے پاس تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔ یونہی بدنامی ہو جائے گی۔ جب بھی کوئی تکلیف ہو یا کسی شے کی ضرورت ہو' مجھے بتا دیا کرنا۔ میں بھی کبھی کبھار تمہاری خیر لیتا رہوں گا۔''

''ہاں......'' جیسے ساری بات جنت کی سمجھ میں آ گئی۔

''تو کیا رات کو میں یہیں سو جایا کروں؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ سہم گئی۔

''میں بعض اوقات بہت رات گئے آتا ہوں۔ جہاں تم نوکری کرو' تمہارا وہیں رہنا اچھا ہے۔''

اگلے دن وہ محلے میں نوکری کی تلاش کو چل دی۔ اس محلے میں تھا ہی کون؟ دو چار گھرانوں میں لڑکے ملازم تھے۔ جہاں اندر باہر سودا سلف کے لیے ہی نوکر چاہیے تھا۔ کچھ گھرانے ایسے بھی تھے۔ جہاں کام کاج کے لیے ملازمہ کی ضرورت تو تھی مگر ان کی بیبیوں نے ایک نوجوان من موہنی لڑکی کو ملازم رکھنے کے نام ہی سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ خیر شیخ صاحب کی منت سماجت کر کے وہ ان کے گھر میں چلی گئی۔ مگر شیخ صاحب کی بیگم صاحب کی گز بھر لمبی زبان نے جنت کا جینا اجیرن کر دیا اور جب شیخ صاحب جنت کی حمایت میں بولنے لگے تو بی بی نے جنت کو رسوا کر کے گھر سے نکال دیا اور دو مہینے کی تنخواہ بھی ضبط کر لی۔

غرض دو چار گھروں سے دھتکارے جانے کے بعد جنت' عرشی میاں کے پاس لوٹ آئی اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر بلکنے لگی۔

''مالک مجھے اسی گھر کی باندی رہنے دیجیے۔ میں کہیں اور نہ ٹک سکوں گی۔''

''جنت تو سمجھتی کیوں نہیں؟'' عرشی عاجز سا ہو گیا۔

''سمجھ رہی ہوں مالک۔'' جنت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''آپ ایک اور بوڑھی سی نوکرانی رکھ لیجئے۔ میں آپ کے سامنے نہیں آیا کروں گی۔ سارا وقت رسوئی میں بیٹھی کام کیا کروں گی۔''

''پگلی۔'' جنت کے اس خیال سے عرشی کو ہنسی آ گئی۔

آگ گھر کے کسی کونے میں بھی روشن ہو۔ تپش سارے گھر میں جاتی ہے۔

''اچھا تو پھر آج سے تم اسی گھر میں رہوگی۔'' عرشی کا دل موم ہو گیا۔

تب سے اس گھر کے طور طریقے میں بھی فرق آ گیا۔ گھر کے سلیقے میں نوجوان ذہن کی خیال آرائی اور نوجوان ہاتھوں کی گرمی بھی شامل ہو گئی تھی۔ اب عرشی کو قدم قدم پر پھسلنے کا ڈر بالکل نہیں تھا' بلکہ گھر آتے ہی ایک سرور کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی تھی۔ تبھی سے یہ جنت اس کے پاس تھی' بھولی بھالی' سادہ لوح۔ فرشتوں جیسی پاک اور حوروں جیسی خدمت گار۔

''کھانا لاؤں مالک۔''

''لاؤ۔'' اس نے روز والے انداز میں کہا اور جنت کھانا لانے چلی گئی۔ جنت میں ظاہری حسن کوئی نہیں تھا۔ اس کا حسن اس کے کردار و عادات و اطوار میں تھا اور اس کی سب سے زیادہ بات جو عرشی کو پسند تھی وہ اس کا سلجھا ہوا شستہ اور میٹھا لب و لہجہ تھا۔ اگر اس کی گفتگو میں خادماؤں جیسا انکسار نہ ہوتا تو یوں معلوم ہوتا کوئی اونچے گھرانے کی اہل زبان بول رہی ہے۔

''جنت تمہاری زبان بڑی شستہ ہے۔''

''ہاں مالک میری ماں خاص یوپی کی تھی اور باپ پنجابی تھا۔''

''پھر........؟''

''پھر کیا صبح و شام ان کی چخ چخ ہوتی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس چخ چخ بخ بخ کے نتیجے میں' میں آ گئی۔''

''شریر۔'' عرشی ہنس پڑا۔ ''تمہارے آنے کے بعد کیا ہوا؟''

''میرا باپ میری ماں کو طلاق دے کر چلا گیا۔''

''تو گویا تمہاری آمد تمہاری ماں کے لیے منحوس ثابت ہوئی۔''

''ہاں مالک۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں نے کسی منحوس لمحے میں جنم لیا۔ کیونکہ خوشی تو میں نے آج تک دیکھی نہیں۔''

''پگلی! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔''

''مالک۔ آپ مجھے پگلی کیوں کہتے ہیں؟''

''کسی روز بتاؤں گا۔'' عرشی نے بس ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

''کسی روز۔'' اور کسی ایک روز کے تصور سے اس کے خیالوں کی چھت پر چودھویں کا چاند طلوع ہونے لگتا۔

جنت کھانا لے آئی تھی۔ عرشی نے کپڑے بدل لیے تھے اور اب میز کو قریب کھسکا کر وہ کھانا کھانے لگا تھا۔

''بڑے خوش نظر آ رہے ہیں مالک۔''

''بات ہی خوشی کی ہے۔''

''مجھے نہ بتایئے گا؟'' وہ بڑی اپنائیت سے اس کے پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''تو مجھے روز کہا کرتی تھی نا۔ مالکن لے آیئے۔''

''ہاں کہتی تھی۔'' جنت کے چہرے سے وہ خیال جھانکنے لگے۔ جن کی قسمت میں پریشان ہونا لکھا تھا۔

''کیا؟'' وہ حواس باختہ فاختہ کی مانند اور ہراساں ہوئی جا رہی تھی۔

''میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ کمپنی کا مالک میرے کام سے بہت خوش ہے۔''

''ہے تو خوشی کی بات مالک!''

''تو آج اس نے بتایا ہے وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دے گا۔''

''جنت نے ایک طویل سانس لی اور اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر سر کو جھکا لیا۔ عرشی کو اس کا یہ انداز بڑا مضحکہ خیز لگا۔ کچھ دیر تو وہ دو چار لقمے کھاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ جنت نے یہ حرکت کیوں کی ہے...... اسے خوشی ہوئی ہے یا غم؟''

''جنت'' اس نے اسے پاس بلایا۔

''جنت''

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''جنت پانی لاؤ۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''جی۔'' اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ گلاس پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے۔

''کیوں رو رہی ہو؟'' عرشی نے تند لہجے میں کہا۔

''آپ کی شادی ہو جائے گی مالک۔''

''ہاں کبھی کی ہو جاتی ہے۔''

''پھر آپ کسی اور کے ہو جائیں گے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''مالک.......'' مگر وہ بلک پڑی اور باہر چلی گئی۔ عرشی نے اسے نہیں روکا۔ اس وقت اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ باورچی خانے میں جنت نے جلتی آگ پر پانی ڈال دیا۔ ایک بھدی سی آواز کے ساتھ سارے کوئلے بجھ گئے۔ اس نے اپنی دانست میں آگ پر پانی ڈال کے اپنے دل کی تپش سے انتقام لیا۔ پھر اس نے بتی بجھا دی گویا وہ ذہن کے دریچے بھی بند کر دینا چاہتی تھی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونا شروع کر دیا۔

عرشی کو اس کے سسکنے کی آواز اب تک آ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جا کر اسے چپ کرائے لیکن اس نے سگریٹ سلگا لیا اور اس پگلی لڑکی کا تجزیہ کرنے لگا۔

جنت نے جتنا گھر کا آرام اسے دے رکھا تھا۔ اس کی توقع ایک نوکرانی سے بالکل نہیں ہو سکتی۔ علی الصبح بیڈ ٹی اسے مل جاتی۔ اس کے دفتر جانے کے کپڑے بالکل تیار ہوتے' کھانا اسے وقت پر مل جاتا' میلے کپڑے دھل کر فوراً سامنے آ جاتے....... اور راتوں کو جب بھی وہ دیر سے آتا۔ جنت ریڈیو کی سبز روشنی میں اپنا سانولا سلونا چہرہ ڈبوئے کسی نہ کسی دھن میں کھوئی نظر آتی۔

''اری تجھے ریڈیو سننے کا بڑا شوق ہے؟''

''تھا تو نہیں مالک پر اب ہو گیا ہے؟''

''کچھ تیرے پلے پڑتا بھی ہے یا نہیں؟''

''کیوں نہیں۔ صبح کو کلام پاک کی تلاوت اور تفسیر سنتی ہوں' دوپہر کو فلمی گانے سنتی ہوں۔ رات کو اکثر ڈرامے سنتی ہوں۔ بس خبریں اور موٹی موٹی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔''

''گانے تجھے بہت پسند ہیں۔''

''بہت مالک' کبھی کبھی کوئی ایسا گیت بجنے لگتا ہے۔ جس کے بول مجھے اچھی طرح سمجھ نہیں آتے' پر میرا دل چاہتا ہے یہ گیت یونہی بجتا

رہے۔ یہ گیت میری روح میں سما جائے' اس طرح کہ مجھے اپنی بھی سدھ نہ رہے۔"

''اچھا'' عرشی نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''تجھ پر خطرناک حد تک موسیقی کا اثر ہو رہا ہے۔''

''بری بات ہے مالک۔''

''نہیں کچھ ایسی بری بات بھی نہیں۔ مگر ہر وقت گیت سننا اچھا نہیں۔''

''میں تو فارغ ہو کر سنتی ہوں۔''

''پھر تو تو خود بھی گانا جانتی ہو گی۔''

''تھوڑا' تھوڑا۔'' جنت انکسار کے انداز میں ہنس پڑی۔

''سناؤ مجھے بھی۔''

''اوئی مالک آپ کو؟''

''تو کیا ہوا۔''

''آپ ہنسی اڑائیں گے۔''

''قسم کھاتا ہوں۔ نہیں اڑاؤں گا۔''

''مالک۔ مجھے وہ ملکہ پکھراج کی گائی ہوئی غزل بڑی اچھی لگتی ہے۔''

''کون سی؟''

''وہی۔''

وہ باتیں تیری وہ فسانے تیرے
شگفتہ شگفتہ بہانے تیرے

''ہوں؟'' عرشی نے سگریٹ کا ایک طویل کش چھوڑ کر اسے گھورا۔

''تجھے اس شعر کا مطلب بھی آتا ہے یا یونہی؟''

''کیوں نہیں مالک!'' وہ تیزی سے بول پڑی۔ ''اپنے مطلب کی چیزیں ہی تو اتنی جلدی یاد ہوتی ہیں۔'' ایک معنی خیز گلابی رنگ اس کی سانولی رنگت پر بکھر گیا اور وہ عرشی کی آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی۔

''پگلی'' عرشی نے دل میں دہرایا۔ ''اب سنا بھی'' مگر وہ اس ایک شعر سے آگے سنا نہ سکی۔

بس اک داغ سجدہ میری کائنات
جبینیں تیری آستانے تیرے

بار بار اس شعر کو دہرا کر وہ چپ ہو گئی۔

''آگے سناؤ۔''

''بس اتنا ہی آتا ہے۔''

پھر عرشی نے اکثر اس کو یہی شعر گنگناتے ہوئے سنا۔

''جنت تجھے یہ شعر بہت پسند ہے۔''

''بہت مالک۔''

''اس کا مطلب ہے تیری پسند بڑی اونچی ہے۔''

''ٹھیک کہا مالک آپ نے میری پسند اتنی اونچی ہے۔ اتنی اونچی ہے۔'' وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کہ میں بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی۔''

اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی اور چہرے پر رحم طلب سوز بکھر گیا۔

''پھر بھی کتنی اونچی ہے؟''

''آپ کہاں سمجھ پائیں گے مالک۔''

''تو مجھے مالک کیوں کہتی ہے''

''میں آپ کی ملازم جو ہوئی۔''

''تو کچھ اور کہہ لیا کرو۔''

''مجھے کوئی اور نام نہیں بھاتا۔ بس مالک ہی اپنا مفہوم صحیح ادا کرتا ہے۔''

''کیسے؟''

''آپ ہی تو میرے مالک ہیں۔'' اور وہ باہر چلی گئی۔

عرشی اپنے گھر بہت کم رہتا تھا۔ کام ہی اس کا ایسا تھا کہ کسی دفتر سے بلاوا آسکتا تھا اور جتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہتا کام ہی کرتا رہتا۔ ایسے میں واپس آ کر اسے جنت کی بھولی بھالی باتیں سننے کو ملتیں تو اس کا دل بہل جاتا۔ ساری تکان دور ہو جاتی۔

ایک روز جب جنت اس کے تھکے ہوئے پیروں میں سے جوتے نکال کر رکھ رہی تھی تو وہ احسان مندی کے بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا۔

''جنت تجھے معلوم ہے تو کون ہے؟''

''نہیں مالک''

Paradise on Earth (پیراڈائز آن ارتھ)

''وہ کیا ہوتا ہے مالک؟''

''دنیا میں جنت ہوتی ہے۔''

''دنیا میں تو کئی جنتیں ہوں گی؟''

''ہر جنت صحیح معنوں میں جنت نہیں ہوتی۔''

''تو کیا ہوتی ہے؟''

''تمہارا سر...... '' وہ جھلا گیا۔

''خفا ہو گئے مالک؟''

''نہیں بڑا خوش ہوں۔''

معاف کر دیجئے۔ آپ جب کھردرے لفظ بولتے ہیں تو مجھے سمجھ نہیں آتے۔ وہ انگریزی کو ہمیشہ کھردری زبان کہتی تھی۔

''تو کبھی کبھی میرا دماغ چاٹ لیتی ہے۔''

''اب نہیں چاٹوں گی مالک۔''

عرشی کو ہنسی آ گئی۔

''اچھا جب میں تجھے پیراڈائز آن ارتھ کہہ کر پکاروں تو بھاگ کر آ جایا کر۔''

''بہت اچھا مالک۔''

''پھر کئی دن تک عرشی کا یہی شغل رہا۔ وہ دفتر سے آتے ہی ہانک لگاتا ''پیراڈائز آن ارتھ۔''

''جی مالک!'' جنت بھاگی آتی۔

''اس وقت اسے جنت کی سادہ لوحی اور انجان پن سے ایک خاص سرور حاصل ہوتا۔ اللہ نے اسے دل کے بہلانے کے لیے کیسا انوکھا کھلونا دیا تھا۔

ایک روز جنت باہر آنگن میں بیٹھی بال سکھا رہی تھی اور عرشی اندر شیو بنا رہا تھا۔ ایک فقیرنی نے صدا بلند کی۔

''مالک کی خیر ہو، مالکن کی خیر ہو۔ اللہ کے نام پر۔''

جنت نے چونک کر فقیرنی کی طرف دیکھا پھر ایک شوخ رنگ اس کے چہرے پر بکھر گیا۔ اس نے تھوڑا سا آٹا ایک پلیٹ میں ڈالا اور فقیرنی کو دینے چلی گئی۔

''اری تجھے میں مالکن نظر آتی ہوں؟''

''ہاں بی بی!''

''دیوانی' میں تو اس گھر کی ملازمہ ہوں۔''

''ملازم بھی مالک ہوتے ہیں بی بی۔''

''ملازم بھی مالک ہونے لگیں تو دنیا کا کام کیسے چلے۔'' جنت زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ فقیرنی کچھ نہ سمجھ کر باہر چلی گئی۔ جنت نے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے عرشی کی طرف دیکھا جو اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

''مالک آپ اب شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' جنت اپنے مخصوص انداز میں اس کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔

''کیوں؟''

''لوگ مجھے مالکن سمجھ بیٹھتے ہیں اور میں انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔''

''اچھا تو اب میں تیری مالکن کو ڈھونڈ ہی لاؤں گا۔'' عرشی نے اس کے چہرے پر تمسخرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''کب مالک؟''

''بہت جلد''

''کیسی ہوگی وہ؟'' اس نے بے چینی سے کہا۔

''بس تیرے جیسی۔''

''میرے جیسی۔ میں تو اتنی بدصورت ہوں۔'' اداس ہو گئی۔

''مگر مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے۔'' عرشی نے اس کا دل رکھنا چاہا۔

''سچ مالک؟'' خوشی نے اس کی آنکھوں کو گیلا کر دیا۔

''پگلی۔ آدمی صرف شکل وصورت کے ہی دیوانے نہیں ہوتے۔ ایک عورت کے لیے اس کا کردار اس کی عادتیں اور خدمت گزاری ہی سب سے بڑی صفات ہیں اور تجھ میں یہ صفات اس حد تک موجود ہیں کہ میں تجھے ''پیراڈائز آن ارتھ'' کہہ کر پکارتا ہوں۔ یعنی تیرے ساتھ رہ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک آدمی جنت میں رہ رہا ہے۔''

''مالک........'' جنت خوشی سے دیوانی ہو چلی۔ ''مجھے بھی آپ اتنے اچھے لگتے ہیں کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے۔ آپ کی نیکی اور سلوک کے آگے میں اپنا سر ٹیک دوں۔ یوں میں خیالوں میں ہر دم آپ کو سجدے کرتی رہتی ہوں۔''

''اری سجدہ تو صرف خدا کو کیا جاتا ہے۔ کسی خاکی کو سجدہ کرنا شرک ہے۔'' عرشی کو اگرچہ اس کا بھولپن بہت پسند آیا۔ مگر اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دینی چاہی۔

''اللہ نے ہی تو کہا ہے' اگر میرے بعد کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو میں کہتا بیوی اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔''

جب تک وہ کچھ کہتا۔ جنت باہر جا چکی تھی۔ کتنی دیر تک وہ برس ہاتھ میں پکڑے گم صم بیٹھا رہا کبھی کبھی جنت بڑے پتے کی بات کہہ جاتی تھی۔ پندرہ سال کی یہ چھوکری جسے وہ محض ایک خادمہ تصور کرتا تھا۔ بعض اوقات اسے الجھا کر رکھ دیتی تھی۔

''اری تجھے ان سب باتوں کا کیسے پتا چلا؟'' شیو کرنے کے بعد عرشی باہر آ گیا اور باورچی خانے میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''اماں جی اور بوا ایسی ہی باتیں تو میرے ساتھ کیا کرتی تھیں۔''

''ویسے تو نے کبھی نماز تو پڑھی نہیں۔ اللہ کو سجدہ کیا نہیں' بندوں کو کرتی پھرتی ہے۔''

''مالک آپ نے یہ شعر نہیں سنا کیا؟''

یہ بتوں کی محبت بھی کیا چیز ہے
دل لگی دل لگی میں خدا مل گیا

''انسانوں کی محبت ہی خدا تک پہنچنے کی سیڑھی ہے۔''

عرشی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ اس بات کے جواب میں کیا کہے۔ لیکن اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

''میرا خیال ہے تو ریڈیو پہ کسی مولانا کا وعظ سنتی رہی ہے۔''

''ایسا تو نہیں ہے مالک!'' جنت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ایسی ہنسی جس میں فہم وادراک کی تمام تر کھنکناہٹ تھی۔ جیسے وہ اس کی کم علمی پر چوٹ کر رہی ہو۔

اور پھر آج جب عرشی نے جنت کو اپنی شادی کا مژدہ دیا تھا تو وہ کیوں اتنی مضطرب اور بے کل ہوگئی تھی۔ کیا اس نے اپنے طور پر کوئی اور لڑکی پسند کر رکھی تھی؟ بجھے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال کر عرشی باورچی خانے میں چلا گیا۔ جنت کی چارپائی وہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ اس وقت اپنے بستر میں بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔

''جنت'' وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''تیری طبیعت تو اچھی ہے نا؟''

''ہاں مالک!'' اس کی آواز ابھی تک بوجھل تھی۔

''تو اس وقت قرآن کیوں پڑھ رہی ہے؟''

''جب میں بہت پریشان ہوتی ہوں اور مجھے کچھ نہیں سوجھتا تو میں قرآن پاک پڑھنے لگتی ہوں۔''

''پھر تیری پریشانی دور ہو جاتی ہے۔''

''ہاں اور مجھے کوئی راہ بھی سوجھ جاتی ہے۔''

''اچھا۔ اگر تیری طبیعت زیادہ خراب ہونے لگے تو مجھے اطلاع دے دینا۔'' عرشی کمرے سے باہر آ گیا۔

علی الصبح جنت بیڈ ٹی لیے اس کے کمرے میں آن موجود ہوئی۔

''اری تو اب ٹھیک ہے؟''

''ہاں مالک۔'' جنت مسکرائی۔

''تیری پریشانی دور ہوگئی؟''

''ہاں اور مجھے ایک بات بھی سوجھ گئی۔''

''کیا؟''

''کیوں بتاؤں۔''

''اچھا یہ بتا رات کو روئی کیوں تھی؟''

''آپ کی شادی ہو جائے گی؟''

''ہاں۔''

''یہ تو خوشی کی بات لیکن اگر مالکن ویسی نہ ہوئی جیسی آپ چاہتے ہیں تو کیا ہوگا؟''

''نہیں' مجھے یقین ہے مالکن بڑی اچھی ہوگی۔ میں نے اسے دیکھا بھی ہے۔'' وہ اتنی سندر ہے' اتنی سندر جیسے کوہ قاف کی پری۔''

''پر مالک! آپ تو ظاہری حسن کے قائل نہیں۔ اگر اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں نہ ہوئیں تو.......؟''

''کیوں نہ ہوں گی۔ اونچے گھرانے کی شریف لڑکیاں صورت کے ساتھ اچھی سیرت کی بھی مالک ہوتی ہیں اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی تو میں اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لوں گا۔

''پھر آپ میرے مالک بھی تو نہیں رہیں گے۔''

''کیسے؟''

''آپ مالکن کے ہو جائیں گے۔''

''پھر تمہاری مالکن بھی تو آجائے گی۔''

''اور اس کے ہوتے ہوئے آپ مجھ پر توجہ نہ دیں گے۔ مجھ سے گیت نہ سنیں گے۔ میری باتوں پر دل کھول کر ہنسا بھی نہ کریں گے۔''

''پگلی' دیوانی! مالکن کے آجانے سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آئے گی۔ پھر نوکر مالک تو نہیں بن سکتے۔ تو اس گھر کی ملازم ہے۔ تجھے اب مجھ سے زیادہ مالکن کی خدمت کرنی ہوگی۔''

''کروں گی مالک۔'' جنت پر منوں برف گر پڑی۔

اور پھر اس گھر میں مالکن آگئی۔ پریوں ایسی سندر' چاند ایسی روشن اور خواب ایسی حسین۔ جنت تو اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ ایسی خوبصورت عورت کو مالک کیونکر ہتھیا لایا ہے....... پھر پورا ہفتہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں گزر گیا۔ جب گھر میں ذرا سکون ہوا تو جنت کو صحیح معنوں میں اپنی مالکن کو جانچنے اور خدمت کرنے کا موقع ملا۔

مالکن جتنی حسین تھی' مالک اتنی اس کی ناز برداریاں کرتا۔ جنت یہ لاؤ' جنت وہ لاؤ' یوں کرو' ووں کرو اس کی آواز میں تحکمانہ کرختگی ہوتی اور جنت مشین کے پرزے کی مانند سارا دن احکامات بجا لاتی۔

مالکن کو اللہ نے حسن کے ساتھ ساتھ ناز نخرے بھی بخشے تھے۔ بس وہ سارا دن مالک اور جنت کو تگنی کا ناچ نچائے رکھتی۔

ایک بات سے البتہ جنت مطمئن تھی کہ مالک اور مالکن بہت بہت خوش تھے۔ دونوں ایک جان دو قالب نظر آتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم تھے۔ دنیا سے بالکل بے خبر ہو گئے تھے مالکن اپنا ہر کام جنت سے کرواتی۔ ایک اور نوکرانی بھی آ گئی تھی۔ مگر مالکن جتنا جنت پر بھروسہ کرتی' دوسری پر نہ کرتی اور وہ بھی مالکن کی خدمت کرنے میں انتہائی سرور محسوس کرنے لگی تھی۔

''سیما! تمہیں جنت پسند آئی.......؟'' ایک روز جب جنت ان کے آگے کھانا چن رہی تھی۔ عرشی نے اپنی بیوی سے کہا۔

''جنت بڑی اچھی لڑکی ہے۔'' سیما نے انداز دلربائی سے کہا۔ ''اس نے مجھے گھر کا سارا آرام دیا ہے۔ اسے تو میں کبھی جانے نہ دوں گی۔''

جنت کے دل سے گلے شکوے آپ ہی آپ دور ہو گئے۔ اس روز اسے مالکن پر اتنا پیار آیا کہ اس نے سوچا ایسی مالکن کے وہ ہمیشہ پاؤں دھودھو کر پیا کرے گی۔

بس صبح جب بیڈ ٹی دینے جاتی تو اسے بڑی شرم آتی۔ مالک تو اسے ابھی تک بچہ ہی سمجھتے تھے۔ وہ اپنی نظریں جھکائے۔ ٹرے ہاتھ میں پکڑے بت کی طرح کھڑی رہتی اور مالک اتنے پیار سے مالکن کو جگاتے کہ جنت کا دل مارے شرم کے چاہتا کھڑی کھڑی زمین میں گڑ جائے پھر رفتہ رفتہ وہ بھی ڈھیٹ بن گئی تھی۔

ایک دن جب مالکن اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ مالک گھر میں اکیلے تھے اور جنت اپنے کام کرتی پھر رہی تھی۔

''اری جنت بات سن۔''

''جی مالک!'' وہ دوڑی آئی۔

''کیا حال ہے تیرا؟''

''اچھی ہوں مالک!'' اس کے چہرے پر سوگواریاں بکھر گئیں۔

''میں سوچ رہا ہوں۔ اب تیری شادی کر دوں۔''

''کیوں مالک مجھ سے کون سا قصور سرزد ہوا ہے؟''

عرشی زور سے ہنس پڑا۔ ''پگلی کوئی قصور ہو تو شادی ہوتی ہے۔ شادی ہونا تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔''

''آپ سے دور رہنا تو بدقسمتی کی بات ہے نا۔''

''تجھے دور کون کر رہا ہے۔ دفتر میں میرا اردلی ہے بڑا ہی نیک اور شریف' وہ مجھ سے روز کہتا ہے۔ میں کسی شریف لڑکی سے اس کی شادی کرا دوں۔ اگر اس سے تیری شادی ہو گئی تو تو یہیں میرے پاس رہے گی۔''

''نہیں مالک میرے ساتھ ایسا ظلم نہ کیجئے۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''کیا تجھے اردلی پسند نہیں؟''

''ایک ملازمہ کے لیے اردلی سے بہتر اور کون سا رشتہ ہو سکتا ہے۔'' اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر کہا۔

''پھر تو انکار کیوں کر رہی ہے؟''

''مالک' بیک وقت انسان دو آدمیوں کا غلام نہیں رہ سکتا۔''

''تو نوکری چھوڑ بھی سکتی ہے۔''

''مجھے اس غلامی میں زیادہ آرام ہے' اس کے مقابلے میں کسی غلامی کو ترجیح نہ دوں گی اور جب میں اپنے شوہر کو زیادہ سے زیادہ توجہ نہ دے سکی تو خواہ مخواہ خدا کی گنہگار رہوں گی۔''

''تیری مرضی نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں نے اس لیے کہہ دیا تھا' کہیں تو یہ نہ سمجھ لے کہ میں کتنا خود غرض ہوں اپنے آرام کے لیے تیری زندگی خراب کر رہا ہوں۔''

''نہیں مالک' آپ تو سجدے کے قابل ہیں۔''

''ہاں ایک دن تو نے کہا تھا۔ تیری پسند بہت اونچی ہے۔ بتا کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھی؟''

''نہیں مالک۔'' جنت نے افسردگی سے گردن ڈال دی ''ملازموں کو کیا حق پہنچتا ہے دل لگانے کا۔ وہ تو بس میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اب اگر کوئی کہہ دے کہ میرا محبوب تو آسمانوں کے اوپر بیٹھا ہے۔ تو سوائے دیوانگی کے لوگ کیا سمجھیں گے۔''

''سچ مچ تو پگلی ہے۔''

''ہاں مالک۔ اب تو مجھے سمجھ آ رہی ہے کہ آپ مجھے پگلی کیوں کہتے ہیں۔ مالکن کب آئیں گے؟''

''جنت کیا تو بھی اس کے بنا بے کل ہو جاتی ہے؟''

''مالکن ہے ہی ایسی۔''

''جنت جب سیما میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو مجھے ساری دنیا تاریک معلوم ہونے لگتی ہے اور میں اس طرح مضطرب و بے چین ہوا تھتا ہوں۔ جس طرح میرے جسم کا کوئی حصہ مجھ سے الگ کر دیا گیا ہو۔''

''اللہ آپ دونوں کو ہمیشہ سلامت رکھے مالک میں تو ہر دم یہی دعا کرتی ہوں۔''

''تو بڑی اچھی ہے جنت' پیراڈائز آن ارتھ۔''

جنت صرف سوگوار انداز میں ہنس پڑی۔

پھر دن گزرتے رہے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی محبت میں سرشار وقت سے بے نیاز محبت کی گہرائیوں میں ڈوبتے رہے اور پھر وہ دن قریب آنے لگے۔ جب اس گھر میں ایک نیا چاند طلوع ہونا تھا۔ نیا غنچہ کھلنا تھا۔ مالک تو خوشی سے دیوانے ہوئے پھرتے۔ اب مالکن کہاں چارپائی سے نیچے اترتیں ہر شے انہیں پلنگ پر مل جاتی۔ ہر روز ڈاکٹر دیکھنے آتیں۔ اس روز مالکن دھیرے دھیرے قدم رکھتی غسل خانے میں نہانے گئیں۔ پاؤں پھسل گیا۔ حالت بگڑ گئی کئی موٹریں آ گئیں۔ مالکن ہسپتال چلی گئیں۔ سارا دن جنت رو رو کر ان کے اچھے ہونے کی دعائیں مانگتی رہی۔ شام کو خبر آ گئی۔

''ایک منا سا چاند آیا ہے۔''

''مبارک ہو مالک۔'' جنت گھر میں دیئے جلانے لگی۔ ''مالکن کیسی ہیں اب؟''

''اب تو کچھ بہتر ہیں۔ تم دعا کرنا جنت۔''

جنت بھی ہسپتال جاتی رہی۔ مالکن رفتہ رفتہ اچھی ہو گئیں۔ مگر زردی اور کمزوری نے ان کے حسن کو گہنا دیا۔ جنت کو بڑا افسوس ہوا۔ اچھا جان بچ جائے۔ رنگ و روپ کا کیا ہے۔ پھر ویسی ہو جائیں گی۔ کچھ عرصے بعد مالکن گھر آ گئیں۔ گھر میں خوشیاں منائی گئیں۔ مگر دو ہی مہینے بعد انہیں پھر کوئی تکلیف اٹھی۔ دوبارہ ہسپتال لے جایا گیا۔ اس مرتبہ جو آپریشن ہوا اس میں خون بہت چلا گیا اور مالکن کو بھی لے گیا۔

ننھا عرفی گھر میں بلکتا رہ گیا اور مالک کی دنیا اندھیرا ہو گئی۔

''جنت....... جنت۔ میں لٹ گیا....... برباد ہو گیا۔''

''مالک صبر کیجئے۔''

''صبر آئے بھی۔ صبر کہاں سے لاؤں؟''

''رفتہ رفتہ آ جائے گا صبر۔''

''جنت وہ تو کہتی تھی آخری سانس تک تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ پھر اس نے اس ننھی سی جان کا خیال نہ کیا۔''

''یہاں کچھ اپنے بس میں نہیں ہوتا مالک۔'' جنت رونے لگی۔

''مجھے سہارا دو جنت۔ میرے معصوم بچے کو سہارا دو میں غم سے مر جاؤں گا۔''

جنت نے سوتے ہوئے عرفی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

''مالک آپ اس کی فکر نہ کریں۔ اس کی میں اس طرح حفاظت کروں گی جس طرح ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔''

''جنت میں تیرا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔''

''احسان کیسا مالک؟ یہ تو میری عین خوش قسمتی ہے۔'' جنت اپنے آنسو نہ سنبھال سکی اور باہر چلی آئی۔

پھر دن گزرتے رہے۔ عرفی جنت کی مدھ بھری گود سے مانوس ہوتا گیا۔ مگر عرشی کو غم اس دلدل میں لے گیا جہاں ہر قدم پر کیچڑ اڑتا ہے اور قدم آلودگیوں کی طرف لے جاتا ہے اس نے چوٹ کو سہا بھی تو بزدلوں کی مانند۔

کبھی کبھی وہ رات رات بھر غائب رہتا اور جو آتا بھی تو ایسی حالت میں کہ جنت کی روح لرز لرز جاتی۔ وہی گھر جسے وہ امن و سکون کا گہوارہ کہتی تھی اسے آگ کے شعلوں میں تپتا ہوا محسوس ہوتا۔

''مالک آپ نے پی ہے؟'' آدھی رات کو جب وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا تو جنت نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں میں نے پی ہے اور اب ہر روز پیتا ہوں۔ نہ پیئوں تو کیا کروں؟''

''یہ بری بات ہے مالک۔'' جنت زرد ہو گئی۔

''سبھی کہتے ہیں یہ بری بات ہے۔ پھر اچھی کون سی بات ہے؟''

''آپ کہیں شادی کر لیں مالک۔''

''شادی...... ہاہاہا شادی کر لوں تاکہ بیوی آئے اور بچے کو جنم دے کر خود مر جائے۔''

''نہیں نہیں مالک۔'' جنت لرز گئی ''ایسا نہ سوچئے۔''

''اور کیا سوچوں؟'' عرشی خونخوار ہونے لگا۔

''اللہ اتنا قہار نہیں ہے وہ رحم دل بھی ہے۔''

''تو مجھے سہارا دے گی جنت۔''

''میں تو ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں۔''

''کیا تو میرے ساتھ شادی کرے گی؟''

جنت رونے لگی۔ عرشی لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر آیا اور اس کا بازو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "بول تو میرے ساتھ شادی کرے گی؟"

"مالک مجھے گنہگار نہ کیجئے۔"

"کیوں کیا تیری پسند مجھ سے بھی اونچی ہے؟"

"نہیں مالک! میں ہی آپ کے قابل نہیں ہوں۔"

یہ تو صرف میں جانتا ہوں کہ تو میرے قابل ہے یا نہیں۔" وہ اسے چھوڑ کر پھر پلنگ پر چلا گیا۔

"لیکن مجھے اس وقت سہارا چاہیے۔ ایک ہلکا پھلکا سہارا مجھے ہاں اور نہ میں جواب چاہیے۔"

"میں آپ کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی مالک۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں نوکرانی ہوں۔"

"کیا نوکرانیاں بیوی نہیں بن سکتی؟"

"نہیں مالک' نوکرانیاں کبھی بیویاں نہیں بن سکتیں۔ وہ ہمیشہ نوکرانیاں ہی رہتی ہیں۔ آپ کہیں اور شادی کر لیں آپ کو اچھی سے اچھی......."

"مجھے مشورے کی ضرورت نہیں۔" عرشی چیخ اٹھا۔ "میں صرف اس بچے کی خاطر تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ کسی بھی دوسری عورت کو ماں نہ سمجھ سکے گا۔"

"آپ اس بچے کو میرے پاس رہنے دیجئے۔ اس کی خاطر اپنی زندگی قربان نہ کیجئے اور خود کسی اور سے شادی کر لیجئے۔"

"تاکہ تو کسی چپراسی سے شادی کر کے میرے بیٹے کو اس کی اولاد بنا دے۔"

"نہیں مالک!" جنت آبدیدہ ہو گئی۔ "اس بچے کی خاطر میں عمر بھر کنواری رہ لوں گی۔"

"اس بچے کی خاطر تو شادی نہیں کر سکتی۔ کنواری رہ سکتی ہے۔ چل جا میری نظروں سے دور ہو جا۔"

"مالک!" جنت گڑگڑا کر عرشی کے قدموں میں گر گئی....... اور بلک کر بولی۔ "آپ سمجھتے کیوں نہیں مالک! دیوتا کو میں اپنا شوہر بنا لوں۔ مسجود سے میں دنیاوی تعلق قائم کر لوں؟ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا' مالک میری پوجا کے پھولوں کو یوں ہی مقدس اور پوتر رہنے دیجئے مجھے پرستش کرنے کے لیے یونہی نادار چھوڑ دیں۔ اگر میں پوجا کے قابل بھی نہ رہی تو کیسے جی سکوں گی؟"

''میں ایک لفظ بھی مزید سننا نہیں چاہتا۔'' عرشی نے اٹھ کر پھر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''کیا تو مجھے سہارا نہیں دے سکتی؟ کیا میرے ساتھ شادی نہیں کر سکتی؟''

جنت روتی رہی اس کے آنسو عرشی کے پاؤں بھگوتے رہے۔

''کیا تو وقتی طور پر میری بیوی نہیں بن سکتی؟''

''نہیں مالک'' جنت اپنا آپ چھڑا کر دور جا کھڑی ہوئی ''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''تو کل سے مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔ جس دن سے تو اس گھر میں آئی ہے اس گھر کی خوشیاں ختم ہو گئی ہیں۔ تو نے کسی منحوس گھڑی میں جنم لیا تھا۔ دفع ہو جا۔ میرے گھر سے نکل جا۔''

جنت! عرفی کو بازوؤں میں اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی۔ عرشی نشے کی حالت میں بول رہا تھا۔ صبح کو اس کا دماغ درست ہو گا اور وہ اپنی باتوں پر شرمسار ہو گا۔

صبح جب وہ بیڈ ٹی لے کر گئی تو وہ جاگ رہا تھا۔

''مالک چائے۔'' وہ ڈرتے ڈرتے قریب گئی۔

''میں اب نشے میں نہیں ہوں۔'' عرشی نے سخت لہجے میں کہا ''لیکن میں رات کی باتیں بھولا نہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا تھا بہ ہوش و حواس کہہ رہا تھا۔'' جنت خاموش کھڑی رہی۔ ''کیا اب بھی تمہارا وہی جواب ہے؟''

جنت تھرا گئی۔ ''مالک! مجھے فرش پر رہنے دیجئے۔ عرش تک میری اڑان نہیں۔''

''اچھا'' عرشی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ایک شرط پر تم یہاں رہ سکتی ہو۔ جب تک میں بیوی نہ لے آؤں تمہیں عارضی طور پر میری بیوی بن کر یہاں رہنا ہو گا۔''

''میں آپ کی خادمہ ہوں' مالک۔''

''مجھے صرف بیوی چاہیے۔ سنا! ورنہ تم جا سکتی ہو۔''

جنت روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ ہر قدم جو اس کا اٹھتا' اسے ننھے عرفی کی طرف کھینچتا تھا۔ معصوم سا۔ فرشتوں ایسا۔ خبر نہیں کوئی نئی اماں اسے اتنا پیار دے گی یا نہیں۔ خبر نہیں دنیا میں آنکھ کھول کر یہ اتنی خوشیاں پا سکے گا یا نہیں۔ اس معصوم کو کسی بے درد عورت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جانا کتنا ظلم ہے۔

اور تو پگلی۔ تو خود اس کی ماں کیوں نہیں بن سکتی۔ نہیں۔ میں اس کی انا ہو سکتی ہوں' دایا ہو سکتی ہوں۔ خادمہ ہو سکتی ہوں' ماں نہیں ہو سکتی۔ ماں بننے کے لیے مجھے جس چیز کی قربانی دینی پڑے گی' اس سے میری روح کی موت واقع ہو جائے گی۔ تقدس اور عظمت کے سارے بت چور چور ہو جائیں گے۔

اس رات عرشی کچھ زیادہ ہی پی آیا تھا۔

''جنت' آؤ میرے قریب آؤ۔'' اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے'' آج میں اس دنیا کی جنت کو ابدی کرنا چاہتا ہوں۔''

اور جنت ڈر کر رسوئی میں جا چھپی۔ عرشی نے سوئے ہوئے منے کو بازو سے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا اور خود عرشی جنت کو آوازیں دینے لگا۔ عرفی کے رونے کی آواز سن کر جنت کہاں رہ سکتی تھی وہ اندر سے بھاگی ہوئی آئی اور منے کو سینے سے لگا لیا۔

''منا شور مچاتا ہے تو تم ترس کھا کر اسے سینے سے لگا لیتی ہو۔ میں شور نہیں مچاتا؟ اگرچہ میں منے سے زیادہ دکھی ہوں۔ تم مجھے سینے سے کیوں نہیں لگاتیں؟''

''مالک! ہوش کی باتیں کرو۔''

''جنت۔'' عرشی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ غرایا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ جنت نے باورچی خانے میں جا کر اندر سے کنڈی لگا لی۔

''جنت باہر آؤ۔'' وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

''میں باہر نہیں آؤں گی مالک۔'' جنت زار و قطار رو رہی تھی۔ اور ننھا عرفی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم میری ملازم ہو جنت۔ تم نے میرا نمک کھایا ہے۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے۔''

''میں اپنی زندگی دے سکتی ہوں مالک' مگر میری جوانی کسی بھٹکے ہوئے شخص پر قربان نہیں ہو سکتی۔'' وہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑی۔

عرفی اب بھی انگوٹھا چوس رہا تھا اور اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

''ننھے تو نہیں جانتا۔ تو بالکل نہیں جانتا۔ میں کتنی مجبور ہوں' میں تجھے ماں سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں۔ مگر تیری ماں نہیں بن سکتی' پگلے اگر میں سچ مچ تیری ماں بن گئی تو میں اپنے بچوں کو تجھ پر ترجیح دوں گی اور تیرا باپ جب نشے کے عالم سے باہر نکلے گا تو مجھ سے نفرت کرے گا اور ہمیشہ مجھے طعنہ دے گا کہ میں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔''

''ننھے آ۔ میں تجھے اپنے بازوؤں میں چھپا کر کہیں دور لے جاؤں۔ جہاں نہ کوئی تیرا باپ ہو' نہ تیری ماں۔ میں ہوں اور بس تو...... میں تیری پرورش کے لیے آکاش سے موتی توڑ لاؤں اور تجھے ایک روز ویسا ہی سندر دیوتا بنا ڈالوں۔ جس پر میری روح صبح و

شام پھول چڑھاتی ہے جس کے آگے میرا دل دوزانو ہے اور جسے میں نے سجدے کے قابل سمجھا تھا۔" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

علی الصبح عرشی غصے سے پاؤں پٹختا ہوا باورچی خانے میں بیڈٹی لینے آیا۔ وہاں نہ جنت تھی نہ عرفی اور نہ بستر۔ باقی ہر شے ایک اداس کہانی کہہ رہی تھی۔

اندھا، بہرہ، گونگا

اس بات کی ابتدا تو اسی روز ہو گئی تھی؛ جس روز دونوں باراتیں ایک ساتھ گھر کی دلیز پر آ کر رکی تھیں۔ دونوں دلہنوں کو لا کر بڑے ہال میں بٹھا دیا گیا تھا۔ سرخ لباس میں ملبوس جھکی جھکی گردنوں والی دو دلہنیں عورتوں کے ہجوم میں بیٹھی تھیں۔ عورتیں جھک جھک ان کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ اور سلامی کی رقم ایک معمر سی عورت کے ہاتھوں میں تھما رہی تھیں۔ جو ایک کاغذ پر سب کے نام لکھتی جا رہی تھی۔

لیکن ہر شخص دل میں جانتا تھا کہ ان عورتوں کی آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں۔ سب ہی غالباً اس بات پر متفق تھیں کہ فیاض میاں کی دلہن ریاض میاں کی دلہن سے کہیں خوبصورت ہے۔

فیاض میاں کی دلہن!

ریاض میاں کی دلہن!

اندر باہر۔ اگر کسی کی زبان اس کا ساتھ دیتی تھی تو اس کی آنکھیں یہ بات صاف کہے دیتی تھیں اور ہوتے ہوتے یہ بات کسی طرح ریاض میاں کے کان میں بھی پڑ گئی۔

ریاض میاں کی تعلیم اگرچہ فیاض میاں جتنی ہی تھی۔ مگر عقل اور تجربہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔ روزمرہ کی گفتگو میں وہ ہمیشہ فیاض میاں کو بے وقوف کا خطاب دیتے تھے۔ اس لیے کہ فیاض میاں کچھ بڑے ہونے کی وجہ سے اور کچھ فطری سادہ لوحی کے باعث حد درجہ کند ذہن اور بے وقوف دکھائی دیتے تھے۔ ان کے منہ سے کبھی کسی نے اونچا لفظ نہیں سنا تھا وہ ہمیشہ نظریں جھکا کر یوں چلا کرتے گویا دنیا ساری عریاں ہے اگر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھ لیا تو خواہ مخواہ گنہگار ہو جائیں گے۔ انہوں نے تو کبھی اپنی بہنوں کے چہرے بھی غور سے نہیں دیکھے تھے۔ جبھی سب لوگ دبی زبان میں انہیں مولوی صاحب کہا کرتے تھے۔ ان کا حلیہ بھی کچھ ایسا تھا۔ ہر وقت بھاری بھر کم لٹھے کی شلوار اور کرتہ پہنے رہتے۔ سر پر اسد جناح کیپ سنوری رہتی۔ البتہ ان کے داڑھی نہ تھی۔ نہ معلوم وہ کس طرح منڈوا لیتے تھے۔ ورنہ ان کے مولوی ہونے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ کیونکہ نمازیں بھی وہ پانچوں وقت کی پابندی سے پڑھتے تھے۔

اور ریاض میاں جہاں کہیں انہیں سر پر رومال باندھے مسجد سے آتا دیکھ لیتے تو سارا سارا دن انہیں تنگ کرتے گزر جاتا۔

''تمہارے گھر تو ملانی ہی آئے گی جو سارا دن محلے کے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی رہا کرے گی۔''

اور آج جب یہ خبر اڑتے اڑتے ان کے کانوں میں جا پہنچی کہ فیاض میاں کی دلہن ان کی دلہن سے نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ تعلیم یافتہ بھی ہے' تو ان کے اعصاب پر ایک عجیب سی بے چینی طاری ہو گئی۔ وہ اپنی دلہن دیکھنے کو اتنے بے قرار نہ تھے' جتنے وہ فیاض میاں کی دلہن دیکھنے کو بے قرار تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ فیاض میاں خوب صورتی اور بدصورتی کی ہر حد سے بے نیاز ہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ جذبات رکھتے ہوئے بھی کورے ہیں۔ ان کے ہاں دلہن صرف ان کا گھر بسانے کے لیے لائی گئی ہے۔ ورنہ وہ تو شادی کے بغیر بھی ساری زندگی گزار سکتے ہیں۔

رات کو جب سب مہمان رخصت ہو گئے۔ گھر کے افراد نے دونوں دلہنوں کو اندر بلایا۔ ہال کمرے میں دونوں دلہنوں اور دلہاؤں کے لیے کھانا رکھ دیا گیا تھا۔ ریاض میاں کو جب ان کی دلہن کے سامنے بٹھایا گیا تو ان کی نظر اچانک سامنے دوسرے تخت پر بیٹھی ہوئی دلہن پر پڑ گئی۔ گورا چاند ایسا رنگ' کشادہ پیشانی جس پر جگمگ کرتا ہوا جھومر چمک رہا تھا۔ کمان کی طرح ابرو۔ ان سے نیچے سیاہ جھکی جھکی پلکیں۔ جنہوں نے دنبالہ دار آنکھوں کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ستواں ناک' خوب صورت ہونٹ۔ وہ تو کچھ حیران رہ گئے' کچھ کھو سے گئے۔ اور جب ان کی نظریں لوٹ رہی تھیں تو معاً انہیں اپنی دلہن کا خیال آ گیا' جو ان کے سامنے بالکل قریب گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ آج وہ بھی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ گورے رنگ نے سارے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔ مگر صالحہ کو دیکھ لینے کے بعد اپنی دلہن ان کی نظروں میں نہ جچ سکی۔

کاش ان کی شادی عشرت کی بجائے صالحہ سے ہو جاتی۔ صالحہ ہرگز بڑے بھیا کے قابل نہ تھی اور عشرت ہرگز ان کی بیوی نہ بن سکتی تھی۔

فیاض میاں کو بالکل خبر نہ تھی کہ ریاض میاں کے ذہن میں کون سا جوار بھاٹا برپا ہے۔ وہ تو دلہن کے روبرو اس طرح سر جھکا کر بیٹھے تھے۔ گویا دلہن انہی کو ہونا چاہیے تھا یا پھر وہ ایک مجرم کی حیثیت سے کٹہرے میں لا کر کھڑے کر دیے گئے ہوں۔

صالحہ یہاں تک تو اپنے خوابوں کو ساتھ لائی تھی۔ لیکن اس کے بعد فیاض میاں کے زہد و تقویٰ اور گھر کی خاموش اور بے کیف فضا نے وہ تمام سپنے اس سے چھین لیے تھے اور سب کچھ بھولنے کے بعد وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ بے حد حسین لڑکی ہے۔ کالج میں سب لڑکیاں اسے مشرقی حسن کا ماڈل کہا کرتی تھیں اور ہر ڈرامے کی وہی ہیروئن ہوا کرتی تھی۔ ان ڈراموں میں تو ہر رول وہ اچھا نباہ گئی تھی مگر اب جس ڈرامے کی اسے ہیروئن بنا دیا گیا تھا اس کا کردار ادا کرنے کے لیے اسے نئے سرے سے اپنی تمام صلاحیتیں جمع کرنی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے گھر سے اتنا سرمایہ نہیں لائی تھی جو اپنے کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی تلافی کر سکے۔ اسی لیے اس نے خود کو فیاض میاں

کے رنگ میں ہی رنگ لینے میں عافیت جانی۔

وہ بڑا سادہ لباس پہنتی تھی اور سارا دن اپنے خوبصورت بالوں کو جن پر کالج کے زمانے میں اسے بڑا ناز تھا اور جنہیں وہ کبھی نہیں ڈھکا کرتی تھی' دوپٹے سے ڈھکے رہتی۔ آنکھوں میں کاجل نہ لگاتی۔ شادی کے بعد اسے کسی نے سنگھار کرتے نہ دیکھا تھا۔ سادا سی مسکراتی ہوئی' نیک اور معصوم لڑکی۔ اب اس کے حسن اور پاکیزگی میں کچھ وقار سا آ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے مشرقی لڑکیوں کی ایک پرانی رسم نباہ لی تھی۔ لوگ اس کے سونے چہرے کو دیکھ کر استفسار اور پھر چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ مگر وہ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ سنگھار تو اپنے شوہر کے لیے ہوتا ہے اور جب اس کا شوہر اس بات سے بے نیاز ہے۔ وہ اس کے سادہ سے حسن کو نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا تو اسے آلائشوں سے ملوث کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

یوں دھیرے دھیرے ایک سال کا عرصہ بیت رہا تھا کہ وہ ایک نئے خطرے کی آنچ محسوس کر کے لرز اٹھیں' چھوٹی دلہن ان دنوں میکے گئی ہوئی تھی اور ریاض میاں باہر صحن میں بیٹھے سارا سارا دن صالحہ بہو کو تکا کرتے۔ وہ کوئی کام کرنے باہر نکلتیں تو ان کی نگاہیں ان کا تعاقب کرتیں اور ان کو دیکھ کر ایک عجیب سی مسکراہٹ ریاض میاں کے ہونٹوں پر پھیل جاتی۔

پہلے پہل تو صالحہ بہو نے اسے بھی بھابی اور دیور کے مقدس رشتے کی چھیڑ چھاڑ سمجھا' لیکن رفتہ رفتہ وہ ان حرکتوں سے خوف زدہ رہنے لگیں۔ خصوصاً جس روز سے انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ریاض میاں تمام دن ان کے کمرے میں کسی بہانے سے آ کر لیٹ رہتے اور جیسے ہی فیاض کے آنے کا وقت ہوتا اٹھ کے چل دیتے اور کبھی فیاض میاں وقت سے پہلے آ جاتے تو کوئی سا بہانہ بنا کر کہتے:

''ابھی آیا تھا' بھابی سے کچھ پوچھنے' جا رہا ہوں۔'' حالانکہ ان کو بیٹھے ہوئے کتنے ہی گھنٹے گزر چکے ہوتے۔

اور فیاض میاں کچھ اس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ کبھی پلٹ کر کوئی سوال ہی نہ کیا۔ کبھی یہی پوچھ لیتے کہ میاں تمہاری دلہن آج کل میکے گئی ہوئی ہے تم کیوں سارا سارا دن زنان خانے میں پڑے رہتے ہو۔

دو ایک بار صالحہ کا دل چاہا کہ وہ یہ بات اشارے کنائے سے فیاض میاں کے کان میں ڈال دے کہ ان کے بھیا کے لچھن اچھے نہیں ہیں۔ مگر وہ اس کا نتیجہ سوچ کر خود ہی کانپ گئی۔ انہیں معلوم تھا کہ دوسرے گھروں میں جا کر کیسی کیسی پابندیاں کندھوں پر آن پڑتی ہیں۔ اک ذرا سا غلط قدم اٹھانے سے پورا گھرانہ فساد کی آگ میں جھلس جاتا ہے اور پھر بدنامی الگ ہوتی ہے کہ کس نیچ گھرانے کی آئی تھی۔ مدت سے بھائی اکٹھے رہتے تھے آتے ہی بھڑکا دیا۔

ایک اندیشہ ہوتا تو وہ بے چاری سہہ لیتی۔ یہاں تو اندیشہ ہائے گوناگوں تھے جو ان کی کمزور جان کو لپٹے ہوئے تھے۔ دکھ سکھ

کہنے کے لیے ایک شوہر ہی کی ذات ہوتی ہے۔ جس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتا۔ مگر یہ کیسا شوہر تھا۔ کبھی ضرورت کے بغیر بات بھی نہیں کرتا۔ کبھی اس کے ساتھ مل کر ہنستا نہیں تھا بلکہ اس کا وجود اس کی تنہائی میں اضافہ ہی کرتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں تو وہ رسالوں اور کتابوں سے جی بہلا لیتی تھی اور جیسے ہی وہ کمرے میں آجاتا تو وہ نہایت ادب سے رسالہ ہاتھ سے چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ گویا وہ ابھی اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ دے گا۔ جسے سن کر وہ چھوئی موئی بن جائے گی یا پھر اس سے اس کی اداسیوں کی وجہ پوچھے گا اور وہ بھرے بادل کی طرح بن موسم ہی برس پڑے گی۔ مگر پورے سال میں کوئی ایسی خوش گوار بات نہیں ہوئی۔ اس نے بے بات مسکرانا سیکھ لیا تھا تاکہ لوگ اس پر ترس نہ کھائیں۔ لیکن ایک بات تھی جو روز افزوں اس کی مسکراہٹوں میں کانٹا بن کر کھٹکا کرتی۔

یہ اس روز کا واقعہ ہے کہ سب لوگ موٹر میں بیٹھے ہوئے کسی عزیز سے ملنے جا رہے تھے۔ آگے ڈرائیور اور میاں ریاض بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹ پر گھر کی خواتین بیٹھی تھیں۔ سب سے پرے کھڑکی کے پاس صالحہ بہو اپنے گورے چٹے ہاتھ پر نقاب پکڑے بیٹھی تھی۔ اچانک جوان کی نظر سامنے کے آئینے پر پڑی تو وہ چونک گئیں۔ ریاض میاں نے سامنے کا شیشہ بالکل صالحہ دلہن کی طرف کر دیا تھا تاکہ وہ صالحہ کو نظر آتے رہیں اور صالحہ ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتی رہے۔ پہلی بار تو جب غیر ارادی طور پر صالحہ کی نظر آئینے میں ان کی نظر سے ٹکرائی تو وہ شلجم کی طرح بالکل سفید ہو گئیں۔ ان کا دل اچھل اچھل کر منہ کو آنے لگا۔ پتا نہیں آئینے میں یا ریاض میاں کی شریر آنکھوں میں کون سا خطرہ...... کون سا طوفان چھپا ہوا نظر آیا جو ہاتھ میں پکڑا ہوا نقاب انہوں نے گرا دیا اور جب ان کے حواس بجا ہوئے انہوں نے...... نقاب کی اوٹ میں ہی آئینے کی طرف چور نظروں سے دیکھ کر تصدیق کرنی چاہی۔ آیا یہ ایک اتفاق تھا یا انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ لیکن ریاض میاں اسی طرح آئینے میں عجیب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صالحہ بیگم کھسک کر کھڑکی سے دور ہو گئیں تاکہ وہ خود ہی آئینے کی زد میں نہ آئیں۔

اس دن کے بعد سے ان کا ذہن کھولتا رہا۔ آنکھوں میں شعلے بھڑکتے رہے۔ اب خطرہ عیاں ہو گیا تھا۔ وہ بھی اتنی نادان بچی نہ تھیں کہ ان نظروں کا مطلب نہ سمجھ سکتیں۔ کئی بار صالحہ بہو کا دل چاہا کہ فیاض میاں سے یہ بات کہہ دے۔ مگر سوچنے پر یہ بات بڑی معمولی لگتی تھی۔ اسے وہم اور اتفاق بھی کہا جا سکتا ہے۔ الٹا کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ یہ سوچ کر انہوں نے سارا غصہ اندر ہی اندر پی لیا اور پہلے سے کہیں محتاط ہو گئیں اگر فیاض میاں کے کہنے پر وہ کبھی کبھار ریاض میاں کے کمرے میں کچھ پوچھنے چلی جاتی تھیں تو اب نہ جاتیں۔ اگر ریاض میاں خود ہی ان کی کوئی کتاب کسی بہانے سے اٹھا کر لے جاتے وہ کبھی اسے واپس لینے کا مطالبہ نہ

کرتیں۔ جب ریاض میاں اوپر آتے تو نیچے چل دیتیں۔

دوسرے ہی دن ریاض میاں بن ٹھن کر آئے اور بولے "چلئے بھابی آپ کو فلم دکھا دیں۔"

اس گھر میں فلم کا نام لینا بھی گناہ تھا اور صالحہ کو یاد آیا کہ شادی سے لے کر آج تک انہوں نے کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ کنوار پنے میں وہ ہر ہفتے ایک فلم دیکھا کرتی تھیں۔ اگر کوئی اور ان کو دل پسند موضوع پر دعوت دیتا تو وہ خوشی سے دیوانی ہو جاتیں۔ مگر آج وہ غصے سے پاگل ہو گئیں۔ یہ کون ہوتا ہے مجھے دعوت دینے والا۔

"وہ آلیں تو میں ان سے پوچھ لوں گی۔" صالحہ نے محض ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔

مگر ریاض میاں تو سر ہو گئے۔ "بھلا ان سے کیا پوچھنا وہ تو مولانا ہیں۔ آپ تیار ہو جایئے میں ان سے نپٹ لوں گا۔"

"آپ کون ہوتے ہیں نپٹنے والے۔" ان کا دل چاہا اس کا منہ نوچ لیں۔ انہوں نے ایک فیصلہ کن انداز میں کہہ ہی دیا۔

کافی دنوں کے بعد اس بات کا تذکرہ انہوں نے فیاض میاں سے کر دینا مناسب سمجھا اور جب انہوں نے بڑی ملائمت سے اس شکوے کو ایک سرسری بات بنا کر فیاض میاں کے کانوں میں انڈیلا تو وہ بولے "چلی جاتیں کیا حرج تھا۔"

"کوئی حرج ہی نہ تھا؟" صالحہ بیگم منہ کھولے رہ گئیں۔ یہ کیسا شوہر تھا۔ بیوی کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے خطرے اور بے بسی کو نہیں بھانپ سکتا۔

ادھر اپنے دل کا مطلب آنکھوں کی زبانی صالحہ بہو تک منتقل کر کے ریاض میاں جیسے نڈر ہو گئے تھے۔ اب وہ فیاض میاں کی موجودگی میں ہی صالحہ بہو کے کمرے میں دندناتے چلے آتے ان کی رائٹنگ ٹیبل کی ہر چیز بکھیر دیتے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا گویا وہ ان کتابوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی کتاب اٹھا کر اس پر فضول سا تبصرہ کرنے لگتے۔

صالحہ بہو ان کی ایسی حرکتوں سے دل ہی دل میں کڑھا کرتیں۔ مگر وہ کتنی مجبور تھیں۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بننا پڑ رہا تھا۔ اگر وہ اس انجان پنے سے ایک قدم بھی باہر نکالتیں تو "بیت الاماں" جہنم زار بن جاتا اور کون جانتا کہ اس کے شعلے کس کس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔

"بیٹھیے بھیا۔"

ریاض میاں کے آتے ہی وہ ایک دم سمٹ کر کھڑی ہو جاتیں اور ریاض میاں بجائے کرسی پر بیٹھنے کے ان کے بستر پر بیٹھ جاتے۔ جس پر سے ابھی ابھی وہ بل کھا کر اٹھی تھیں اور بیٹھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک معنی خیز مسکراہٹ ہوتی۔ فیاض میاں سامنے

چارپائی پر منہ لپیٹے یا اخبار کی اوٹ کئے یوں لیٹے رہتے گویا وہ کسی اور ہی دیس کے باسی ہیں۔ ایسی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ جہاں سے لوٹ آنا کوئی ممکن بات نہیں۔

صالحہ بہو اندر ہی اندر غصے سے کھولتی ہوئی فیاض میاں کی طرف دیکھتیں۔ پھر بار بار دیکھتیں۔ لیکن وہ اسی طرح بے سدھ پڑے رہتے۔ انہیں اپنی طرف متوجہ نہ پا کر ریاض میاں، صالحہ دلہن سے گفتگو کرنے لگتے۔ جس کا وہ بڑا مختصر سا جواب دیتیں اور کبھی تو جواب ہی نہ دیتیں بلکہ کسی بہانے مڑ کر باہر چلی جاتیں اور فیاض میاں چونک کر پوچھتے:

"ریاض چلا گیا؟"

"ہاں!"

"تم نے اسے بٹھایا کیوں نہیں؟"

"آپ ہی بٹھا لیتے۔"

"اور کیا تمہارا فرض نہیں!"

سب کچھ میرے فرائض میں ہی ہے؟ کبھی آپ کو اپنے فرائض کا بھی خیال آیا ہے۔ مگر وہ اطاعت شعار بیوی کی طرح بالکل خاموش ہو جاتیں یا وہ خود بزدل تھیں یا انہیں سامنے بھی اندھیرا ہی نظر آ رہا تھا، جو ان تاریکیوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے خوف محسوس کرتی تھیں۔ ایک مسلسل چبھن تھی جو ان کو کھوکھلا کئے دے رہی تھی۔ ایک مبہم سا خطرہ تھا۔ کیا معلوم کس وقت کھل کر سامنے آ جائے اور کیا خبر یہ خطرہ ایک روگ بن کر تمام عمر اندر ہی اندر ڈستا رہے تو اس صورت میں کیا ہو گا۔

لیکن ایسی صورت آنے سے پیشتر ایک روز خطرہ سامنے آ گیا۔

اس روز بھی صالحہ دلہن اپنی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹی حسب معمول عورتوں کا ایک جریدہ پڑھ رہی تھیں۔ فیاض میاں سامنے پلنگ پر انہی کی طرف منہ کئے لیٹے تھے۔ دونوں کے درمیان ایک ناگوار اور غیر قدرتی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فیاض میاں تو شاید اس خاموشی کے عادی تھے یا وہ خود سے کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔ مگر صالحہ بہو نے اب یہ عادت بنالی تھی۔ کنوار پنے میں اگرچہ وہ بڑی باتونی تھیں۔ بات بات میں لطیفے اور چٹکلے سنا سنا کر اپنی گفتگو کو اور بھی پر کشش بنا دیا کرتی تھیں۔ لیکن اب ان میں ایک نیا جذبہ سر اٹھا رہا تھا۔

اگر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تو مجھے کیا ضرورت ہے۔ فضول بک بک کرنے کی اور بہت تھوڑے دنوں میں وہ اس ناگوار اکتا

دینے والی خاموشی کی عادی ہوگئی تھیں۔ وہ سارا وقت مطالعہ کیا کرتیں اور پڑھنے میں مگن ہو کر اپنے برائے نام شوہر کے وجود کو بھی نظر انداز کر جاتیں۔

فیاض میاں کی ذرا آنکھ لگی تھی اور صالحہ بہو نے تھوڑی سی کروٹ لی تھی کہ سرہانے کے دروازے پر چاپ ہوئی۔ انہوں نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ ریاض میاں ایک گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ صالحہ بہو کو بیدار پا کر انہوں نے وہ پھول پہلے اپنے ہونٹوں سے لگایا اور پھر گھما کر صالحہ بہو پر پھینک دیا۔ جو لہراتا ہوا سیدھا ان کی بل کھائی ہوئی کمر پر آن لگا۔ پھول کے جھپاکے سے ایک دم فیاض میاں کی آنکھ کھل گئی۔

انہوں نے پھول کو آتے تو نہیں دیکھا تھا۔ مگر کسی نامعلوم سمت سے آ کر گرتے ضرور دیکھ لیا تھا۔ پر وہ اس بات سے ذرا نہیں چونکے اور نہ پلٹ کر انہوں نے اس طرف دیکھا۔ جس طرف سے پھول آ کر گرا تھا۔ بلکہ کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا اور سو گئے۔

"آیئے ریاض بھیا! آپ کے بھائی جاگ رہے ہیں۔

صالحہ بہو نے پیچ و تاب کھائی ہوئی ناگن کی طرح اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کہا اور فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

ریاض میاں نے وہیں دہلیز میں کھڑے کھڑے ابرو کے اشارے سے انکار کر دیا۔ اور چپ چاپ چل دیئے۔

پھول ابھی تک بستر پر پڑا تھا اور صالحہ بہو کی شعلہ بار آنکھیں اسی جگہ....... اسی پھول کو دیکھے جارہی تھیں۔ پھول ان کو کتنے پسند تھے۔ خصوصاً گلاب کے پھول' لیکن آج اس پھول کو دیکھ کر تمام پھولوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ ان کے بس میں ہوتا تو پھولوں کے تمام پودے وہیں کھڑے کھڑے نوچ ڈالتیں۔ ان کی نظریں اس وقت سے اسی جگہ پر لگی تھیں۔ جہاں سفید براق ایسے بستر پر ایک سرخ انگارا ایسا دہکتا ہوا پھول اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس وقت انہیں ایسا محسوس ہوا۔ یہ پھول نہیں ایک ناسور ہے۔ ایک ایسا ناسور جو کبھی اچھا نہیں ہوگا۔ یہ کوئی ناپاک سایہ ہے یہ ایسا شرر ہے جو ان کے وجود کو جلا کر بھسم کر دے گا۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں اور کئی خوفناک اور انجانے خیال آئے۔ معاً انہیں کھڑے کھڑے یوں محسوس ہوا کہ پھول نے ایک ناگ کی صورت اختیار کر لی ہے اور آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ان کے سامنے اندھیرا ہو جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بپھر اٹھی اور اگلے ہی لمحے انہوں نے اپنے بستر کی چادر پھول سمیت لپیٹ کر دور پھینک دی گویا اب چادر ناپاک ہوگئی تھی اور اس پر بیٹھنے سے ان کے پاکیزہ وجود کے ناپاک ہوجانے کا خطرہ تھا۔

''کیوں کیا ہوا.......؟'' فیاض میاں سوئے ہوئے چونک پڑے۔

''کیا کوئی زہریلا جانور تھا بستر میں؟''

''جی ہاں....... سانپ گھس گیا تھا میرے بستر میں۔''

''سانپ؟'' وہ صالحہ بھو کا چہرہ نظر انداز کرتے ہوئے بڑی سادگی سے اٹھ کر بیٹھ گئے ''تو تم نے اسے اس طرح لپیٹ کر یوں کیوں پھینک دیا ہے۔ سانپ تھا تو مار دیا ہوتا زہریلے جانوروں کو یوں نہیں چھوڑا کرتے۔''

''جس سانپ کو مارنے کی آپ ہمت نہیں پاتے۔ وہ مجھ جیسی کمزور عورت سے کیونکر مر سکتا ہے؟''

یہ کہتے ہوئے ان کی خوب صورت آنکھوں سے اس طرح آنسو گرنے لگے جیسے بارش کے بعد پام کے گملوں سے قطرہ قطرہ شبنم نیچے ٹپکتی ہے۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' فیاض میاں نے حسب عادت انتہائی کند ذہن ہونے کا ثبوت دیا اور اٹھ کر دور پڑی ہوئی چادر کو جھاڑ دیا۔ چادر کے جھاڑنے سے اندر چھپا ہوا پھول دور جا گرا۔ اس کی پتیاں فرش پر ادھر ادھر بکھر گئیں اور فیاض میاں پلنگ کی پائتی پر چادر کو رکھتے ہوئے اپنی چارپائی پر جا بیٹھے۔

''ایسی بات ہی کیا تھی، جو تم آگ بگولہ ہو رہی ہو۔''

''کوئی بات ہی نہ تھی۔'' وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے جھٹ بولیں۔

''آپ نے کچھ نہیں دیکھا، آپ آپ اس قدر۔'' لیکن اس کے آگے وہ کیا کہیں ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ ایک دم اپنے بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''اندھا....... اندھا۔'' ان کے دل کی دھک دھک سے لگا تار یہی آواز آ رہی تھی اور جتنی تیزی سے وہ روتیں۔ اتنی ہی تیزی سے ان کے دل کی دھڑکن....... اندھا اندھا کی تکرار کرتی۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ سرہانے کے کونوں پر رکھ لیے اور روتی رہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ریشمی تکیے کے چاروں کونے بھیگ گئے۔ گیلی گیلی، روئی ان کے تپتے ہوئے رخساروں کو طمانیت بخشنے لگی۔ ان کی آنکھیں اس طرح سوج گئیں جیسے ان کی آنکھوں پر دو اور آنکھوں کو بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ اب اگر وہ کوشش کر کے آنکھیں کھولیں تو کچھ دکھائی دیتا تھا۔ ورنہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے پپوٹے ایک بہت بڑے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ بہت سا رو چکنے کے بعد جب صالحہ بھو کی طبیعت ذرا ہلکی ہوئی تو انہوں نے چونک کر دیکھا۔ فیاض میاں نہ معلوم کس وقت چپکے سے نیچے چلے گئے

تھے۔انہیں اپنے شوہر کے اس رویے پر ذرا حیرت نہ ہوئی آخر وہ ان سے کوئی امید ہی کیوں رکھیں۔البتہ انہوں نے اب اپنے دل کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

دل جو کہہ رہا تھا۔تیرا شوہر اندھا ہے۔کور باطن ہے' دو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی بصارت سے محروم ہے۔

ہاں۔انہوں نے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا۔اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے اپنا منہ دھویا۔شادی کے بعد آج پہلی مرتبہ وہ اتنا زیادہ روئی تھیں۔رونے سے اگرچہ ان کا ذہن پھٹ رہا تھا۔مگر ان کا وجود بڑا ہلکا لگ رہا تھا اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ دبیز اور بوجھل بادل جو ایک عرصے سے ان کی روح کو کچل رہے تھے۔آج ایک دم برس جانے سے ان کا وجود پرسکون ہو گیا تھا۔جیسے خس و خاشاک تیز لہروں میں بہائے جانے کے بعد سمندر کی سطح پر باوقار سی خاموشی چھا جاتی ہے۔

تھوڑی سی دیر کو ان کے دماغ میں یہ خیال آیا۔ہوسکتا ہے فیاض میاں' ریاض میاں سے لڑنے یوں غصے میں چپ چاپ اٹھ کر چل دیئے ہوں۔کیا ایسا ہوسکتا ہے؟صرف یہ سوچنے سے اک دم ان کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔نہیں۔دوسرے لمحے ان کے دل نے تردید کر دی وہ بزدل جو تیرے قیمتی آنسوؤں کو نہ پونچھ سکا۔وہ تیرے لیے کیا کرسکتا ہے؟اور رات کو جب فیاض میاں اسی طرح اپنا ستا ہوا جذبات سے عاری چہرہ لیے اوپر آ گئے تو ان کے اپنے خیال کی تصدیق ہو گئی۔انہوں نے قلم اٹھایا اور عشرت دلہن کو خط لکھنا شروع کر دیا۔

عاشی!

اب تم فارغ ہوگئی ہو۔جلدی سے گھر آ جاؤ۔تمہارے بغیر گھر سونا سونا لگتا ہے اور ہم سب سے زیادہ ریاض بھیا پر تمہاری جدائی شاق گزر رہی ہے۔

اگلے ہی ہفتے عشرت دلہن اپنی ننھی سی گڑیا کو گود میں لیے گھر آ گئیں۔"بیت الامان" کے منجمد ماحول میں تھوڑی سی گہما گہمی پیدا ہو گئی۔جس طرح ایک ٹھہری ہوئی متعفن ندی میں کوئی کھیلتا ہوا چنچل بالک ایک کنکر پھینک کر چل دیتا ہے۔اور سوئی ہوئی لہریں ایک دوسرے سے جھگڑ کر خود ہی گرداب میں گم ہو جاتی ہیں اور پھر سطح ساکن ہو جاتی ہے۔

البتہ "بیت الامان" کی اوپری منزل پر اس گہما گہمی کے آثار باقی تھے اور خیال تھا کہ شاید یہ باقی رہیں کیونکہ رات کو مسلسل ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز اور تمام رات جلتی ہوئی بجلی کی روشنی اس کا بین ثبوت تھے۔اب پھر محلے والے اس دومنزلہ اونچی عمارت کے وجود سے چونک گئے تھے جو خاموشی میں لپٹی ہوئی سربلندی کے باوجود اپنا آپ تسلیم کروانے سے انکار کر رہی تھی اور نئی

بات جو محلے والوں کے لیے موضوع سخن بن سکی وہ یہی تھی کہ عشرت دلہن ایک بچے کی ماں بن گئی تھیں مگر صالحہ بہو کے دریچوں پر اس طرح کے سفید رنگ کے پردے پڑے رہتے تھے۔ وہاں زندگی کے آثار نہ تھے اور محلے والوں نے دل میں یقین کر لیا تھا کہ صالحہ بہو اپنے گھر میں خوش نہیں ہیں۔ خدا معلوم ان محلے والوں کی کون سی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے ایسی باتیں خود ہی اخذ کر لیتے ہیں۔ بال آخر جن کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکل آتا ہے.......!"

اب صالحہ بہو بھی اپنا سارا دکھ بھول کر تمام دن عشرت کی ننھی سی گڑیا کے لیے چھوٹی چھوٹی فراکیں اور سوئٹر بننے میں لگ گئی تھیں۔ بظاہر تو ریاض میاں بھی اپنی بیٹی پا کر بہل گئے تھے۔ سارا دن اس کے ساتھ لاڈ پیار کرتے اور جو کبھی صالحہ بہو عشرت کے اصرار پر ان کے ہاں چلی جاتیں وہ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے گویا وہ ان سے شناسا ہی نہیں اس بات نے نہ صرف صالحہ بہو کو مطمئن کر دیا تھا بلکہ انہیں اپنی سوچی ہوئی گزشتہ باتوں پر ندامت بھی ہونے لگی کہ انہوں نے خواہ مخواہ ان کی نیت پر شک کیا۔ یہی وجہ تھی کہ صالحہ بہو اب اکثر عشرت کے پاس جانے لگی تھیں۔ اس کی بچی کو کھلایا کرتیں۔ عشرت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتیں اور وقت بظاہر صاف ستھرے اور سلجھے ہوئے موڑ پر آ گیا تھا کہ اچانک ایک حادثہ ہو گیا۔ اس روز صالحہ بہو اپنے میکے جا رہی تھیں۔ انہوں نے ہلکے پیازی رنگ کا لہنگا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس میں ان کا ادھ کھلا حسن عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ جب وہ عشرت دلہن کے کمرے میں انہیں سلام کرنے گئیں، تو وہ کمرے میں نہ تھیں۔ صرف ریاض میاں بچی کو گود میں لیے بیٹھے تھے۔

"عشرت کہاں ہے بھیا۔" ایک ریشم ایسی آواز ان پر بجلی بن کر گری۔

انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور جواب دینے کے بجائے ان کے چہرے میں کھو گئے۔ اس طرح جیسے انہیں اپنی بھی سدھ بدھ نہیں رہی۔

"عشرت کہاں ہے بھیا؟" صالحہ بہو سر سے پاؤں تک لرز گئیں۔

"ٹھہرو! میں بتاتا ہوں۔" یہ کہنے سے ان کا کیا مقصد تھا۔ صالحہ بہو سمجھ نہ سکیں، مگر جونہی وہ بچی کو پالنے میں لٹانے کو اٹھے۔ صالحہ بیگم چھپاک سے نکل گئیں اور اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے بے ترتیب سانسوں کو سنوارنے کی کوشش کی۔

"تم مجھے پوچھنے آئی تھیں۔ صالحہ! میں ذرا غسل خانے میں تھی۔" ان کے پیچھے ہی عشرت دلہن لپکتی ہوئی آ گئیں۔

وہ جس خطرے میں خود کو سمجھتی تھیں۔ وہ تو ایک ایسا خطرہ تھا جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح کسی وقت بھی پھٹ کر باہر آ سکتا تھا۔ گو جتنے دن بھی وہ رہیں اسی خطرے کی آنچ محسوس کر کے روتی رہیں۔ اب انہیں اس جہنم کدے میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ جہاں

ان کا اپنا کوئی نہ تھا۔ وہاں ہر رشتہ رسمی سا تھا۔ کبھی ان کا دل چاہتا لوٹ کر یہ بات عشرت کو بتادیں مگر اس کا کوئی واضح ثبوت بھی تو ان کے پاس نہ تھا۔ آنکھوں اور اشاروں کی باتوں کو ثبوت بنا کر پیش کرنا بڑی حماقت ہے۔

انہی پریشانیوں میں گھری واپس آگئیں۔ انہوں نے بہتیرا چاہا کہ حالات کے اس دھارے پر خود کو ساکت وصامت بہہ جانے دیں، لیکن اس کے باوجود ان کا دل اس بات پر رضامند نہ تھا۔ وہ ذرا ذرا چونک کر ہر لمحے آنے والے خطروں سے انہیں آگاہ کرتا تھا۔

جب وہ ''بیت الامان'' میں واپس آئیں تو ہر شے بدستور تھی۔ صرف اوپر والی منزل میں کسی تبدیلی کے آثار تھے۔ عشرت دلہن ان سے کچھ کھنچی کھنچی سی تھیں اور اب صبح وشام خاوند بیوی کی کھٹ پٹ اور چیخ چیخ سنائی دیتی تھی۔ جس سے صالحہ بہو نے یہ نتیجہ نکالا کہ ریاض میاں نے خود ہی اپنی بیوی کو سب کچھ بتادیا ہے اور اب وہ اس کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صالحہ کو رام کرے۔

''ہائے کیسی بے حیائی تھی؟''

اور کیسی بیوی تھی جو اپنے شوہر کو اس بات سے باز نہیں رکھ سکتی تھی اور یہ اس کا اپنا کیسا خاوند تھا جو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا بن گیا تھا۔ بزدل کہیں کا۔

یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی کہ صالحہ دلہن اوپر آرہی تھیں اور ریاض میاں نیچے جارہے تھے۔ صالحہ دلہن کے پیچھے پیچھے بن چاپ کے چپل پہنے فیاض میاں بھی سر جھکائے۔ دھیرے دھیرے اوپر آرہے تھے۔ ریاض میاں روشنی سے ایک دم سے اندھیرے میں آگئے۔ ان کی ٹکر تیزی سے آتی صالحہ بہو سے ہوگئی۔ وہ ایک دم ٹھٹکے اور پھر انہوں نے صالحہ بہو کے گداز بازوؤں کو اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لے کر بولے ''تم آخر کب تک بھاگتی رہوگی؟''

''جی ......'' انہوں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے نکل جانا چاہا۔

''میں پوچھتا ہوں تم مجھ سے خواہ مخواہ نفرت کیوں کرتی ہو؟''

''اس لیے کہ آپ نفرت کیے جانے کے قابل ہیں۔'' وہ غصے میں ایک دم بپھر اٹھیں۔ ''آپ انتہائی ذلیل اور کمینے ہیں۔ آپ .... آپ اپنے بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہیں آپ۔'' ان کی آواز رندھ گئی۔

''ہاہاہا........'' سیڑھیوں میں ریاض میاں نے قہقہہ لگایا۔ ''میرے بھائی کو الزام نہ دو۔ اس کی ہر چیز میری ملکیت ہے۔''

''بے ایمان، معلون'' .... صالحہ بہو نے اپنا بازو زور سے چھڑایا اور دو تین سیڑھیاں پھسلتی ہوئی نیچے جارہیں۔ جہاں اس وقت فیاض میاں نے اپنا پاؤں رکھا تھا۔ اندھیرے میں جب ریاض میاں نے اپنے بھائی کو پہچانا تو وہ فوراً کترا کر نیچے اتر گئے۔

صالحہ بہو کی کہنیاں چھل گئی تھیں اور وہ زار وقطار رو رہی تھیں بالکل اسی جگہ منہ رکھے جہاں فیاض میاں دم بخود کھڑے تھے۔ ظاہر ہے چونکہ یہ بھی صالحہ بہو سے چھ یا سات سیڑھیاں پیچھے تھے اس لیے انہوں نے یہ تمام گفتگو سن لی تھی۔ کوئی اور شوہر ہوتا تو ایسی گفتگو سن کر اپنی پاک باز بیوی کو سینے سے لگا لیتا یا اسی وقت اپنے بھائی سے گتھم گتھا ہو کر اسے واصل جہنم کر دیتا مگر فیاض میاں ایک بت بنے وہیں کھڑے تھے پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اوپر آ گئے۔

صالحہ بہو بھی بات کی نزاکت کو سمجھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئیں اور پھر اپنے بستر پر گر کر آج وہ پہلے سے زیادہ روئیں۔

''کیوں رو رہی ہو۔ بات ہی کیا ہے؟'' فیاض میاں نے حسب عادت بے وقوف بنتے ہوئے پوچھا۔

''آپ نے کچھ نہیں سنا؟'' صالحہ بہو نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر پوچھا۔

مگر جواب دینے کے بجائے انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

بہرا' بہرا۔ صالحہ بہو ہچکیوں میں ڈوب گئیں اور ان کا دل دھک دھک کرتا رہا۔

اور اب یہ ان کا معمول سا بن گیا تھا۔ ہر صبح رونا' ہر شام رونا....... اور رونے کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اس گھر میں ان کا کون تھا۔ سبھی ان کو پرایا سمجھتے تھے۔ جس شوہر کے لیے وہ اپنی جوانی تباہ کر رہی تھیں وہ پتھر کا ایک بت تھا۔

اب صالحہ بہو نے یہ بات کھلم کھلا عشرت دلہن سے کہہ دی تھی اور کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو کنٹرول میں کر لے ورنہ کل کو کچھ کر گزری تو اس کی ذمے داری اسی پر ہوگی۔

پتا نہیں عشرت دلہن نے اپنے شوہر کو قابو میں کیا تھا یا نہیں مگر اب اتنا ضرور تھا کہ دیور بھابی میں مدتوں سے بول چال بند تھی۔ درمیان والے دروازے مقفل ہو گئے تھے اور ریاض میاں گویا صالحہ بہو کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان کے حصول کی خواہش ان کے دل میں ہے یا نکل گئی ہے۔

صالحہ بہو اب مطمئن تو نہ تھیں مگر انہوں نے زہر کا یہ پیالہ منہ سے لگا لیا تھا۔ فیاض میاں کا خیال تھا کہ یہ صالحہ کا وجود ہے جس نے دونوں بھائیوں میں نفاق ڈالا تھا۔

بظاہر طوفان تھم گیا اور منہ زور سیلاب کو روکنے کے لیے ناکہ بندی بھی کر دی گئی تھی۔ مگر صالحہ بہو اب بھی ڈرتی تھیں نہ معلوم یہ طوفان کب اور کس طور جاگ کر ظاہر ہو۔ جوانی بھی بعض اوقات کتنی مصیبت زدہ کہانی بن جاتی ہے۔ بوڑھی عورتیں تھیں جو سدا جوانی کو یاد کر کے روتیں۔ خود کو اب بھی جوان بتاتیں۔ کوئی کہتی تفکرات اور صدمات سے بال سفید ہو گئے ہیں اور کسی کا خیال تھا کہ نزلے سے

دانت گر گئے ہیں۔ مگر صالحہ بہو تھیں جو انہیں رشک سے دیکھتیں اور سوچتیں وہ خود بھی جلدی سے بوڑھی کیوں نہیں ہو جاتیں۔ خدا جانے ابھی بوڑھے ہونے میں کتنا عرصہ ہے اور یہ عرصہ انہیں پہاڑ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ لوگ بھی کیسے عجیب تھے جو یہ کہتے تھے کہ جوانی پر لگا کر اڑ جاتی ہے مگر ان کی جوانی تو پر کٹا کر کبوتر بن گئی تھی۔ ہزار کوشش سے وہ اسے منڈیر پر سے اڑانے کی کوشش کرتیں۔ ادھر سے ہنکارتیں تو دوسری طرف آ کر بیٹھ جاتا۔ ادھر سے ہنکارتیں تو پھر ادھر آ جاتا اور پھر انہوں نے منہ سر لپیٹ کر اس کی پروا کرنی چھوڑ دی تھی۔ زخم کی ایک بھٹی تھی جو ان کے سینے میں سلگا کرتی۔ بھلا وہ کیوں زندہ ہیں؟ کس لیے؟ اور اس کا وجود کس کا تھا؟ اوپر والی منزل میں آ کر وہ خود ناکارہ سی ہو گئی تھیں۔

اس روز دونوں بھائی اکٹھے کراچی سے واپس آئے تھے۔ وہ دونوں کسی کاروبار کے سلسلہ میں گئے ہوئے تھے ان کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر صالحہ بہو کا دل خواہ مخواہ دھڑکنے لگا۔ ان کے دل کو تو اب بات بے بات بری معلوم ہوتی تھی مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ ان چار برسوں میں وہ ایک دن بھی اپنی مرضی سے جی نہ سکی تھیں۔ یہ چار سال کا عرصہ پر لگا کر اڑ گیا تھا۔ مگر زندگی تھی کہ مفلوج اور اپاہج ہو کر ان کی چوکھٹ پر گر گئی تھی۔

وہ دونوں باہر برآمدے میں کافی دیر سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور جب انہیں بہت دیر ہو گئی تو صالحہ بہو حسب معمول اندر والے کمرے میں عشاء کی نماز پڑھنے چلی گئیں ان کی باتیں کرنے کی آواز دھیرے دھیرے سرک کر صالحہ بہو کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اور پھر وہ سجدے میں پڑی پڑی ایک دم چونک اٹھیں' جب ریاض میاں' فیاض میاں سے کہہ رہے تھے:

''بھیا ایک بات کہوں' برا تو نہ مانو گے؟''

''نہیں!''

''کیوں نہ ہم اپنی بیویاں بدل لیں۔ تم میری بیوی لے لو میں تمہاری بیوی لے لوں۔'' پھر خاموشی چھا گئی۔

''کیوں کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟'' یہ پھر ریاض میاں کی جذبات سے بھرپور آواز تھی۔

میں سونے جا رہا ہوں' مجھے نیند آ رہی ہے۔'' فیاض میاں سکون سے اٹھ کر اندر آ گئے اور ریاض میاں کا قہقہہ دور تک ان کا پیچھا کرتا رہا۔

صالحہ بہو اتنی دیر سے سجدے میں پڑی کیا پڑھ رہی تھیں آیا وہ ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پڑھ رہی تھیں انہیں کچھ ہوش نہ تھا کہ اس وقت وہ کس حالت میں ہیں' کہاں ہیں۔ کیا کر رہی ہیں؟ بس غصے سے ان کا خون کھول اٹھا۔ ان کا سراپا تھر تھر کانپنے لگا۔ انہیں ریاض پر

غصہ نہیں تھا۔ وہ تو اس سے بھی نیچ بات کہہ سکتا تھا۔ مگر ان کا شوہر اتنا ہی بے غیرت' بے حس اور بے وقوف تھا۔ ان کا دل چاہا وہ اٹھ کر فیاض میاں کا منہ نوچ لیں اور انہیں جھنجھوڑ ڈالیں۔ ان پر تیل چھڑک کر انہیں آگ لگا دیں۔ لیکن' وہ سجدے میں پڑے پڑے بھرے بادل کی طرح ایک دم برس اٹھیں۔ یہ دل کا غبار نکالنے کا ایک پرانا طریقہ تھا۔

یکا یک انہیں محسوس ہوا وہ "سبحان ربی الاعلیٰ" کی جگہ مسلسل....... پڑھ رہی تھیں

صم بکم عمی.............صم بکم عمی

◆◆◆

انٹلکچوئل لڑکی

ایسے بھائی تو جو ہوئے جو نہ ہوئے برابر........!

میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ میرا کوئی بھائی بھی ہے....... اے....... بھائی کوئی ایسے ہوتے ہیں' بہن بھی ایک ہو .... اور بھائی خیر سے تین تین اور تینوں کروڑوں میں کھیلتے ہوں مگر پلٹ کر خبر نہ لیں....... کبھی پوچھیں ہی نہ کہ کس حال میں ہو .... بھئی اگر امیر ہیں تو ہمیں کیا....... شہر کے معزز ترین ہیں تو ہماری جوتی سے....... دنیا ان کو سلام کرتی ہے تو ہماری جانے پیزار....... ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ اس دنیا میں ہمارا بھی کوئی بھائی ہے.......!

ہاں! ہاں کیا انہوں نے ہمارے مہینے لگا رکھے ہیں' یا ہماری اولاد کا وظیفہ باندھ رکھا ہے۔ اپنوں کو تو ولایت اور امریکہ تک بھیجا اور اتنا خیال نہ آیا کہ میرا ایک ہی بیٹا چار سال ایم اے کر کے بچارا شہر بھر میں مارا مارا پھرتا رہا' کہیں بھی دو ٹکے کی نوکری نہ ملی۔ غیرت کو چولہے میں ڈال کر میں خود بڑے بھائی کے پاس گئی' کہا آپ شہر کے مشہور جج ہیں' کہیں نوکری دلوا دیں۔ سوکھے منہ وعدہ تو کر لیا' انہوں نے مگر ساتھ ہی بولے' بھئی اس نے تو تاریخ میں ایم اے کیا ہے وہ بھی سیکنڈ ڈویژن میں....... کسی اچھے مضمون میں ایم اے کیا ہوتا' یا ایل ایل بی ہی کر لیتا تو میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتا۔

میں نے خون کے گھونٹ بھر کے ذرا اور منت سماجت کی تو بولے ''کوشش کروں گا۔''

مگر کیا کوشش کی انہوں نے....... ایک مقامی کالج میں عارضی طور پر لیکچرار لگوا دیا کہ جب کوئی اسامی خالی ہو گی ادھر لگوا دوں گا۔ ایک سال تو ہو گیا بچارے کو دماغ کھپاتے ہوئے....... مگر بھائی صاحب قبلہ کے دماغ عالی سے نکل چکا ہو گا کہ کوئی غریب بھانجا بھی ہے اور میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے....... غریب رشتہ داروں کے ساتھ وعدہ کرنا تو ٹرخانا ہوتا ہے ہم کیا جانتے نہیں ہیں۔

ہاں جی....... اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لڑکا نہیں دیا' لیکن تین بیٹیاں دے دیں۔ ذرا ان کی اٹھان دیکھو....... مرد مار قسم کی لگتی ہیں۔ موٹریں چلاتی ہیں' ٹی وی پر جاتی ہیں۔ کلبوں میں ڈانس کرتی ہیں....... اے اللہ کے بندے اگر خدا نے تجھے کوئی وارث نہیں دیا تو بہن کے اکلوتے بیٹے کو ہی کلیجے سے لگا لیتا' سر پر ہاتھ رکھ دیتا۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بیرون ملک بھیج دیتا' بلا سے اپنی

کوئی چھنال ہی اس کے پلے باندھ دیتا۔

ویسے ان کی لڑکیاں گھر بسا کر بیٹھنے والی نہیں ہیں بی' وہ تو بس کلبوں کی رونق بن سکتی ہیں' میں صرف کہے دیتی ہوں ہو ہاں۔

اور یہ منجھلے بھائی صاحب! اپنی کرسی پر نہ اترائیں بہت .... اس اقتدار کی کرسی کا کیا ہے' یہ کم بخت تو بہت بے فیض اور طوطا چشم ہوتی ہے آج اس کی تو کل اس کی چلے ہیں بھاوج کے آگے ہاتھ پھیلانے' ہاں جی: مایا کو مایا ملے' کر کر لمبے ہاتھ۔

انہیں اپنے لائق فائق بیٹے کے لیے اپنی بھانجی نظر نہیں آئی۔ کیا عیب ہے میری فیضا میں' مناسب شکل وصورت' ایم اے میں پڑھتی ہے۔ گھر کا سارا سلیقہ آتا ہے بھلا وہ ہم سے کیوں رشتہ مانگیں گے۔ شہر میں ان کی سبکی نہ ہو جائے اور بہن ہم جہیز میں دے ہی کیا سکتے ہیں۔

ہاں! دیکھی ہے ان کی محبت بھی۔ عید کے عید کھڑے کھڑے آئیں گے اور بچوں کے ہاتھوں پر پیسے رکھ کر یوں چلے جائیں گے' جیسے کوئی بھکاری کو بھیک دے کر چلا جاتا ہے اور ان کی بیگم تو ہمیں رشتہ دار کہنا پسند نہیں کرتیں۔ زن مرید ہیں میرے دونوں بھائی جوروں کے غلام کمینے .... اے میں کیوں جاؤں بہن .... میں کیوں کہلواؤں .... میں تھوکتی ہوں ان کی امارت پر .... روز روز جاؤں تو یہی کہیں گے رال ٹپکاتی آجاتی ہے۔ گھر میں روٹی تو ہم بھی کھاتے ہیں۔

اور یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے۔ لیکے مجھے ایک کلرک سے بیاہ دیا بے چارا کلاس ٹو سے آگے نہ بڑھ سکا' زندگی ان کی جان کو روتے بیت گئی۔ اب کیا ہے؟ تین جوان بیٹیوں کا بوجھ سر پر ہے' مگر انہیں کب پرواہ ہے شادی کے وقت میں روتی تھی تو کہتے تھے "ہمارے جیتے جی تمہیں کس بات کا فکر ہے۔ کبھی کوئی تکلیف پہنچے تو آجانا۔" اب میں بھی ایسی بے غیرت نہ تھی کہ روز روز دکھڑے سنانے جاتی۔

"کیا.......؟ وہ چھوٹے بھیا۔"

"بس اس کا بھی کیا پوچھتی ہو بہن ان کا نام ہی نہیں لینا چاہیے۔ امریکا جا بسے ہیں وہاں کے لوگ تو باپ کا نام نہیں جانتے اور سگی ماں کو نہیں پہچانتے .... بھلا وہ کیا ہمیں یاد رکھیں گے .... ہاں .... عیدوں پر پانچ پانچ سو کا منی آرڈر ضرور بھیج دیتے ہیں' ارے بہن .... اگر اسی ملک میں رہتے ہوتے تو میں یہ پیسے ضرور واپس کر دیا کرتی .... بھلا ان پانچ سو روپوں کے بنا گزر نہیں ہوتی کیا؟ ایسے ہی اپنا بھرم بنا کے بیٹھی ہوں' کپڑا اٹھاؤں گی تو اپنا ہی بدن ننگا ہوگا .... یہ دکھڑے کسے سناؤں جا کر .... صبر کے سوا چارہ کیا ہے بہن .... منہ بند کر کے ایک عمر بیت گئی ہے۔ باقی تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ وہ بھی رو دھو کے گزر جائے

گی۔

فیضا بے چاری تھکی ہاری یونیورسٹی سے آئی تھی اور گم صم اماں کے پیچھے کھڑی تھی' اماں کو اس کی پروانہ ہوئی۔ تجن خالہ کے سامنے بے تکان بولے چلی جارہی تھیں۔ وہی تقریر جو اپنے بھائیوں کے متعلق وہ موقع بے موقع کرتی رہتی تھیں۔ ایسی منہ زور تقریریں فیضا پہلے بھی کئی بار سن چکی تھی اور اماں کو منع بھی کر چکی تھی کہ وہ اس طرح بلا سوچے سمجھے نہ بولا کریں۔

اس نے سوچا....... آج پھر تجن خالہ کوئی نئی تازی خبر لائی ہوں گی۔ جو اماں آپے سے باہر ہورہی ہیں۔ یہ تجن خالہ بھی عجیب بی جمالو قسم کی اماں کی کوئی رشتے کی بہن ہوتی ہیں۔ پانچ حج کرنے کے باوجود ادھر کی ادھر لگانے کی عادت نہیں گئی۔ شیخ سعدی کا قول ہے جو آدمی کسی کی غیبت تمہارے سامنے آ کرتا ہے' اسے اپنا دوست مت جانو' وہ تمہاری بھی ضرور کسی کے آگے کرتا ہوگا۔ اب اماں کو کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے؟ خواہ مخواہ بس یونہی .... اماں میں حسد کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہے اور اوپر سے احساس کمتری اس قدر کہ .... اچھے برے کی پہچان ہی نہیں رہی۔

''آج کیا نئی بات ہوگئی اماں.......؟'' اس نے ناگواری سے پوچھا'' پھر آپ اپنا سر کیوں کھپا رہی ہیں۔''

''اے کب آئی تو یونیورسٹی سے۔'' اماں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر....... اسی سے پوچھ ڈالا۔

''گھنٹہ بھر سے تو آپ کے پیچھے کھڑی ہوں اماں' آپ اپنی کہنے میں اتنی مصروف تھیں کہ آپ کو میرے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔''

''ہاں....... ہاں....... ایک تو ہی تو افلاطون رہ گئی ہے....... آ جا....... لیکچر جھاڑ دے میرے آگے۔''

اماں اس وقت واقعی بڑے خطرناک موڈ میں تھیں۔ فیضا کتابیں برآمدے میں پٹک کر سیدھی باورچی خانے میں چلی گئی' چولہا جلایا اور سالن گرم کرنے لگی۔ بڑی زبردست بھوک لگ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی روٹیوں کے ساتھ گرم گرم سالن بہت مزے کا لگا۔ باوجود موڈ خراب ہونے کے اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا....... پانی پیا.......!

روٹی.......؟

''دنیا کی ایک زبردست حقیقت۔''

وہ بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اس پر سارے دن کی تھکن غالب آنے لگی اس کا دل چاہا تھوڑی دیر کے لیے جا کر بستر میں لیٹ جائے۔

بے فکر...... بے پرواہ......!

یوں سونا ہی تو اس کے لیے ایک عیاشی تھی۔ مگر آج تو کم از کم یہ عیاشی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

اماں باہر بیٹھی اپنے امیر بھائیوں کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔ پروا کے دسمبر ٹسٹ ہو رہے تھے...... اور ندیا کو کئی روز سے بخار تھا۔ رات کے لیے دال اور چاول اسے پکانے تھے کل کی دو شلواریں دھلی پڑی تھیں' ان پر استری کرنی تھی۔ راسخ بھیا کی قمیصوں پر بٹن ٹانکنے تھے۔ اس بار پھر دھوبی توڑ لایا تھا اور وہ گھر آتے ہوئے راستہ سے بٹن بھی لیتی آئی تھی۔ پھر کل کے لیے نوٹس تیار کرنے تھے۔

اور اگر اماں حسب معمول ابا کے گھر آتے ہی اپنی طبیعت کی خرابی کی دہائی دینے لگیں اور سر کو باندھ کر بستر میں جا گھسیں تو کام اور بھی بڑھ جائے گا۔ کیونکہ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا' اپنے بھائیوں کو کوس کوس کر جب اماں کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا تو وہ اپنی تیرہ بختی کا مرکز ابا کو بنا کر خوب آڑے ہاتھوں لیتی تھیں۔ ابا' جو دیانت دار تھے...... شریف النفس تھے...... محنتی تھے اور جو ابھی تک نہر کے محکمے میں کلاس ٹو کے افسر تھے۔ اس سے اونچا اڑنے کی استطاعت نہیں تھی اور نہ ہی تاب تھی۔

چار بچے تھے' بڑے بیٹے راسخ کو انہوں نے ایم اے کرا دیا تھا' اب وہ ان کا بوجھ بانٹنے کے قابل ہو گیا تھا' بلکہ وہ تو بے چارا بی اے سے ہی ٹیوشن کر کے اپنا خرچہ اٹھا رہا تھا۔ اب فیضا ایم اے میں پہنچ گئی تھی۔ خیال تھا وہ بھی نوکری کر کے اس گاڑی کو ایندھن مہیا کرنے لگ جائے گی۔ درمیانی پروا اپنے شوق سے ایف ایس سی کر رہی تھی۔ کیونکہ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ اور ندیا تو ابھی میٹرک میں تھی۔

شہنشاہ سے گدا تک...... زندگی تو ہر ایک کی گزرتی چلی جاتی ہے' ٹھہر نہیں جاتی۔

وہ لوگ امیر نہیں تھے۔ کروڑوں متوسط لوگوں میں سے تھے' کبھی اچھا کھا لیا' کبھی برا...... کبھی اچھا پہن لیا...... کبھی برا...... کبھی ہنس دیئے' کبھی رو دیئے۔

''محرومیوں پر کڑھتے اور خوبصورت امیدوں پر جیتے وہ زندگی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اماں اپنے سے کمتر ہزاروں' سینکڑوں کو تو دیکھتی نہیں تھی۔ مگر اپنے سے ہر اچھے پر ان کی نظر جاتی تھی اور پھر انہیں یہ تقسیم اللہ کی نہیں اپنے بھائیوں کی لگتی تھی جو اچھے اچھے عہدوں پر تھے۔

ذاتی کوٹھیوں کے مالک تھے' دو دو کاریں رکھ چھوڑی تھیں' عیش کرتے تھے' بے حس تھے اور اپنے عیش کا ذرا سا حصہ بھی بہن کے

نام نہ کرتے تھے۔

رائخ تو خیر اپنے باپ کی طرح کم گو اور محنتی آدمی تھا اس لیے وہ اماں سے الجھتا نہیں تھا۔ مگر فیضا تو اماں کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ آخر اماں اپنے مقدر سے سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتیں۔ چوبیس سال ہو گئے اماں حالات کی عادی نہیں ہوئیں۔ دوسروں کی روشنی سے اپنا گھر منور نہیں ہوتا۔ اگر یہ تقسیم خدا کی ہے تو اس پر قناعت کا پردہ ڈال دینا چاہیے۔ مگر جب اماں شروع ہو جاتیں تو خواہ مخواہ تینوں ماموؤں کو رگید کر رکھ دیتیں۔ حالانکہ تینوں بڑے شفیق تھے....... اچھے تھے۔ وقت بے وقت مدد بھی کرتے تھے۔ زیادہ آ جا نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ان کی زندگی کی مصروفیات ہی اس قسم کی تھیں اور اماں نے ناحق ضد میں آ کر آنا جانا بند کر رکھا تھا۔ یوں تو خوشی غمی کبھی کبھار شامل ہو جاتیں۔ مگر بچوں کو تو بالکل وہاں نہ بھیجتیں۔

اب اس سے زیادہ کسی سے توقع رکھنا ہی فضول تھا۔ جانے اماں اور کیا چاہتی تھیں پھر آج کے ان کوسنوں کا مدعا کیا تھا۔

وہ یونہی اداس سی چولہے کے قریب بیٹھی اپنی سوچوں میں کھوئی تھی کہ اماں خلاف توقع باورچی خانے میں آ گئیں۔ اس نے اماں کے آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ بس ویسے ہی بیٹھی باورچی خانے کے فرش پر گرے ہوئے پانی کو تنکے سے موتی بناتی رہی۔

اماں نے اس کے موڈ کو بھانپ لیا تھا۔ شاید اماں کی بے وجہ پھٹکار اس کو بری لگی تھی دراصل اماں اپنے بچوں میں فیضا کو بہت چاہتی تھیں باوجود اس کے فیضا انہیں ہر وقت ٹوکا کرتی تھی۔ انہیں فیضا کی عقل پر بہت بھروسہ تھا اور اکثر وہ اچھے موڈ میں اس بات کا اعتراف بھی کیا کرتی تھیں۔ اماں پیڑھی لے کر اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

فیضا نے پھر بھی سر نہ اٹھایا' تو بولیں۔

''فیضی تو نے کھانا کھا لیا ہے۔''

''جی اماں'' فیضا نے افسردگی سے کہا۔

''وہ تو حجن آپا نے ایسی بات چھیڑ دی کہ مجھے خواہ مخواہ تاؤ آ گیا' ورنہ تو تو جانتی ہے میں کب ان باتوں کی پرواہ کرتی ہوں۔''

''جی ہاں' جل جل کے آپ نے اپنی صحت تباہ کر لی ہے' آپ کب پرواہ کرتی ہیں۔'' مگر فیضا نے دانستہ طور پر نہ پوچھا کہ وہ کون سی بات تھی۔

''پرویز بھائی کا لڑکا امریکہ سے پلٹ آیا ہے نا؟........ وہ........ کیا بھلا سا نام ہے اس کا ہاں' تبریز ہی ہے نا؟''

''تو وہ بھائی گلریز کی بیٹی کے لیے گئے تھے۔''

''تو کیا ہوا......'' فیضا نے اور بھی ناگواری سے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا؟ میری تو جوتی کو بھی پرواہ نہیں ہے مگر یہ بی جن کہنے آئی تھیں کہ تم اپنی بیٹی کے لیے کہلواؤ۔ میں نے کہا کیا وہ اندھے ہیں ان کو خود نہیں دکھتا۔''

''اماں......'' فیضا ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ ''خدا کے لیے اپنی زبان بند رکھئے آپ جانتی ہیں میں خاندان کے سب لڑکوں کو ناپسند کرتی ہوں۔ ان کے اور ہمارے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا کے لیے اماں کوئی بھی غلط بات منہ سے نہ نکالیئے۔''

''غلط بات......'' اماں نے یوں زہر بھری آنکھوں سے فیضا کی جانب دیکھا جیسے اس کے ماتھے پر چٹا دے ماریں گی۔ مگر فیضا بل کھا کے باورچی خانے سے باہر نکل چکی تھی۔

''ارے...... ارے...... یہ...... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔'' اماں بی نے اپنی عینک آنکھوں پر درست کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میں ٹھیک طرح سے دیکھ رہی ہوں...... یا یہ بھی کوئی سپنے کا منظر ہے۔''

''اسلام علیکم آنٹی......'' ایک بھاری سی آواز آئی۔

''وعلیکم السلام...... جیتے رہو...... عمر دراز ہو...... آج کیسے بھول پڑے' پھوپھی کیسے یاد آ گئی...... اماں باوا نے اجازت دے دی کیا۔''

مشین چلاتی ہوئی فیضا کے ہاتھ رک گئے' دوپہر سے بیٹھی وہ اپنی قمیض سی رہی تھی۔ آج اتوار تھا...... نہائی تھی۔ مگر ڈھنگ سے چوٹی گوندھنے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔ دو چار بل دے کر وہ مشین پر جت گئی تھی۔ ویسے ہی ہاتھ روک کے اس نے مڑ کر دیکھا۔ ان کے برآمدے میں تبریز کھڑا تھا۔

ہاں...... ہاں...... غالباً وہ تبریز ہی تھا' منجھلے ماموں کا بیٹا' شاید سات سال امریکہ رہ کر واپس آیا تھا' سات سال پہلے کی مبہم یادیں اس کے تصور میں لہرانے لگیں' سوئی میں دھاگا پرو کے اس نے حسب عادت ہونٹوں میں دبائی ہوئی تھی...... اور اسی انداز میں اسے اپنی ماں سے ملتے دیکھے جا رہی تھی......!

اونہہ...... تو کوئی خاص پرسنلٹی نہیں بنی تھی' گئے تھے تو رنگ خاصا کالا تھا۔ بس سات سال میں ذرا سی کالک اتر گئی تھی' یعنی

سانولے ہو گئے تھے' بال آج کل کے فیشن کے مطابق بڑھائے ہوئے تھے۔ چوڑی چوڑی قلمیں رکھی ہوئی تھیں' ہاں آنکھوں پر موٹے فریم کی عینک کا اضافہ ہو گیا تھا!

شاید فلمیں دیکھ دیکھ کر نظریں کمزور ہو گئی تھیں یا شاید اپنی اماں کا اثر تھا' قد بھی کوئی خاص نہیں نکالا تھا۔ حالانکہ منجھلے ماموں خوب لمبے چوڑے تھے۔ کمر سے بہت تنگ مگر کھلی مہری کی پتلون اوپر چوڑی سی بیلٹ' سر پر بالوں کا جنگل' وہی حلیہ جو آج کل امریکہ پلٹ نوجوانوں کا ہونا چاہیے۔

''تو یہ ہیں حضرت تبریز۔۔۔۔۔۔ جن کے لیے خاندان کی لڑکیوں کا سوئمبر رچایا جا رہا ہے۔'' طنز کے پتھر برسانے کے بعد اماں اسے کلیجے سے لگا کر پیار کر رہی تھیں۔

فیضا پہلے کی طرح پھر مشین چلانے میں مگن ہو گئی۔ نہ وہ امپریس ہوئی تھی۔ اور نہ اسے تبریز کی ذات سے دلچسپی تھی۔ اس حلیے کے لڑکے اسے یونیورسٹی میں بھی پسند نہیں آئے تھے۔

جن کی تصدیق کرنے کے لیے انہیں ہمیشہ سامنے سے آ کر دیکھنا پڑتا تھا۔ ورنہ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ شادی کے بعد لڑکیاں جانے کیا محسوس کرتی ہوں گی۔ میاں بھی گیسو دراز خاں اور بیوی بھی کاکل بدوش ۔۔۔۔۔۔ دونوں کو بال سکھانے کے لیے ہیئر ڈرائیر کی ضرورت پڑتی ہو گی۔ ورنہ وقت تو ایک جتنا صرف ہوتا ہو گا۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔۔ وہ اس قسم کے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہوئے کلاس میں بھی نہیں شرماتی تھی۔ سو تبریز کو دیکھ کر اسے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی ۔۔۔۔۔۔ اتنا بڑا جنگل اس نے سر پر اگا رکھا تھا کہ جس کی شاخیں رخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں' ویسے ہی سوکھا مارا سا ہے ذرا پرسنلٹی بنانے کے لیے بالوں کا سہارا لے رکھا ہے اور پھر اوپر سے امریکہ پلٹ بھی ہے۔ یعنی ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔

ہاں انسان اپنے ماحول کا غلام ہوتا ہے۔

وہ سوچنے لگی ہم لوگ ان کی سوچوں تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی ان کے اطوار ہی اپنا سکتے ہیں۔ حالات اور ماحول نے جو کچھ انہیں عطا کیا ہے۔۔۔۔۔۔ یا سکھایا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ ہمیں نہیں۔۔۔۔۔۔ اس لیے خواہ مخواہ جلنے کڑھنے اور نام دھرنے کا بھی فائدہ نہیں ہو گا اور یوں آگے پیچھے پھرنے سے بھی عزت نفس مجروح ہو گی۔

وہ مشین پر ہاتھ تیز تیز چلانے لگی۔ شام اتر آئی تھی اور ابھی اس نے شلوار کے پائنچے بھی بنانے تھے۔ جانے اماں نے اور کیسے کیسے اوچھے وار کیے ہوں گے۔ وہ تو مشین کی گڑگڑاہٹ میں کھو چکی تھی۔ جب اماں کی دو تین آوازوں پر وہ چونکی اور مڑ کر دیکھا تو اماں

اور تبریز دونوں اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

''مشین ہی چلا رہی ہے نا؟ وظیفہ تو نہیں پڑھ رہی کہ بولنا ہی نہیں۔'' اماں نے جھاڑا یہ تیرا بھائی کب سے آیا کھڑا ہے۔ آ کے مل تو سہی۔'' پھر اماں لگاوٹ پر آ گئیں۔

''او....... تبریز بھائی....... السلام علیکم.......'' اس نے جلدی سے سلام کر دیا ''میں نے آپ کو دیکھ تو لیا تھا مگر بولی اس لیے نہیں کہ ممکن ہے آپ پہچانے ہی نہیں۔''

''ہاں میں شاید تمہیں نہ پہچانتا مگر آنٹی نے بتا دیا کہ یہ....... تم ہو۔''

(ہوں۔ تو پھوپھی سے آنٹی ہو گئیں۔)

''چھوٹوں کو آخر بڑا ہونا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ آپ جتنے بڑے نہ ہو پائیں۔''

''میں کہاں بڑا ہوا ہوں....... دیکھو تو.......!'' اس نے اپنے قد کی طرف اشارہ کیا ''ڈیڈی سے تو کتنا چھوٹا رہ گیا ہوں۔''

''اے بھائی کو چائے پلواؤ گی یا باتیں کیے جاؤ گی۔''

''آنٹی اگر یہ کوئی ضروری کام کر رہی ہے تو اسے مت اٹھائیں۔'' تبریز نے بڑی رعونت سے کہا۔

''ہاں کام تو بہت ضروری ہے۔ صبح میں نے یہ قمیض یونیورسٹی پہن کر جانا ہے۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے ذرا ختم کر لوں۔''

''ارے کوئی اور پہن لینا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''میرے پاس اتنی قمیضیں کہاں ہیں تبریز بھائی' کل اپنی پسند کا کپڑا لائی تھی اور سہیلیوں سے شرط لگا کر آئی تھی کہ آج ضرور سی لوں گی اگر ابھی سی کر صبح نہ پہن لی تو دل مچلتا رہے گا۔''

''آخر تم درزی سے کیوں نہیں سلواتیں۔''

''میں درزی کی سلائی نہیں دے سکتی۔ آج کل تو قمیض کے مول سلائی ہے۔''

''او.......'' تبریز نے کار کی چابی کا چھلا گھماتے ہوئے کہا:

''کیا فضول جھک جھک لگا رکھی ہے' اٹھ کے چائے بنا.......'' اماں کو اس کا یوں بے دھڑک بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''دیکھوں تو....... تم کیسا سیتی ہو۔'' وہ فضا کے چہرے کے بالکل قریب چہرہ لا کر غور سے سوئی میں پھنسی ہوئی قمیض دیکھنے لگا۔

''اچھا ہی سی لیتی ہوں۔'' فیضا نے ناک سکوڑ کر کہا ''اللہ ذرا دور ہو کر بیٹھیں' مجھے سگریٹ کی بو اچھی نہیں لگتی۔''

''اُفوہ! ہمارے ملک کی لڑکیاں اب تک کس قدر پیچھے ہیں۔''

''گاڑی کے پیچھے' موٹر کے پیچھے' یا آپ کے پیچھے ہیں؟'' فیضا کے لہجے میں جو چبھن تھی اسے تبریز نے اچھی طرح محسوس کر لیا۔ ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''آنٹی اب میں چلتا ہوں۔''

''بیٹے چائے تو پی جاؤ۔'' اماں محبت سے بولیں' برسوں بعد آئے ہو اور اب ایسے ہی جا رہے ہو۔''

''نہیں آنٹی....... میں ممی اور ڈیڈی کو بتائے بغیر ہی آ گیا تھا۔ وہ سوچتے ہوں گے جانے کہاں چلا گیا' ڈیڈی کو کہیں موٹر کی ضرورت نہ ہو۔''

''ہاں' ہاں تو کہیں دشمنوں کے ہاں تو نہیں آ گیا۔ میرا تیرا بھی خون کا رشتہ ہے۔ اس جرم میں تیرا باپ تجھے گھر سے نہیں نکال دے گا۔'' اماں بی کا پارہ پھر چڑھنے لگا۔ ''ایک پیالی چائے پینے سے کون سا ظلم ہو جائے گا۔''

''رہنے بھی دو اماں۔'' فیضا نے ہاتھ روک کر کہا ''ٹھیک کہہ رہے ہیں آج نہ سہی پھر کبھی چائے پی لیں گے۔ پھر آ جائیں گے۔ آج کوئی مجبوری ہو گی۔''

''ویری پریکٹیکل....... یہ ہوئی نہ بات۔'' تبریز خوش دلی سے بولا:

''پھر کبھی آ کر ضرور چائے پی لوں گا' آج تو بس میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ اس روز ممی اور ڈیڈی نے میرے اعزاز میں اتنا بڑا ڈنر دیا' سب لوگ آئے تھے۔ آخر آپ لوگوں میں سے کیوں کوئی نہ آیا؟''

فیضا نے جھٹ تہدیدی نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا' مبادہ وہ کوئی بودی بات منہ سے نکال دیں۔ غالباً وہ فیضا کی نظروں کا مطلب سمجھ گئی تھیں۔ اسے لیے تھکی تھکی آواز میں بولیں۔

''بس بیٹا....... اس روز میرا جی اچھا نہیں تھا' کچھ مجھے بلڈ پریشر کی تکلیف ہو گئی تھی ایسے میں میں ہنگاموں سے گھبراتی ہوں' کسی دن آ جاؤں گی' تیری ماں کو مبارکباد دینے۔''

''اور محترمہ تم....... تمہارے پاس کیا عذر ہے۔'' وہ بدتمیزوں کی طرح کھڑے کھڑے بولا۔

''بھئی میرا کیا عذر ہو گا....... یہی نا کہ....... اس روز بھی میرے پاس کوئی نئی قمیض سلی ہوئی نہیں تھی۔''

"ہاہاہا۔" اس نے تمسخرانہ قہقہہ لگایا۔ "میں جانتا تھا اور خوب جانتا تھا.......!"

"اچھا آنٹی....... خدا حافظ۔"

"بائے فیضا....... چائے ادھار رہی تم پر۔" وہ چابی گھماتا ہوا سیٹی بجاتا باہر نکل گیا.......!

"ہوں! تو بات تمہاری کس کے ساتھ طے ہوئی آخر.......!" اماں بی نے عینک کو آنکھوں پر درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بتائیں کون سی اچھی ہے؟"

"اب میں کیا جانوں بھلا....... ؟ میرا کون سا ان سے اتنا ملنا جلنا ہے۔" کافی دنوں بعد جب تبریز آیا تو اماں نے حسب عادت اونگھ سونگھ لینا شروع کر دی۔ اتنے میں فیضا چائے بنا کر لے آئی۔

"بہت دنوں بعد آئے تبریز بھائی.......؟"

"بھئی وہ بھی اس لیے آ گیا ہوں کہ تم نے کہا تھا پھر کبھی آ کر چائے پی لیجیے گا۔" میں نے سوچا اگر تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے نہ پی سکا' تو تمہیں کتنا رنج ہو گا' اس لیے آ گیا۔"

"ارے....... اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھے رنج نہیں ہوتا تبریز بھائی! مجھے تو سچی بھول بھی گیا تھا کہ میں نے آپ کو بھی ایسی پیشکش کی تھی۔"

"اچھا تو....... اس کا مطلب ہے کہ تمہارا حافظہ بھی کمزور ہے۔"

"جی نہیں....... میں تو اپنی کلاس کی ذہین ترین لڑکی ہوں اور پہلی جماعت سے لے کر اب تک ہمیشہ فرسٹ آتی رہی ہوں۔"

"فرسٹ آنا تو ذہانت کی نشانی نہیں ہے۔ اس ملک میں ہمیشہ رٹو طوطے ہی فرسٹ آ جاتے ہیں' خواہ انہیں بات کرنے کا ڈھنگ بھی نہ آتا ہو۔"

"جناب......." فیضا نے لمبی سانس چھوڑی....... "یہی تو مزہ ہے کہ میں رٹو طوطا بھی نہیں ہوں۔ پوری کتابیں بھی نہیں ہوتیں میرے پاس....... کئی بار کلاس بھی چھوڑ دیتی ہوں' موڈ نہ ہو تو نوٹس بھی نہیں بناتی۔ اس کے باوجود بس ایک بار توجہ سے ایک چیز پڑھ لیتی ہوں اور ساری کلاس سے زیادہ نمبر لے جاتی ہوں۔ اسی کو ذہانت کہتے ہیں....... رہا بات کرنے کا ڈھنگ تو کر کے دیکھ لیجیے نا....... ؟ انگریزی آپ سے تو کم از کم اچھی بول سکتی ہوں' یہ اور بات ہے بولتے وقت ناک میں سے آواز نہیں نکالتی' ویسے آپ کو بتاتی چلوں اس وقت میں یونیورسٹی کی سب سے اچھی ڈی بیٹر ہوں۔"

''تو بھی....... یہ اتنا لمبا چوڑا لیکچر جھاڑنے کی کیا ضرورت ہے میرے سامنے اپنی کوالیفکیشن بنوائے جا رہی ہو....... کیا مجھے امپریس کرنا چاہتی ہو.......''

''امپریس.......؟ اور آپ کو.......؟'' فیضا کھلکھلا کر ہنس پڑی....... ''امپریس تو ان کو کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے آدمی خود متاثر ہو جائے' آپ نے تو سات سال بعد واپس آ کر بھی مجھے مایوس کیا ہے۔''

''ہوں.......؟'' ایک معنی خیز ہوں کے ساتھ تبریز نے چائے کی پیالی منہ سے لگائی....... ''ہاں....... تو تمہیں یہ بھول ہی گیا تھا کہ تم نے مجھے چائے کے لیے کہا ہے.......'' تھوڑی دیر بعد تبریز نے پھر پوچھا۔

''جی ہاں! میں غیر اہم باتیں فوراً ذہن سے نکال دیتی ہوں' خواہ مخواہ انرجی ضائع ہوتی ہے رات سونے سے پہلے اپنا ذہن و دل بالکل صاف کر لیتی ہوں' پھر دوسری صبح ہشاش بشاش اٹھتی ہوں' دیکھتے نہیں میں کتنی شگفتہ اور صحت مند دکھائی دیتی ہوں اور زندگی کے متعلق بھی میرے نظریات بڑے صاف ستھرے اور صحت مند ہیں' چائے پینا کوئی اتنا اہم نہیں تھا۔ نہ آپ کے لیے اور نہ میرے لیے....... جو میں اس پر کڑھ کڑھ کر ہی جان جلائے جاتی۔'' اس نے چائے کی دوسری پیالی بنا کر تبریز کو پکڑائی۔

''تم اپنے متعلق کافی خوش فہمی میں مبتلا ہو فیضا۔'' تبریز نے طنز سے کہا.......! فیضا کھلکھلا ہنس پڑی۔

زندگی کے لیے یہ خوش فہمی بہت ضروری ہوتی ہے مائی ڈیئر کزن۔'' اس نے بڑے اعتماد سے تبریز کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

''اور پھر غریب کے پاس تو یہی خوش فہمی سرمایا ہوتی ہے آخر زندہ رہنے کے لیے....... اور ٹھیک طرح زندہ رہنے کے لیے کچھ تو چاہیے نا۔''

''فیضا.......'' سوئی میں دھاگا پروتی ہوئی اماں نے فیضا کو گھورا.......! ان کو پسند نہیں تھا کسی بھی طرح فیضا اپنی غربت پر سے پردہ اٹھائے.......!

''یہ ذرا سوئی میں دھاگہ تو ڈال دو.......'' وہ جب آگے ہوئی تو اماں نے دبی آواز میں کہا ''فضول بک بک نہ کیا کرو۔''

فیضا ہنستی ہوئی پلٹ آئی۔

''اچھا....... اگر تم ذہین ترین لڑکی ہو تو مجھے ایک مشورہ دو۔'' تبریز نے چائے ختم کر کے پیالی رکھی اور لائٹر نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

''لیجیے مشورہ مفت۔''

''گلریز چچا کی لڑکیوں میں سے سب سے بہتر کون ہے؟''

''سب سے بہتر۔''

''ہاں...... میرے لیے۔''

''آپ کے لیے...... میرا تو خیال ہے کہ تینوں ہی ٹھیک ہیں......!!''

''یعنی بیک وقت۔''

''نان سینس......'' وہ زور سے ہنس پڑی۔

''میرا مطلب ہے ان کی تینوں لڑکیاں پیاری ہیں' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سوشل ہیں۔

''ماں باپ نے بے حد آزاد جو رکھ چھوڑا ہے۔'' اماں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''اماں......'' فیضا نے ان کو ٹوکا۔ ''آپ چائے لیں گی۔''

''دے دے......'' انہوں نے ناگواری سے کہا۔

''عاصمہ آپا تو بہت خوبصورت ہیں۔'' فیضا نے ماں کو چائے دے کر دوبارہ کہنا شروع کیا ''ٹی وی کے ہر ڈرامے کی وہ ہیروئن ہوتی ہیں' انہیں لوگ پسند کرتے ہیں' آپ کے لیے بہت موزوں بھی ہیں۔''

''موئی کی روز ٹی وی پر ایک شادی ہوتی ہے۔'' اماں نے لمبا سا گھونٹ نگل کر کہا۔

''اچھا تو کاظمہ کیسی ہے' عاصمہ کے متعلق تو میں اس لیے نہیں سوچ رہا کہ مجھ سے بس ایک سال چھوٹی ہے' فرق ذرا زیادہ ہونا چاہیے۔ ورنہ شوہر کا رعب نہیں رہتا۔''

''اچھا تو شوہر کا رعب وداب صرف دو سال کے فرق سے پڑتا ہے' جی نہیں...... اس کے کردار اور کیلی بر Calibre سے پڑتا ہے۔''

''اچھا تم میری نانی اماں نہ بنو۔ مشورہ دو کاظمہ اور صائمہ میں سے کون سی بہتر ہے۔''

''بڑے چالاک ہیں آپ...... آپ مجھ سے اس طرح پوچھ رہے ہیں۔ جیسے ان سے میری شادی ہونی ہے۔''

''فیضا......'' اماں نے پھر ٹوکا...... ''ڈھنگ سے بات کرو۔''

''مجھے تو تینوں اچھی لگتی ہیں۔ تبریز بھائی۔'' فیضا نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''ہاں کاظمہ میرے ساتھ سکول میں پڑھتی تھی۔

اس لیے اس کے ساتھ میری دوستی بھی ہے۔ کاظمہ بہت اچھی عادات کی مالک ہے' ویسے تو صائمہ بھی اچھی ہے۔ مگر اس کا قد ذرا چھوٹا ہے۔"

"ہاں میں کاظمہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"سوچ کیا رہے ہیں ہاں کہہ دیجئے نا وہ تو چیمپئن بھی ہے۔"

"ہاں ہاں کلب میں جا کر وہ ورنج سکوائش کے....... وہ کیا بلا ہوتی ہے وہی کھیلتی ہے لڑکوں کے ساتھ' اخباروں میں تصویریں چھپتی ہیں اور چٹیاں کٹوا کر ماہی منڈی بنی پھرتی ہے۔"

"اماں....... وہ تو سکوائش ایک کھیل کا نام ہے اور آپ کو ان کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ جس ماحول میں کاظمہ وغیرہ رہتی ہیں۔ اس میں یہ باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں ماحول اور حیثیت کا انسان کے کردار پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ فاصلے پر رہ کر جو باتیں ہمیں معیوب لگتی ہیں' واقعی وہ اتنی ہی معیوب ہوں۔"

"چل رہی....... دو دن کی چھوکری ہو کر مجھے سمجھانے چلی ہے' وہ کیا ہیں اور ہم کیا ہیں۔ چمڑی تو ایک ہی ہے۔ دمڑی میں وہ آگے نکل گئے تو کیا ہوا انسان کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔" اماں فیضا کے لتے لینے لگیں اور تبریز موقع پا کر کھسک گیا۔

"آنا شروع ہوئے تو باری کے بخار کی طرح آتے چلے گئے۔ نہیں آئے تو پھر ایسے بھولے کہ جیسے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔"

"بھئی تمہارے گھر کیا آؤں۔ تم لوگ تو انتہائی دقیانوسی اور بور ہو نہ کہیں آؤٹنگ کے لیے جاتے ہو' نہ پکچرز دیکھتے ہو نہ گھر میں کوئی کھیل شروع کر رکھا ہے نہ ٹی وی ہے۔ تو شام بھلا آپ لوگوں کے ساتھ کیسے گزاری جائے....... ؟ وہ راسخ ہے۔ وہ تو کتابوں کے عشق میں مبتلا رہتا ہے۔ بڈھی روح۔ چھوٹی بہنیں تمہاری شام کو غائب ہوتی ہیں' رہ گئیں تم....... ؟ تو جب میں آؤں تمہیں چولہے چوکے سے ہی فرصت نہیں ہوتی' ساتھ ساتھ پیاز کاٹتی جاتی ہو' ساتھ ساتھ باتیں کرتی جاتی ہو۔ میں سخت بے زار ہوتا ہوں۔"

فیضا اپنی عادت کے مطابق مسکرائی "آپ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں تبریز بھائی ہم لوگ واقعی بڑے بور ہیں۔ لیکن بات حقیقت میں یہ ہے کہ ہم سب مل کر زندگی کی گاڑی کھینچ رہے ہیں۔ راسخ بھیا یونیورسٹی سے آنے کے بعد....... شام کو لاء کی کلاسز اٹینڈ کرتے ہیں۔ شاید ان کے لاشعور میں کہیں یہ دبی ہوئی خواہش ہے کہ وہ اپنے ماموں کے نقش قدم پر چلیں اس لیے وکالت پاس کرنا چاہتے ہیں۔ پروا اور ندیا بھی شام کی کلاسز میں جاتی ہیں اس لیے کہ دوپہر کو گھر کا کام وغیرہ کرنے کے لیے ہمارے ہاں کوئی نوکر نہیں ہے۔ اماں کی صحت اس قابل نہیں کہ وہ گھرداری کر سکیں' ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا کام پروا اور ندیا مل کر لیتی ہیں۔ پھر وہ سکول چلی جاتی

ہیں اور رات کا سارا کام اور شام کی چائے وغیرہ میں آ کر سنبھال لیتی ہوں' ابا بے چارے تو اس گھر میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس قدر تھک کر آتے ہیں دفتر سے آتے ہی اپنے کمرے میں بند ہو جاتے ہیں وہاں انہیں اخبار' حقہ اور ریڈیو کے علاوہ کسی شے کی ضرورت نہیں ہوتی رہ گئیں اماں اور میں .... تو واقعی ہم دونوں کے ساتھ روز روز وقت گزارنا جھک مارنا ہی تو ہے جب کہ مجھے رات کا کھانا بنانے کی جلدی بھی ہوتی ہے۔ بتایئے تو ایسے میں ٹی وی رکھنے کی حسرت کس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور تفریحات کا ہوش کسے رہتا ہوگا۔ ویسے آپ کاظمہ وغیرہ کے ہاں کیوں نہیں چلے جایا کرتے۔"

"وہاں تو میں سارا دن ہی رہتا ہوں' پکچرز وغیرہ انہی کے ساتھ دیکھتا ہوں' جس دن ان لوگوں کا کوئی الگ سے پروگرام ہو' تو تمہاری طرف چلا آتا ہوں۔ تمہاری عقل پر مجھے ویسے بہت افسوس ہوتا ہے اگر تم نے اس عمر میں لائف انجوائے نہ کی تو پھر تمہاری تعلیم کا کیا فائدہ ہوا۔"

"مڈل کلاس کی لڑکیاں لائف انجوائے نہیں کرتیں' وہ صرف زندگی بسر کرتی ہیں......."

"چ چ چ .... وہ ترس کرنے لگا .... ہاؤ سیڈ! مجھے پاکستانی لڑکیوں پر بڑا ترس آتا ہے .... بے چاری تعلیم حاصل کرنے کے باوجود جاہل رہتی ہیں۔"

"بھائی صاحب! آپ کافی عرصہ باہر رہ کر آئے ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہماری حالت پر افسوس کر کے جلدی لوٹ جائیں۔"

"ہاں میرا تو یہاں ایک پل دل نہیں لگتا۔ مگر ڈیڈی نے جو یہ شادی کی رٹ لگا دی ہے تو کیا کروں۔ اب تو شادی کر کے ہی جانا پڑے گا۔"

"تو کر لیجیے جلدی سے .... دیر کاہے کی ہے۔"

دیر تو بس بزرگوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ میں نے تو اپنا ارادہ ظاہر کر دیا ہے .... اچھا مجھے یہ بتاؤ فیضی! تمہارا واقعی شام کو کبھی باہر جانے کو جی نہیں کرتا۔"

"باہر کہاں .... سڑک پر (سڑک کی دھول پھانک پھانک کر تو میں دوپہر کو گھر آتی ہوں۔"

"میرا مطلب ہے' پکچر پر یا ہوٹل وغیرہ میں .... دل تو کرتا ہوگا تمہارا' کبھی گئی بھی ہو' کراچی کے ہوٹل دیکھے ہیں یا نہیں؟"

"بھئی کبھی کبھار .... سال دو سال میں جب راسخ بھیا موڈ میں ہوں' آئس کریم کھلانے لے جاتے ہیں جن کے گھر میں فالتو

پکتا ہو ہوٹلوں میں تو وہ جاتے ہیں۔ ہم لوگ تو بڑے شوق سے پکاتے ہیں اور پیٹ بھر کر کھا لیتے ہیں۔"

"اچھا چلو میں تمہیں کسی دن کسی ریستوران میں لے چلوں۔"

"جی نہیں....... کسی نے دیکھ لیا تو میرے پیچھے دم لگا دے گا۔"

"کیوں کیا میں تمہارا بھائی نہیں لگتا۔"

"بے شک بھائی ہیں' مگر کیا آپ کی پیشانی پر لکھا ہے کہ آپ میرے بھائی ہیں۔ پتہ ہے آپ کو آج کل کی لڑکیاں جب اپنے بوائے فرینڈز کا تعارف کراتی ہیں تو کہتی ہیں "میٹ مائی کزن" یا "میٹ مائی برادر" اب بتایئے جو کوئی مل گیا تو میں کیا کہہ کر آپ کا تعارف کراؤں گی۔"

"بھئی تم سیدھے سیدھے کہہ دینا کہ "میٹ مائی......."

"ارے تبریز آیا ہوا ہے۔" اماں ایک دم اندر سے نکل کر ان کے سروں پر آ کھڑی ہوئی تھیں "مجھے تو خبر ہی نہ ہوئی' تبھی سوچ رہی تھی کہ یہ فیضا کی زبان کیوں قینچی کی طرح چل رہی ہے۔"

"اماں زبان ہی نہیں چل رہی' دیکھو تو ہاتھ بھی چل رہے ہیں۔ سارے مٹروں کے دانے نکال دیئے ہیں میں نے' اور یہ تبریز بھائی مٹروں کے دانے اٹھا اٹھا کر کھائے جا رہے ہیں' خدا جانے امریکہ میں بے چارے گھاس کھاتے رہے ہیں۔"

"آنٹی اس نے تو مجھے چائے کے لیے کہا ہی نہیں۔"

"اور اماں بی! یہ ابھی کہہ رہے تھے' چلو تمہیں کسی ہوٹل سے چائے پلوا لاؤں۔"

"نہیں بیٹا' ہماری لڑکیاں ہوٹلوں وغیرہ میں جانے کی عادی نہیں ہیں......."

"اچھا تم بیٹھو میں ہی چائے بنا لاتی ہوں۔" اماں الٹے پاؤں لوٹ گئیں.......!

"آج تم کیا پکاؤ گی۔"

"مٹر اور قیمہ پکاؤں گی۔"

"بس......."

"بس......." فیضا ہنسنے لگی "آپ کو یہ باتیں تو بہت عجیب لگتی ہوں' مگر نفس کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے پیٹ کا غلام نہیں بنانا چاہیے۔"

''اچھا بتاؤ کیا تمہیں سب پاکستانی کھانے پکانے آتے ہیں۔''

''ہاں.......''

''سبھی.......''

''ہاں بھئی' پاکستانی کھانے پکانے مشکل تو نہیں ہیں' مصالحہ جات تو تقریباً ایک سے ہوتے ہیں' بس ذرا ہاتھ کا فرق پڑ جاتا ہے۔''

''اچھا بتاؤ تم سبزیاں پکا لیتی ہو۔''

''کیوں نہیں....... سبزیاں تو مجھے چار پانچ قسموں کی پکانی آتی ہیں.......''

''مثلاً''

''مثلاً بھنڈی گوشت قیمہ' مصالحے والی سبزیاں....... اور ثابت تلی ہوئی بھنڈیاں اگر آپ پلیٹ میں رکھی ہوئی دیکھیں تو سمجھیں گے کہ ابھی شاخ سے توڑی گئی ہیں' نہ ان کا رنگ بدلا ہوگا' نہ سائز' مگر جب کھائیں گے تو پتہ چلے گا کہ وہ چٹ پٹی ہیں اور گلی ہوئی بھی ہیں۔''

''ہائے میرے تو منہ میں پانی آ گیا۔ مجھے بھنڈیاں بہت پسند ہیں وہاں ہم بہت سارے دوست مل کر سب کھانے پکا لیتے تھے .... مگر بھنڈیاں کوشش کے باوجود کوئی نہیں پکا سکتا تھا۔''

''کبھی آپ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی کھائیں تو.......''

''کھلاؤ نا' آج ہی پکا کر کھلاؤ۔''

''آج کہاں سے لاؤں....... یہ کوئی بھنڈیوں کا موسم ہے اب اپنی انگلیوں کو تو بھنڈیاں بنا نہیں سکتی ہوں۔''

''واہ....... واہ وا....... واہ وا....... ''تبریز سچ مچ جھومنے لگا'' کیا خوبصورت استعمال کیا ہے لیڈی فنگر کا....... آج تمہاری ذہانت کے قائل ہو گئے....... بالکل قائل ہو گئے....... واہ....... واہ۔''

یوں تو جب بھی تبریز چلا آتا اور فیضا کے ساتھ گپ شپ کرنے لگتا۔ بی اماں اس پر کڑی نگاہ رکھتیں۔ بگڑا ہوا بچہ تھا' نہ آنکھ میں شرم نہ لحاظ۔ مگر جب وہ نہیں آتا تھا تو انہیں الجھن سی ہونے لگتی تھی۔ الجھن انہیں فیضا کی بک بک پر بھی بہت ہوتی تھی....... کم بخت جیسے بیٹھی ہوئی ہوتی ویسے بیٹھی رہتی۔ لڑکیاں سو طرح سے بنتی سنورتی ہیں۔ نخرے دکھاتی ہیں' بڑی بڑی باتیں کرتی ہیں' ادا سے مسکراتی ہیں۔ کیا کیا جتن نہیں کرتیں۔

ایک فیضا تھی کہ ہر بات سادگی سے بے دھڑک اگل دیتی اور پھر یونہی ہنسے جاتی باتیں بنائے جاتی۔ اس کی بات کاٹتی جاتی۔ کبھی کبھی تو وہ چڑ بھی جاتا تھا اور پھر دو چار دن نہ آتا' تو اماں پھر اپنے بھائیوں کو بے نطق سنانے لگتیں۔

اس ایک مہینے میں وہ کئی بار آیا تھا۔ سنا تھا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر شادی کر کے واپس چلا جائے گا۔ پھر سنا تھا کہ کاظمہ کے امتحان ہونے والے تھے۔ اس لیے چھٹی لینی پڑ گئی تھی۔

''بھئی کیا کرو گے اس کو ایم اے کا امتحان دلوا کر ایسے ہی لے جاتے۔'' اس روز وہ آیا تو فیضا پوچھ بیٹھی۔

''کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میں تو لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا حامی ہوں......''

''اچھا میں نے سمجھا کہ شاید اب آپ کے خیالات بھی زمانے کے ساتھ بدل گئے ہوں گے۔''

''زمانے کے ساتھ کیا معنی؟''

''بھائی جان آپ دیکھتے نہیں۔ آج کل پھر وہی دور آ رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں' لڑکی زیادہ پڑھی لکھی نہ ہو۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ ایم اے پاس لڑکی مانگتے تھے۔ مگر اب کہتے ہیں' میٹرک پاس ہو...... ایف اے ہو زیادہ سے زیادہ بی اے' ہو بس!''

''اور تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ لڑکی کو ایم اے نہیں کرانا چاہیے۔''

''کیوں......''

''بس جب لڑکی میں بہت سے شعور جاگ اٹھتے ہیں' تو وہ مرد کی غلامی کے اہل نہیں رہتی۔''

''غلامی کیا معنی......؟''

''جناب! اب آپ معصوم بننے کی ایکٹنگ فرما رہے ہیں' تو میں کیا کروں' ہمارا مرد خواہ کتنا بھی آزاد' تعلیم یافتہ اور جدید رجحانات کا حامل ہو' وہ گھر میں بیوی کو صرف بیوی دیکھنا پسند کرتا ہے۔''

''پھر تم کیوں ایم اے کر رہی ہو؟''

''میرے جیسی اور بھی بہت سی لڑکیاں ہوں گی۔ جو مجبوری کے تحت ایم اے کرتی ہیں۔''

''مجبوری......؟...... کون سی مجبوری؟''

''بھئی...... مجھے تو نوکری کرنا ہے۔ گھر کی گاڑی کو ایندھن مہیا کرنا ہے......''

"تب تو تمہاری شادی کا مسئلہ بھی کھٹائی میں پڑا رہے گا۔"

"ہاں پڑا تو رہے گا' یا پھر دو چار سال نوکری کر کے میں کوئی اپنے ہی جیسا سڑیل سا پروفیسر ڈھونڈ لوں گی۔"

"بس اتنا ہی سوچا ہے تم نے اپنے متعلق.......؟"

"اور کیا.......؟ اس سے آگے ایورج لڑکی کی اڑان نہیں ہوتی۔ رومانس' محبت' عشق....... سب خیالی باتیں ہیں۔ جہیز مناسب نہ ہو تو حسین سے حسین لڑکی پڑی سڑتی رہتی ہے' پرواز تو اپنے پروں کی طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔"

"میں اگر تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں؟"

"کیوں.......؟"

"وہاں تمہاری پڑھائی کا بندوبست کر دوں گا۔ اس کے بعد ملازمت دلوا دوں گا۔" "نوکری کرتی رہنا' گھر پیسے بھیجتی رہنا۔"

"جناب یہ نوازش کیوں.......؟"

"بھئی یہاں بھی تو تم نے نوکری ہی کرنی ہے۔ وہاں تعلیم بھی زیادہ ہو جائے گی' پیسے بھی زیادہ ملیں گے اور دنیا بھی دیکھ لوں گی۔"

"اچھا تو مجھے اپنی اور اپنی بیوی کی نوکرانی بنا کر لے جانا چاہتے ہیں۔"

"یہ تم نے کیسے جانا.......؟"

"نئی نویلی دلہن ساتھ ہوگی' خود تو آپ لوگ سیر سپاٹوں میں مگن رہیں گے اور مجھے کہیں گے کہ داخلہ دلوایا ہے' رہنے کو جگہ دی ہے۔ اس کے صلے میں ہمارا کھانا وانا پکایا کرو۔"

تبریز ہنسنے لگا "بہت چالاک ہو تم....... مگر یہ گھرداری تو تم یہاں بھی کرتی ہو تو وہاں کر لو گی تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا؟"

"جی نہیں! میں آپ کی بیوی کی نوکرانی بن کر نہیں جا سکتی۔

"میری بیوی کی بہن بن کر تو جا سکتی ہو نا؟"

"نہیں....... بالکل غلط....... بہن تو بس سگی بہن ہی ہوتی ہے' پھر خواہ مخواہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہو جاؤں گی۔"

"اگر میری بیوی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.......؟"

"اعتراض....... جی ہاں' میں نے اس قسم کے قصے بہت سن رکھے ہیں۔ جب "ہنی مون" پریڈ ختم ہوگا نا....... تو آپ دونوں کی چخ چخ شروع ہو جائے گی۔ روز ایک دوسرے کو برا بھلا کہو گے اور ایک دن ایسا آئے گا جب وہ مجھ سے چڑ جائے گی اور پتہ

ہے کیا الزام لگائے گی مجھ پر۔"

"کیا.......؟"

"کہے گی! آتے ہوئے اپنی معشوقہ کو بھی ساتھ لے آیا ہے' شادی مجھ سے کی ہے اور عشق اس سے کرتا ہے۔"

تبریز اتنی زور سے ہنسا کہ پھر ہنستا ہی چلا گیا" جب سے میں یہاں آ رہا ہوں تم نے آج پہلی مرتبہ بہت مزے کی بات کی ہے۔"

وہ پھر ہنستا چلا گیا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ ...." وہ تھوڑی دیر بعد بولا .... "تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں تم سے عشق کرتا ہوں۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا....... میں نے تو یہ کہا ہے کہ ایک غریب اور ناپسندیدہ لڑکی پر سنگین الزام یہی لگ سکتا ہے۔جس کے بعد وہ صرف ڈوب مرنے کی جگہ ڈھونڈتی ہے۔"

"ویسے تم نے کبھی اپنی صورت آئینے میں دیکھی ہے۔"

ہاں کئی بار دیکھی ہے اور میں بالکل بھی خوبصورت نہیں ہوں۔یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ.......؟ یہ کہ اس صورت پر کون اس قسم کا الزام لگائے گا' یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟"

"ہاں.......!"

"سوسائٹی کے جو الزام ہیں نا؟ وہ شکل و صورت' حسب و نسب یا نیکی و شرافت نہیں دیکھتے' ویسے مجھے یہ بتایئے' کیا ایک مرد صرف خوبصورتی پر ہی مرتا ہے۔"

"مجھے کیا معلوم" وہ بے پرواہی سے بولا "خوبصورتی میں کشش تو ہوتی ہے نا؟"

"میں تو سمجھتی ہوں کہ صحیح مرد ذہانت پر مرتے ہیں۔"

"اچھا تو اب آپ یہ فرمانا چاہ رہی ہیں کہ نصیب دشمناں آپ ذہین بھی ہیں' بھئی یہ تمہیں اچھی غلط فہمی کس نے ڈالی ہے۔"

"کیوں کس نے ڈالی ہے۔بس میں خود جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہو.......؟"

"یہی کہ میرا سوچنے سمجھنے کا پیمانہ اوسط لڑکیوں سے زیادہ گہرا ہے۔"

"ممکن ہے یہ تمہارا خیال ہے۔"

"جی نہیں....... ذرا آپ میری عمر' میری تعلیم کی لڑکیوں سے بات تو کر کے دیکھئے۔ ایسی بونگی لگیں گی آپ کو....... کپڑے زیور اور فلموں کے علاوہ کچھ جانتی ہی نہیں۔"

"اچھا چلو مان لیا کہ تم بڑی ذہین ہو۔ بس یہی مہرہ ہے تمہارے پاس کیا اس کے بل بوتے پر ساری بساط جیت لینا چاہتی ہو۔"

"خیر مجھے اپنے متعلق کوئی کامپلیکس نہیں ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ میں خوبصورت لڑکیوں میں شمار نہیں ہوتی۔ مگر کچھ ایسی بدصورت بھی نہیں ہوں۔ بس ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

تبریز نے معنی خیز انداز میں کھنکار کر گلا صاف کیا:

"اچھا تو اب یہ فلسفہ بگھارا جا رہا ہے۔"

"سچ....... شادی کے بعد خوبصورتی تو بالکل کام نہیں آتی۔ بس پہلے پہلے کی فوں فاں ہے۔ اس کے بعد شوہر کو کہاں فرصت ملتی ہے پلٹ کر بیوی کو دیکھنے کی....... البتہ اس میں اور خوبیاں ہوں تو شوہر متوجہ رہتے ہیں۔"

"یہ سب تم نے کیسے جانا؟"

"میری بے شمار سہیلیاں ہیں۔ ان میں سے کئی کی شادیاں ہو گئی ہیں اور وہ اپنے ازدواجی مسائل میرے ساتھ زیر بحث لاتی رہتی ہیں' تو یوں......."

"اچھا تو یہ ساری غلط فہمیاں تمہاری سہیلیوں کی پیدا کی ہوئی ہیں اور مشورے دینے کے لیے تم کون سی کتاب پڑھتی ہو؟"

"میرے گھر کا ماحول ہی ایک بڑی کتاب ہے۔"

"یعنی......."

"یعنی یہ کہ اماں جی اور ابا میاں کی کبھی ایک دن کے لیے نہیں بنی۔"

"کیوں......."

"بس اماں کو ہمیشہ احساس برتری رہا اپنے میکے کا....... ابا بے چارے غریب گھرانے سے تھے اور پھر بڑے آدمی بھی نہ بن سکے تو اختلاف کی وجوہات نکلتی رہیں....... زندگی گزرتی رہی۔"

"تمہارے خیال میں دونوں میں سے کس کا قصور زیادہ ہوتا تھا۔"

"عام طور پر اماں زیادہ جھگڑا کرتی تھیں۔"

''تو اس سے تم نے کیا سبق سیکھا ہے۔''

''سبق یہ سیکھا ہے کہ لڑکی کو ہمیشہ سوشل بیک گراؤنڈ دیکھ کر شادی کرنی چاہیے۔ نہ تو اپنے سے امیر اور بہت اونچے لوگ پسند کرے اور نہ اپنے سے بہت کمتر شخص سے بیاہ کرے۔ بس جس ماحول میں لڑکی رہتی ہو۔ اسے اسی قسم کے لڑکے سے شادی کرنی چاہیے۔''

''تمہیں معلوم ہے آج کل ہر لڑکی چاہتی ہے کہ وہ کسی بہت بڑے گھر میں بیاہی جائے موٹریں۔ کاریں ہوں۔ کوٹھیاں ہوں .... آن بان ہو.......!''

''ہاں یونیورسٹی میں بھی لڑکیاں اسی قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ بہت بڑا سرکاری افسر ہو یا شہر کا سب سے بڑا صنعت کار۔ مگر لڑکیوں کو یہ سمجھ نہیں آتی کہ زندگی کے اصل مسائل تو شادی کے بعد شروع ہوتے ہیں۔''

''گویا تمہیں سمجھ آتی ہے۔''

''بالکل.......''

''تب تم نے اپنے لیے صرف کسی پروفیسر کی گنجائش رکھ چھوڑی ہے؟''

''توبہ ہے تبریز بھائی....... آپ تو بچ بال کی کھال اتار رہے ہیں' میں نے بر سبیل تذکرہ ایک بات کہہ دی۔ اسی کو پکڑ کر بیٹھ گئے' انسان خواہ کچھ بھی سوچ لے وہ تو اپنی تقدیر کا غلام ہوتا ہے۔ بس جس حال میں بھی ہو۔ اسے حالات سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔''

''ہوں تو یہ سمجھوتے والی بات ذرا میرے دل کو لگی ہے۔''

''ارے فیضا بیٹا ہنڈیا جلنے کی بو آ رہی ہے اور تو حسب عادت باتوں میں گم ہے۔''

''اوہ....... کہہ کر فیضا تو باورچی خانے میں بھاگ گئی اور باقی وقت تبریز کو اماں بی کے ساتھ گزارنا پڑا۔

ایک دن تبریز حسب معمول دندناتا ہوا آیا اور دھپ سے اس کے ساتھ ہی گھاس پر بیٹھ گیا اور بولا:

''میں تمہیں کیسا لگ رہا ہوں۔''

فیضا نے حیران ہو کر اس کی صورت کو اور پھر اس کے سراپے کو دیکھا اور بولی:

''یعنی.......''

''یعنی....... دیکھنے میں'' .... بمع اس جنگل بیابان کے وہ اس کے چہرے کی طرف اشارہ کر کے بولی ''بس ٹھیک ٹھاک ہیں۔ انسان کا بچہ دکھائی دیتے ہیں۔ اب میں مبالغہ تو نہیں کر سکتی نا۔''

''مبالغے سے تمہارا کیا مطلب۔''

''مطلب یہ ہے کہ یہ تو کہنے سے رہی کہ آپ ماشاء اللہ یونان کی دیو مالائی کہانیوں کے ہیرو لگتے ہیں....... شہزادے ہیں .... پرنس ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ بس ایورج ہیں۔''

''ایک تو تمہارے اس ایورج نے مجھے جلا دیا ہے' ہر شے تمہیں ایورج لگتی ہے۔''

''بھئی لگتی ہے تو کہتی ہوں' غیر معمولی چیزیں اور شخصیتیں اپنا آپ خود منواتی ہیں۔ اب آپ کو دیکھ کر خواہ مخواہ دل میں ہلچل بھی نہیں ہونے لگتی کہ میں بات کرنے سے پہلے اپنا منہ لال کر لوں۔''

''تمہیں معلوم ہے امریکہ میں مجھ پر کتنی لڑکیاں مرا کرتی تھیں۔''

''آپ یہ بتائیں کہ آپ کتنوں پر مرتے تھے۔''

تبریز ہنسنے لگا۔ ''ہمیں بھی جو پسند آ جاتی تھی' اس پر مرتے تھے۔''

''اور پھر نئی لڑکی دیکھ کر جی اٹھتے تھے۔''

تبریز دوبارہ ہنسنے لگا۔ پھر اسے اپنی دوستیوں کے قصے مزے لے لے کر سنانے لگا۔

اتنے میں اماں بی ہاتھوں میں سروتا پکڑے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ اماں بی کے آتے ہی تبریز اپنی کارگزاریوں کی داستان انگریزی میں بیان کرنے لگا۔ فیضا اسے گھورتی رہی۔ مگر اسے سمجھ ہی نہیں آئی۔ جانے اماں بی کو برا لگا یا انہیں ویسے ہی کوئی شے یاد آ گئی' جسے لینے وہ اندر چلی گئیں تو فیضا نے برا مان کر کہا۔

''آپ اماں کے آتے ہی انگلش کیوں بولنے لگے۔ بزرگوں کے سامنے اس طرح باتیں کرنا گستاخی لگتا ہے پھر جانے وہ کیا سمجھیں گی؟ کہ ہم کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟''

''کیسی باتیں.......؟'' ذرا کوئی مزے کا قصہ چھیڑو تو بڑی بی پاس آ کر بیٹھ جاتی ہیں' پتہ نہیں انہیں کیا چسکا ہے جوان لوگوں کی باتیں سننے کا۔''

''تبریز بھائی آپ حد سے بڑھتے جا رہے ہیں' آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟''

"ہاں ہاں....... میں اپنی پھوپھی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔"

"آپ میرے سامنے میری ماں کے بارے میں کہہ رہے ہیں اور ادب کی حد سے نکلے جا رہے ہیں۔"

"تو وہ کسی وقت ہمیں تنہا چھوڑ دیا کریں۔"

"کیوں ہم نے کوئی راز و نیاز کرنے ہوتے ہیں۔"

"راز و نیاز کو مارو گولی۔ تذکرے میں بھی کوئی خاندانی بات آجائے تو وہ آپے سے باہر ہونے لگتی ہیں۔"

"اچھا اپنی بے ہودہ بکواس بند کیجئے۔"

اتنے میں اماں آکر پھر بیٹھ گئیں۔

تم نے مجھے کہا ہے کہ بکواس بند کرو۔"

"تم بدصورت ہی نہیں بدزبان بھی ہو۔"

"ہوں....... ضرور ہوں....... جایئے جو کرنا ہے کر لیں۔" اس کے اس ریمارک پر فیضا کا جی ہی تو جل گیا۔

"تم انتہائی بدتمیز اور بے ہودہ ہوتی جا رہی ہو۔"

"آپ بھی ذرا زبان سنبھال کر بات کیا کریں۔"

"تمہیں تو آنٹی نے کچھ سکھایا ہی نہیں۔ میں سمجھا گفتگو کا سلیقہ تو آتا ہی ہوگا۔"

"فیضا....... فیضا......." اماں نے مداخلت کی....... "کیوں جھگڑ رہی ہو، تم ہی چپ کر جاؤ، مذاق کی بات کا برا نہیں مانتے۔"

"اماں: آپ کو معلوم ہی نہیں، بات کیا ہوئی ہے۔"

"جو بھی ہوئی ہے، بڑوں سے تکرار نہیں کرتے۔" اماں مصالحت پر اتر آئیں۔

"خیر میرے ساتھ کوئی اس بدتمیزی سے نہ پیش آیا کرے، میں مغرور لوگوں کو کچھ بھی نہیں سمجھتی۔"

تبریز غصے میں کھڑا ہو گیا۔

"آنٹی میں جا رہا ہوں۔ مجھے بھی بے عزتی کروانے کی عادت نہیں ہے۔" اور وہ پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔

اماں فیضا کے پیچھے پڑ گئیں، خوب برا بھلا کہا۔

پھر وہ کئی دن نہیں آیا....... اماں کو جب بھی موقع ملتا' فیضا کو ڈانٹنا شروع کر دیتیں فیضا نے اپنے اکھڑ پن کی وجہ سے نہ جانے ان کی کتنی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اپنی دانست میں اسے شیشے میں اتار رہی تھیں۔

اور یہ کم بخت' نہ اس کی زبان کو لگام ہے اور نہ اس کی اداؤں میں دلکشی ہے۔ فیضا نے تو ایک دن بھی پروا نہ کی۔ بھلا پروا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یونہی اسے جلانے کے لیے روز چلا آتا تھا۔ اچھا ہے نہیں آتا۔ تو چین سے بسر ہو رہی ہے' وہ تو جیسے اس کی کم مائیگی کا احساس دلانے کے لیے ہی آتا تھا۔

کافی دنوں کے بعد

اس کی موٹر کا ہارن سنائی دیا تو فیضا نے یونہی مڑ کر دیکھا' وہ سامنے کھڑا تھا۔

وہ چپ چاپ کھڑی تکتی رہی۔

"آداب بجالاتا ہوں آنٹی۔"

"آؤ بیٹا جیتے رہو....... اچھے تو رہے۔"

"ہاں"

"آئے کیوں نہیں؟"

"بس مصروف رہا۔"

"کس سلسلے میں۔"

"کارڈز وغیرہ چھپوانے ہیں۔"

"اچھا تو بات طے ہوگئی۔"

"ہماری طرف سے تو سب کچھ ہو گیا ہے۔"

"بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں۔"

اماں بی غرارا سنبھالتی باورچی خانے میں چلی گئیں' کیونکہ انہیں معلوم تھا' آج فیضا اس کے لیے چائے ہرگز نہیں بنائے گی۔

"تمہیں معلوم ہے میں تم سے خفا ہو کر گیا تھا۔ مگر تم نے مجھے منانے کی کوشش ہی نہیں کی۔" وہ خود ہی فیضا کے پاس گھاس پر آ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے رئیس زادوں کو منانا نہیں آتا۔"

"ہوں تو اب تم بھی آنٹی کی طرح طنز کرنا سیکھ گئی ہو۔"

"آخر بیٹی ماں پر ہی جاتی ہے۔"

"آج تو میں تمہیں یہ کارڈ دینے کے لیے آیا تھا۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ تم جیسی سڑیل کو منہ لگانے کو....... مگر پھر سوچا خوشی کا موقع ہے معاف کر دوں۔ اگر نہ بلایا تو ساری زندگی جلتی کڑھتی رہو گی۔"

"تبریز بھائی! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں فضول جلتی کڑھتی نہیں ہوں۔ ویسے بڑی خوشی کی بات ہے۔ جو آپ کارڈ لائے ہیں دکھائیے تو....... شادی کس تاریخ کو ہے۔"

"یہ شادی کا کارڈ نہیں' منگنی کا ہے۔"

"اچھا تو پہلے منگنی ہو گی۔"

"ہاں پہلے منگنی بڑی دھوم دھام سے ہو گی اور بعد میں شادی....... میں تو ان فضول رسموں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر تم جانتی ہو اکلوتا بیٹا ہوں' امی تو اپنے سارے ارمان نکالنا چاہتی ہیں۔"

"اللہ مبارک کرے۔" اس نے کارڈ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر آہستہ سے کہا....... اماں بی چائے لے آئی تھیں۔

وہ کارڈ کو لفافہ سے نکال کر دیکھنے لگی۔ بڑا خوبصورت کارڈ تھا۔ پہلے صفحے پر ایک مردانہ ہاتھ نازک سی حنائی انگلیوں کو تھام کر ان میں انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ ارد گرد پھول بکھرے ہوئے تھے۔

اور کارڈ کے ایک کونے میں ایک دائرے میں صرف "منگنی" لکھا ہوا تھا۔ بڑی جدت تھی کارڈ میں....... بڑا خوبصورت کارڈ تھا۔ بڑا قیمتی تھا۔ اس نے کھول کر اندر پروگرام نہیں دیکھا' بس ایسے ہی پوچھا۔

"کس دن منگنی ہے۔"

"پرسوں"....... تبریز نے کہا۔

"آپ کو پتہ ہے۔ میرے تو آج کل فائنل ہو رہے ہیں۔ میں نہ آسکوں گی۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "تو کیا ہو گیا" تبریز جلدی سے بولا "ذرا کی ذرا آنے سے تمہاری ڈویژن میں فرق تو نہیں پڑ جائے گا اور پرسوں اتوار بھی ہے۔ اگر تم نہ آئیں تو میں سمجھوں گا۔ تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔"

"یہ تو خیر فضول باتیں ہیں۔ اگر میں نے صبح کو اپنے پیپر کی ضروری تیاری کر لی تو آنے کی کوشش کروں گی۔ ورنہ مجبوری ہے۔"

"واہ جی...... میں نے تو خود بخود غصہ تھوک کر محترمہ سے اس خوشی کے موقع پر صلح کر لی ہے اور محترمہ ہیں کہ مزاج ہی نہیں ملتے۔"

"آ جائے گی بیٹا آ جائے گی۔" اماں نے بڑی محبت سے کہا۔ "تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔ تم دل میلا نہ کرو۔ تمہاری کوئی سگی بہن بھی نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے بھائی کی منگنی میں فیضا شامل نہ ہو۔"

فیضا کارڈ کو پکڑے چپ چاپ اٹھ کر اپنے بستر پر سیدھی لیٹ گئی۔ آج صبح سے ہی اس کا موڈ خراب تھا' پرچہ جو ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ یونہی بہت دنوں بعد۔ دنیا جہاں کی یاسیت امنڈ کر جی میں آن سمائی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہونا ضروری بھی ہوتا ہے۔ انسان یکسانیت سے اکتا جاتا ہے آنسو نہ ہوتے تو خوشی بھی اتنی پیاری نہ لگتی۔

پر اس وقت اس کارڈ نے اور بھی اس کے موڈ کو منتشر کر دیا تھا۔ یونہی جی نڈھال ہوتا ہے تو معمولی معمولی باتیں بھی چبھنے لگتی ہیں۔ وہ دل میں سوچنے لگی کہ اچھی ہے اللہ کی تقسیم بھی...... دیکھو نا کاظمہ کتنی خوش قسمت ہے' جب باری تعالیٰ دینے پر آتا ہے تو بے حساب دیتا ہے۔ کتنے چاؤ سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ منگنی کے کارڈ الگ چھپ رہے ہیں۔ شادی کے الگ' اس کے ہاں کس شے کی کمی ہے اور پھر اس طرف بھی کیا کچھ نہ ہوگا۔ جانے ان لوگوں کو اس بات کا احساس ہوگا یا نہیں۔ وہ لوگ ان نعمتوں کی قدر بھی کرتے ہوں گے یا یونہی ہنس کر ٹال جاتے ہیں۔

ایک ہم ہیں......!

یہاں تو اس قدر شاندار منگنی پر پہنچنے کے لیے اس کے پاس خوبصورت کپڑے ہی نہ تھے۔ اماں نے جو کبھی کبھار قیمتی سوٹوں کے کپڑے خرید کر رکھے ہوئے تھے۔ سلوانے کی اجازت ہی نہ دیتی تھیں اپنی بی اے کی کانووکیشن پر وہ منتیں کر کر کے ہار گئی۔ مگر اماں جو ٹس سے مس ہوئی ہوں' بس یہی کہتی جاتی تھی میرا کوئی ریشمی غرارا پہن لو' پہنے ہوئے کپڑے جہیز میں نہیں رکھے جاتے۔

اونہہ' اماں کب دیں گی کوئی نیا سوٹ سلوانے کو...... پھر کہیں گی' میرا وہی پچیس سال پرانا کمخواب کا لہنگا پہن جاؤ' اور پھر دو دن باقی ہیں۔ اتنی جلدی کون سی دے گا۔ نہ اس پر کوئی کام ہو سکے گا۔ بہتر ہے میں اپنے کسی پرانے سوٹ میں چلی جاؤں' ٹھیک ہے اتنی بناوٹ کی کیا ضرورت ہے۔

زیادہ دیر وہ اس موضوع پر سوچ نہ سکتی تھی۔ کیونکہ صبح اس کا پیپر تھا۔ صبح پیپر دینے کے بعد اس کا ارادہ ہی بدل گیا۔

اس کی سہیلی نائلہ بڑی امیر بھی تھی اور مخلص بھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے سوچا وہ نائلہ سے ایک قیمتی ساڑھی مانگ کر پہن سکتی ہے اور جب اس نے نائلہ سے ذکر کیا تو وہ باغ باغ ہوگئی۔

بولی .... "سب کپڑے تمہارے آگے رکھ دوں گی جو پسند آئے لے جانا.......!"

"اچھا......."

وہ اتوار کی صبح کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اتوار کو وہ بارہ بجے تک اپنے کمرے میں کنڈی لگا کے پڑھتی رہی تھی۔ کل کے پیپر کی تیاری کرنے کے بعد وہ نہانے کے لیے غسل خانے چلی گئی۔ چار بجے منگنی پر جانا تھا' مگر وہ ابھی تک نائلہ کے ہاں سے کپڑے تک نہیں لے کر آئی تھی۔

جب وہ نہا کر برآمدے میں کھڑی تولیے سے بال سکھا رہی تھی' تو اچانک تبریز نمودار ہوا اے آج کے دن بھی اس کو چین نہیں۔ پھر آن دھمکا ہے۔

"ہیلو کیسی ہو فیضا......."

"اجی ہم تو آپ کے ہاں آنے کی تیاریوں میں مگن ہیں اور بڑے میاں آج بھی آوارہ گردی میں مصروف ہیں۔"

"بھئی وہ تم سے ایک ضروری بات کہنا تھی۔"

"کہیے.......!"

"پھوپھی اماں کہاں ہیں.......؟"

"پھوپھی اماں .... وہ آج آنٹی سے پھوپھی اماں کیسے ہوگئیں۔"

"بکواس بند کرو اور بتاؤ کہاں ہیں۔"

"اندر کہیں بیٹھی پرانے بکس ٹٹول رہی ہوں گی۔ شام کی تقریب کے لیے وہ بھی کوئی جوڑا منتخب کر رہی ہوں گی۔"

باہر کو لپکتی ہوئی اماں بی اپنا نام سن کر وہیں دروازے کی اوٹ میں ہوگئیں۔

"اچھا تو اپنے کمرے میں چلو مجھے ایک اشد ضروری بات کہنی ہے۔"

"جی نہیں .... جو بھی بات ہے یہیں کہیے .... میں نے کبھی اندر بیٹھ کر آپ سے بات نہیں کی۔"

"دیکھو بات بہت اہم ہے اور میں چاہتا ہوں تم سنجیدگی سے سنو۔"

''جی آج تو ویسے بھی میں بالکل سنجیدہ ہوں۔''

فیضا اپنے بال سمیٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور پاس پڑی کرسی پر تبریز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''بات یہ ہے کہ .... '' تبریز ذرا سا گھبرایا' پھر بحال ہو کر بولا:

''پچھلے مہینے جب میں امریکہ میں تھا' ابا میاں نے مجھے خط لکھا تھا کہ میں پاکستان آ کر شادی کر لوں۔ شادی کے لیے انہوں نے مجھے چوائس دی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں کسی امریکن لڑکی سے بیاہ کروں اور نہ میں چاہتا تھا۔ ابا میاں نے اپنے خط میں تین گھرانوں کے بارے میں لکھا تھا۔ گلریز ماموں کی بیٹیاں' ان میں سے جس کو بھی میں پسند کروں۔ چھوٹے ماموں کی بیٹی کٹی ....اور صفیہ پھوپھی کی بیٹی فیضا۔''

فیضا کا دل دھڑک اٹھا۔ اور اندر پردے کے پیچھے اماں بی گرتے گرتے بچیں ....!''

''کٹی کو تو میں وہیں ملتا رہتا ہوں' پچھلے برس عاصمہ' کاظمہ اور صائمہ امریکہ آئی تھیں۔ ان سے بھی خوب ملاقات رہی' باقی ایک ہستی رہ گئی تھی یعنی صفیہ پھوپھی کی بیٹی فیضا کو دیکھے بغیر میں شادی کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا' دیکھنے کے لیے مجھے بطور خاص یہاں آنا پڑا۔

''اچھا تو آپ ہمیں بے وقوف بناتے رہے۔''

''یعنی آپ کو بنانے کی ضرورت ہے۔''

''اگر فیضا.......''

''خاموش رہو ایسی باتیں مشرقی لڑکیاں شرما کر سنتی ہیں اور سننے کے بعد سر پر پلو ڈال کر سر جھکا لیتی ہیں۔''

اس کی بات پر فیضا نے کچھ عجیب عجیب محسوس کیا۔

''پسند تو میں نے تمہیں اسی دن کر لیا تھا۔ جس دن تم نے مجھے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ پھر تم نے اپنی ذہانت کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا کہ میں نے سوچا ذرا دیکھوں کتنے پانی میں ہو۔''

فیضا نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''ذہانت کی طرف سے تم نے بالکل مایوس کیا ہے' ہاں لائف پارٹنر کے طور پر تم معقول لڑکی ہو۔ گوارا کی جا سکتی ہو....... حالات سے سمجھوتہ کر سکتی ہو۔ ویسے بھی تم نے کئی بار کہا تھا خوبصورتی ازدواجی زندگی میں کوئی اہم شے نہیں ہوتی....... سو.......'' تبریز جان بوجھ کر رک گیا۔

فیضا کو بیٹھے بیٹھے غصہ آنے لگا۔ اس کے انداز پر، اس کی شوخ آنکھوں پر، اس کے ریمارکس پر:

"تو کہہ چکیے نا......." وہ تپ تپ بولی۔

"بھئی کہہ تو چکا ہوں کہ وہ کارڈ میں تمہیں دکھانے لایا تھا' دراصل میری اور تمہاری منگنی کے لیے تھا۔ اندر تو میں نے یونہی پرچہ لکھ کر لگا دیا تھا۔"

"مگر یہ فیصلہ آپ نے خود سے کیسے کرلیا۔"

"میں نے کب کیا ہے۔ بزرگوں نے کیا ہے۔"

"یہ فیصلہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔"

"ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا لیکن یہ تو بعد میں ثابت ہوگا۔"

"اسی لیے میں پہلے کہہ رہی ہوں' یہ بالکل غلط' انمل اور بے جوڑ شادی ہے اور شادی کوئی یک طرفہ فیصلہ نہیں ہوتی۔"

"یہاں ہوتی ہے ہمارے ملک میں....... سمجھیں؟ یہاں کوئی کسی کے منہ سے انکار نہیں سن سکتا۔"

"جناب یہ رعب کس پر ڈالا جارہا ہے آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے۔"

"فیضا فلمی ہیروئن بننے کی کوشش نہ کرو' ہمارے ہاں ایسے ہی شادیاں ہوتی ہیں۔ جب لڑکا لڑکی کو پسند کرلیتا ہے تو سمجھو شادی طے ہوگئی۔"

"آپ اپنا یہ احساس برتری مجھ پر نہیں ٹھونس سکتے۔"

"انکار تو کرکے دیکھو۔"

"کرونگی' سو بار کروں گی' تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو' لاٹ صاحب کے بچے کہیں کے' دیکھتی ہوں کیسے ہوتی ہے میری اور تمہاری شادی.......؟"

تبریز نے اس کے تنے تنائے چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا اور بولا "ایسے ہوگی میری اور تمہاری شادی۔" پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ فیضا بیگم حقیقت میں' میں وہ معمولی سا لڑکا نہیں ہوں۔ جو سارا سارا دن تمہاری لایعنی باتیں سنتا رہتا تھا' میرا فیصلہ ایک وزن رکھتا ہے' میرا فیصلہ مرد کا فیصلہ ہے۔ آج شام کو امی اور ابا پھوپھی اماں سے بات کرنے آرہے ہیں۔ منگنی کی تاریخ آج شام کو ہی ٹھہرائی جائے گی۔ خیال تو میرا یہ تھا کہ اچانک ہی تاریخ ٹھہرا کر تم لوگوں کو سرپرائز دوں گا مگر تم کچھ الٹے دماغ کی ہو۔ کہیں لینے کے دینے نہ

پڑ جائیں۔ یہ سوچ کر ہی میں انہیں آج شام کو چار بجے لے کر آؤں گا۔ وہ تمہیں انگوٹھی پہنا جائیں گے۔ تیار رہنا سمجھیں؟'' اور وہ چابی کا چھلا گھماتا ہوا باہر نکل گیا۔

دروازے کے پیچھے کھڑی بی اماں بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔ کچھ ایسا اختلاج دل کو ہو رہا تھا کہ منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ کتنی دیر تک تو وہ قدم اٹھانے کے قابل ہی نہیں تھیں۔ پھر جب خود کو گھسیٹ کر باہر لائیں تو دیکھا فیضا اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے زار و قطار رو رہی ہے۔

انہوں نے سسکتی ہوئی فیضا کو سینے سے لگا لیا اور محبت سے بولیں ''چلو اب رونا دھونا چھوڑو، اٹھو میری بچی، وقت بہت ہی تھوڑا ہے اور ابھی سارا کام کرنا ہے، بہنوں کو ساتھ لگا کر پہلے سارے گھر کی صفائی کر لو، پھر چائے لیے برتن نکال لو۔ تب تک میں پکوان کے لیے چیزیں منگواتی ہوں۔''

ٹھیک چار بجے کار کا ہارن سنائی دیا' اماں بی اطلس کا غرارا پہنے خوشی میں تمتماتی اپنے بھائی اور بھاوج کے سواگت کو بڑھیں۔

''اے اللہ رتبے بڑھائے میرے بھیا کے' اسے بڑی کری عطا ہو۔'' وہ ان کی بلائیں لیے جا رہی تھیں۔

سارا گھر چم چم کر رہا تھا۔ چھوٹی بچیاں الگ اترائی اترائی پھر رہی تھیں۔ فیضا نظر نہیں آ رہی تھی۔

تبریز اس کو ڈھونڈتا ہوا باورچی خانے میں آ گیا۔ اس نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ ویسے ہی سوجی آنکھوں اور روئے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھی سموسے تل رہی تھی' باورچی خانے سے بڑی اشتہا انگیز خوشبوئیں نکل رہی تھیں۔

تبریز بھاگتا ہوا آیا تھا' مگر دروازے میں اچانک رک گیا' جانے کیا بات تھی آج یوں بے دھڑک اندر آتے ہوئے وہ خود جھجک رہا تھا۔ ورنہ تو روز بڑھ کر خود اس شعلے کو ہوا دیا کرتا تھا۔

فیضا نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ حسب عادت کوئی چوکا لگانے کی بجائے اس نے بھی نظریں جھکا لیں' نہ جانے کیا ہو گیا تھا' خواہ مخواہ کا حجاب مانع ہو رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

''ابھی تک تم تیار نہیں ہوئیں' امی اندر تمہیں بلا رہی ہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

''میں ادھر کام کر رہی ہوں۔'' اس نے نظریں چرا کر جواب دیا۔

''مگر وہاں تو جانا ہوگا۔''

وہ خاموش رہی۔

"بولونا.......!"

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

"اچھا بھئی یہ تھپڑ ادھار رہا۔ شادی کے بعد کسی دن یہ ادھار چکا دینا۔" وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا:

فیضا کو ہنسی آ گئی مگر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"آہا....... بڑے لذیذ سموسے ہیں۔ یوں لگتا ہے دل لگا کر تل رہی ہو ہاں اچھی لڑکیاں اسی طرح سسرال والوں کی تواضع کرتی ہیں۔" اسے چھیڑنے کا حوصلہ ہوا جا رہا تھا۔

فیضا نے مڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

پھر دیکھا.......!

مختلف لگ رہا تھا اس کا چہرہ۔

وہ سارا جنگل ہی غائب تھا....... نہ لمبے بال....... نہ بھیانک قلمیں۔

وہ اس کا چہرہ بھانپ گیا۔

"اوہ جائزہ لیا جا رہا ہے......."

"وہ تو میں نے ایک خول چڑھا رکھا تھا کہ آج کل کی لڑکیاں وہ حلیہ پسند کرتی ہیں۔ مگر جب مجھے احساس ہوا کہ تم اس حلئے کو پسند نہیں کرتی ہو تو تمہاری پسند میں ڈھل کر آ گیا ہوں۔"

فیضا پھر بھی خاموش بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر خاموش رہی۔

"فیضی ایک بات بتاؤ۔" ایک دم تبریز سنجیدہ ہو گیا۔ "تمہاری خاموشی نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ہے۔ جسے میں ایک ادا سمجھ رہا ہوں۔ وہ کہیں ناگواری نہ ہو۔ خدا کے لیے جلدی سے جواب دو۔ اگر تمہیں واقعی یہ شادی منظور نہیں ہے تو میں بزرگوں کو بات بڑھانے سے روک دوں۔

مگر ذرا جلدی کرو۔ وقت نکل گیا تو ہم دونوں کچھ نہ کر سکیں گے۔

فیضا نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے پیڑھی پر پروا کی نوٹ بک اور پنسل پڑی تھی اس نے لپک کر اٹھائی' لکھا اور پرچہ تبریز کی جھولی میں ڈال کر باہر بھاگ گئی۔

خوفزدہ دل کے ساتھ تبریز نے وہ پرچہ اٹھایا الٹ کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔

تم اتنی دور سے چل کر میرے قریب آئے
اب آؤ پاس ہی بیٹھ کر تھکن مجھے دے دو

''اونہہ.......'' تبریز ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ یہ بے چاری لڑکیاں' لڑکیاں ہی رہتی ہیں' خواہ کتنا بھی پڑھ جائیں' کتنی بھی انٹلکچوئل بننے کی کوشش کریں۔

سوکھے ہوئے پھول

''سارہ! تم نے جنید کے ساتھ شادی نہ کر کے بڑی حماقت کی۔'' میری بہن مجھ سے کہتی ہے۔ میں آنکھیں اٹھا کر اپنی بہن کی طرف دیکھتی ہوں اور پھر سر جھکا لیتی ہوں۔

''تمہیں بہرحال شادی کر لینی چاہیے تھی۔'' وہ پھر کہتی ہے۔ ''مجھے تو اب احساس ہوتا ہے' شادی عورت کے لیے کتنی ضروری ہے اور پھر شادی اسے اسی مرد سے کرنی چاہیے جو اس کا سب سے زیادہ خواہش مند ہو۔''

اب کے میں سر اٹھا کر اپنی بہن کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہوں اور وہ میری نظروں کے طنز کو نظر انداز کر کے کہے جاتی ہے۔

''درحقیقت عورت کی زندگی کی تکمیل ننھے منے بچوں سے ہوتی ہے۔ سچ کہتی ہوں سارہ جب عورت چند ننھے منے بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ تو وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ اسے اپنے غم' اپنی حسرتیں اور اپنی محرومیاں بھول جاتی ہیں۔ اس کا وجود چھوٹے چھوٹے وجودوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ وہ انہی کے لیے جیتی ہے' انہی کے لیے مرتی ہے اور انہی کے لیے وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتی ہے.......'' میں چپ چاپ اپنی بہن کا منہ تکے جاتی ہوں۔ وہ پھر کہتی ہے۔

اب دیکھو میرا انو نو سال کا ہو گیا ہے۔ شانی چھ سال کی ہے اور آبو تین سال کا ہے۔ میں دنیا سے اتنی آگے نکل آئی ہوں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھی مجھے ماضی کا غم نہیں ستاتا۔ میں سمجھتی ہوں یہی میری دنیا ہے۔ یہی کچھ میں نے چاہا تھا۔ بچوں کے بغیر ایک عورت ادھوری ہے۔ نامکمل ہے۔ اپاہج ہے۔'' وہ پھر میری طرف ہمدردی سے دیکھتی ہے۔

''تم جو پوری زندگی تنہا بسر کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی ہو۔ تمہیں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مجھے بتاؤ سارہ' تم نے یہ دس طویل سال کیوں کر بسر کیے۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو مر چکی ہوتی۔''

میں اب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر نظریں جھکا لیتی ہوں۔

''سارہ میں سچ کہتی ہوں اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ تم کہیں شادی کر لو اور اگر تم جنید سے شادی کرنا چاہتی ہو تو اب ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

اب ضبط کی قوت جواب دے جاتی ہے اور میرے اندر الاؤ سلگ اٹھتے ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہن کو کوئی زہر بھرا فقرہ کہوں۔ لیکن میں آنسو پی جاتی ہوں اور زہریلی مسکراہٹ سے اپنی بہن کی طرف دیکھتی ہوں۔

''اب تمہارا بچہ بھی انو کے لگ بھگ ہوتا۔ پگلی تم نے ایک ہی ضد پر اپنی زندگی قربان کر دی اور وہ جنید کا بچہ پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

''اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہن کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں اور کہوں اس خود غرض زبان سے جنید کا نام بار بار مت لو۔ لیکن پھر میرے اندر ہزاروں درد انگڑائیاں لینے لگتے ہیں اور میں اس موضوع پر بولنا سراسر حماقت سمجھتی ہوں۔ ان کے پچھتاووں میں اضافہ کرنے کے لیے مکمل خاموشی سادھ لیتی ہوں اور میز پر پڑے ہوئے پیپر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی ہوں۔

''توبہ! تم تو بالکل سنگی بن گئی ہو۔ پتھری پتھر۔ تنہائی کی زندگی نے تم سے سارے جذبات چھین لیے ہیں...... تم ذرا سی کوشش کرو تو جنید کا پتہ لگ سکتا ہے۔'' اب میں بہت تیز نظروں سے بہن کی طرف دیکھتی ہوں۔ میرے ماتھے پر بل پڑے ہیں میرے کچھ کہنے سے پہلے میری بہن میرے تیور جان جاتی ہے اور اٹھ کر باہر جانے لگتی ہے۔

''ہم تو تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں۔ ہم سے تیری ویران سنسان زندگی نہیں دیکھی جاتی۔'' اور وہ باہر چلی جاتی ہے۔ میں ان بھلا چاہنے والوں کی منطق پر غور کرنے لگتی ہوں میری بہن باہر جا کر میری ماں کو نہ جانے کیا کچھ کہنے لگتی ہے کہ میری بوڑھی ماں رونے لگتی ہے اور رات کو جب' میں اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر تاروں بھری چھت تلے لیٹتی ہوں تو میری ماں اپنا جھریوں سے بھرا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھتی ہے اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔

''تیری بربادی کی ذمے دار میں ہوں سارہ! میں خدا کو کیا جواب دوں گی؟''

ان آنسوؤں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور میں سپاٹ سے لہجے میں کہتی ہوں ''کسی کی تباہی کا کوئی ذمے دار نہیں ہوتا۔ میری ماں! یہ سب نصیبوں کا لکھا ہوتا ہے'' مجھے کیا معلوم تھا کہ تو اتنی ضدی ثابت ہو گی۔ اس وقت میں سارہ کی باتوں میں آ گئی'' اور میرے ہونٹوں پر زہر پھیل جاتا ہے اور میں اپنے ذہن میں ماں کے فقرے دہراتی ہوں۔ ہاں ماں تو کر بھی کیا سکتی ہے۔ معاشرے کی چکی میں پسی ہوئی مائیں رسم ورواج کے خلاف قدم اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتیں لیکن بیٹیوں کی بہار اجڑتی دیکھ لیتی ہیں' مگر میں کچھ بھی نہیں کہتی۔ اب کچھ کہنا بعد از وقت اور بے معنی ہے...... میں نے تو اس وقت بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ جب کہنے کا وقت تھا اور اب کچھ کہہ کر ان پشیمان دلوں کو اور دکھ دینا نہیں چاہتی۔ ''بیٹی تو کسی طرح جنید کا پتا لگا لے اور اسی سے شادی کر لے۔ لیکن خدا کے لیے اپنی

زندگی یوں نہ اجاڑ۔" میری ماں پھر کہتی ہے۔

لیکن میں چاند کی سمت نظریں جمائے رکھتی ہوں۔ میرا دل خون ہو جاتا ہے۔ میرے اعصاب میں چنگاریاں دہک اٹھتی ہیں اور میرا دل چاہتا ہے۔ میں کہوں۔ میری ماں! وقت تیرے فیصلے کے انتظار میں رک نہیں سکتا تھا۔ یہ وقت مجھے کلیوں سے پھولوں کے دیس میں لایا اور پھول مرجھانے لگے۔ اب میں ننگی شاخوں کے جھنڈ میں آن پہنچی ہوں۔ ان پر کوئی پھول نہ کھلے گا۔ میں باغبان کو پکاروں بھی تو کس طرح؟ لیکن میں پھر بھی چپ رہتی ہوں' ایسا نہ ہو میری ماں کو اور صدمہ پہنچے حالانکہ میں جانتی ہوں۔ ستر سال کی اس بوڑھی عورت کی جان مجھ میں اٹکی ہوئی ہے اور اس کا پچھتاوا ایک مسلسل عذاب ہے اس کے لیے...... پر میں کیا کروں ایک قطرے کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر کے تلاش کرنا دیوانگی ہے' حماقت ہے۔ اس قطرے کو کون تلاش کر کے لائے جو گوہر ہونے کے لیے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں کود گیا اور پھر اس وقت کو کون منا کر لائے جو زندگی کا نقیب تھا۔ جو کلیوں' پھولوں کا امین تھا۔ جو محبت کا ضامن تھا۔ اب تو وقت بھی مفلوج ہو کر لنگڑا ہو رہا ہے اور میں چاند کی سمت تکے جا رہی ہوں۔ جیسے میرا نگر بھی چاند میں آباد ہو گیا ہے اور میں اس نگر کو چاند کی آنکھوں میں تلاش کرتی ہوں اور یہ چاند میرے سامنے آجاتا ہے اور میری پلکوں پر جھک کر کہتا ہے۔

"میں وہ نہیں جس کی کھوج میں تو مجھے دیکھے جاتی ہے۔ میں تو گم گشتہ خیالات اور تھکی ماندی آنکھوں کی آخری پناہ گاہ ہوں میں خود بھی ان متجسس نگاہوں کی گرمی اور کراہتے ہونٹوں کے سوز سے تھک گیا ہوں۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں' انسان اپنی آرزوؤں' امیدوں کو کھو کر جب بے آسرا ہو جاتے ہیں اور ان چہروں کو تلاش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں جو چہرے کبھی حاصل زندگی تھے تو اپنی فریب خوردہ نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیتے ہیں۔ میں بیک وقت ان سب کو ان کا محبوب نظر آتا ہوں۔ ان کے پراگندہ خیالات کی آخری منزل بن جاتا ہوں۔ ان کی خوشیوں اور محبتوں کا آئینہ بن جاتا ہوں۔

"میں کیا کروں۔ میں خود بھی صدیوں سے یہ کھیل رچا رچا تا تھک گیا ہوں اور اب تیری تلاش کرتی ہوئی نظریں مجھ پر کیوں رک گئی ہیں۔"

"نہیں...... "میں ایک سوگوار تبسم سے اپنا سر اپنے ریشمی تکیوں میں چھپا لیتی ہوں۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے تیرے داغدار جگر تک نہیں اترتی پگلے! وہ تجھ سے بھی کہیں روشن تھا۔ میں نے کبھی اسے چاند نہیں کہا تھا۔ میں تو اس کے لیے چاند سے بھی بلند کوئی نام ڈھونڈتی رہی اور وہ قطرہ بن کر سمندر کی گہرائیوں میں کود گیا۔ وہ گہر بننا چاہتا تھا۔ یہ اس کی بھول تھی۔ ورنہ وہ تو ایسا گوہر آبدار تھا۔ جسے اپنے اندر چھپانے کے لیے سمندروں کے سینے مدت سے اچھل رہے تھے۔ اور اے چاند!

تو میرے خیالات کی اڑان نہیں ہے۔تو ایک حد ہو سکتا ہے۔اس طرح اداس نہ ہو کہ میری آنکھوں نے تیری اداسی اور بلندی ایک پیکر میں سموئی تھی اور زندگی منزل بننے کی بجائے طویل راہ گزر بن گئی تھی۔ ہال میں اس روز جب سب سے آخر میں' وہ کمرے میں داخل ہوا ہے تو میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ اپنے کالے سوٹ میں اداس صورت اور پژمردہ آنکھوں کے ساتھ مجھے عرش سے اترا ہوا کوئی خاکی ہی معلوم ہوا۔

اور جب وہ کمرے کے وسط میں آ کھڑا ہو گیا تو میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ کوئی یوسف ثانی نہیں تھا۔لیکن مردانہ وجاہت کا ایک دلنواز نمونہ تھا۔اس کے چہرے پر سوز تھا۔ایسا سوز جو چاند کے داغ میں ہوتا ہے۔ چاند کا داغ نظر آ جاتا ہے اس کا داغ اس کے دل میں تھا۔میں اس کے داغ کو نہ دیکھ سکی۔لیکن اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے سوز کو میں نے ضرور پا لیا اور اس کی طرف دیکھ کر میرا دل اداس ہو گیا....... میں نے اس کا غم آپ ہی آپ اپنے دل میں منتقل کر لیا اور جب سالگرہ کا کیک کٹ چکا تو اپنی پلیٹ اٹھا کر میں دور در یچے میں جا کھڑی ہوئی۔ جہاں مجھے کوئی نہ دیکھے' لیکن میں سب کو دیکھ سکوں۔ مسز ارشد کی نظر اس پر پڑی اور وہ پتوالی کو اس کی طرف بڑھیں۔ اس نے ایک سپاٹ سی مسکراہٹ کے ساتھ مسز ارشد کے سلام کا جواب دیا اور پھر چاروں کونوں میں متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔میری ہی طرح شاید وہ بھی کسی کنج عزلت کا تمنائی تھا۔میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ سالگرہ کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچتا جا رہا تھا۔لیکن میں الگ تھلگ کھڑی مسرور ہو رہی تھی۔ اس شب میری روح مطمئن تھی۔ جیسے اس کا کوئی بچھڑا ہوا حصہ اس سے آن ملا ہو۔ جیسے آج شب اس کی تشنگی مٹ گئی ہو۔

اللہ....... روح کا اطمینان بھی کیسا کیف آگیں ہوتا ہے۔

میں ابھی اپنے اندر سرور و کیف کے شادیانے بجتے سن رہی تھی کہ رابعہ میرے قریب آ گئی۔

''یہاں کیوں چھپی کھڑی ہو؟''

''نہیں تو........!''

''کیا اپنے بہنوئی کا سامنا کرنا نہیں چاہتیں؟''

''کون سا بہنوئی........؟'' میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''بھئی وہی جنید ترمذی!''

''ہاں....... تو نے نہیں دیکھا۔'' میں نے اپنا چہرہ محفل کی طرف گھما لیا۔'' وہ دیکھ....... سیاہ کوٹ میں وہ سب سے الگ

مغموم سا کھڑا ہے۔"

"اوہ! میں نے اب پہچانا ہے......." میں مینار سے نیچے پھسلنے لگی۔ میری روح کے سارے تقاضے رونے لگے۔ کتنی بے وقوف ہوں' میں نے جنید کو پہچانا نہیں۔ ہاں اور پہچانتی بھی کیسے.......؟ میں نے اسے ایک ہی بار دیکھا تھا۔ اس کی تصویر میرے ذہن میں سے اتر چکی تھی اور اب یہ کتنا بدل گیا ہے۔

مجھے آج سے پانچ سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔

ہم دونوں بہنوں کی پرورش ماں نے بڑے شاہانہ انداز میں کی تھی۔ بیوہ ہونے کے باوجود ہمیں شہزادیاں بنائے رکھا اور ہم دونوں بہنیں لاشعوری طور پر یہ سمجھنے لگ گئی تھیں کہ دنیا میں کوئی شخص اس قابل نہیں جو ہمیں اپنا بنا سکے ہمارے لیے عرش سے خاص طور پر کوئی خاکی اترے گا اور یہ خیال عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہونے لگا۔

ان دنوں میں ایف ایس سی کر رہی تھی۔ جس کے لیے مجھے لاہور کے ایک کالج میں داخلہ لینا پڑ گیا اور سائرہ میری بڑی بہن بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ بنوں میں رہتی تھی۔ مجھے سائنس میں خاصی محنت درکار تھی۔ ادھر ایک دم سائرہ باجی کا خط آیا کہ اسے وہ عرش سے اترا ہوا خاکی زمین پر نظر آ گیا ہے اور وہ اس سے شادی کر رہی ہے۔ شادی کی تیاری اس طرح آناً فاناً ہوئی کہ میں کچھ سوچ ہی نہ سکی۔ شادی کی جو تاریخ رکھی گئی تھی اس سے دوسرے دن میرے فائنل امتحان تھے۔ امی نے مجھے لکھا تھا کہ میں چاہے ایک دن کے لیے آؤں' لیکن ضرور آؤں....... سو میں ایک دن پہلے چلی گئی۔ شادی کے روز میں نے بھیڑ میں جنید کو دیکھا۔ نہ جانے مجھے کیسا لگا۔ کیونکہ میرے اعصاب پر تو امتحان کا بھوت سوار تھا بارات رخصت ہو گئی اور اسی رات میں لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔ میرا ذہن پریشان رہا۔ میرے امتحان شروع ہو گئے۔

اور ایک دن سائرہ باجی میرے ہوسٹل آ گئیں۔ میں حیران رہ گئی۔

"سارہ! میں اور جنید ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔"

"سچ......."

"ہاں......."

"کہاں ہیں جنید بھائی.......؟" ان سے ملنے کا اشتیاق جاگ اٹھا۔

"وہ ایک ضروری کام سے گئے ہیں۔ کیونکہ پرسوں ہم روانہ ہو رہے ہیں۔" باجی شام تک میرے پاس بیٹھی رہیں۔ لیکن جنید

بھائی نہ آسکے۔ان کا ٹیلی فون آ گیا۔کچھ پاسپورٹ کا جھگڑا تھا۔باجی مجھ سے یہ وعدہ کر کے چلی گئیں کہ سوئٹزر لینڈ جانے سے پہلے وہ جنید کو مجھ سے ضرور ملائیں گی۔لیکن پھر کتنے ہی دن گزر گئے نہ باجی آئیں نہ جنید بھائی۔ایک مہینے بعد سوئٹزر لینڈ سے باجی کا خط آیا انہوں نے مجھ سے نہ ملنے پر معذرت کی تھی۔اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔جس سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ باجی بے حد خوش ہیں۔میں نے اطمینان کی سانس لی۔وقت گزرتا رہا۔میرا رزلٹ آؤٹ ہوا۔میں ایف ایس سی میں فیل ہو گئی۔دکھ تو مجھے بہت ہوا لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں سائنس میں نہ چل سکوں گی۔اگلے سال میں نے آرٹس لے لیا۔باجی کو سوئٹزر لینڈ گئے ایک سال ہو گیا تھا۔جنید بھائی نے وہاں نوکری کر لی تھی اور وہ دونوں بہت خوش تھے۔پھر انہوں نے اپنی آمد کے متعلق لکھا تھا۔ان دنوں بھی میرے امتحان ہو رہے تھے۔میں انہیں لینے کراچی نہ جا سکی۔صرف امی گئیں اور انہیں لے آئیں جنید بھائی نے مکان وغیرہ کا انتظام کر لیا تو باجی بھی کراچی چلی گئیں۔پھر کچھ عرصہ بعد میں نے ایک اور خبر سنی....... سائرہ باجی نے جنید بھائی سے طلاق لے لی....... کیوں؟ کس لیے؟ کس طرح.......؟

کسی نے ان باتوں کا جواب نہیں دیا۔بس سائرہ باجی ہمیشہ کے لیے امی کے پاس آ گئیں۔کبھی کبھی مجھے باجی کا دکھ بھرا خط مل جاتا اور مجھے لاشعوری طور پر ہی جنید بھائی سے نفرت محسوس ہونے لگتی۔یہ مرد جس عورت کو اتنے پیار محبت سے اپناتے ہیں۔اس کے لیے کوئی قربانی نہیں دے سکتے۔وقت آگے سرکتا رہا۔میں نے بی اے کر لیا۔ایم اے کیا لیکن مجھے عرش سے اترا ہوا وہ خاکی نظر نہیں آیا۔میں نے مقامی کالج میں لیکچرر شپ قبول کر لی۔ابھی مجھے ایک مہینہ ہوا تھا۔کالج جاتے ہوئے مسز ارشد میرے ساتھ ہی پڑھاتی تھیں۔آج ان کی لڑکی طیبہ کی سالگرہ تھی اور میں سالگرہ میں آئی تھی۔

اور اچانک کالے سوٹ میں ملبوس عرش سے اترا ہوا ایک خاکی کمرے کے وسط میں نمودار ہوا۔جسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے میں اسے پہچانتی ہوں....... نہیں میں تو اسے جنم جنم سے جانتی ہوں۔

اور اب رابعہ نے بتایا یہ جنید ہے۔

میرا خون کھول اٹھا۔تو اس نے میری بہن کو طلاق دی ہے اور وہ ساری عقیدت ایک نفرت میں بدل گئی۔

”لو! وہ اسی طرف آ رہا ہے۔“ رابعہ نے مجھے بتایا۔

”میرا اس سے تعارف مت کرانا رابعہ....... میرا خیال ہے وہ مجھے نہیں پہچانے گا۔“

”اچھا.......!“

میں بے نیازی بن کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رابعہ وہاں سے ٹل گئی اور وہ میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے چہرے کا سوز کچھ اور پر نور ہو گیا اور وہ اپنی گہری دلکش آواز میں بولا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے میں آپ کو جانتا ہوں۔ پہچانتا ہوں' آپ کون ہیں؟"

مجھے ایک دم طیش آ گیا۔

"جی....... نہیں....... میں آپ کو نہ جانتی ہوں نہ پہچانتی ہوں اور آپ کون ہیں؟ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔"

"یہ آپ کے دل کی زبان نہیں آپ کی اپنی زبان ہے۔"

"کیا مطلب.......؟"

"آپ نے پہچانا مجھے اسی وقت تھا' جب میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔"

میرا دل دھڑکنے لگا....... "جی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو اب تک نہیں پہچانا۔ یہاں تک کہ میں آپ کا نام بھی نہیں جانتی۔"

اس نے کہا نام اور حسب و نسب سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز روح کی پہچان ہے۔ کیا آپ کی روح مجھے دیکھ کر مطمئن نہیں ہو گئی تھی؟"

میرا دل کانپ گیا۔

"آپ کو اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟"

"میں نے آپ کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔"

"بالکل غلط.......!"

"میرے دل نے مجھے اس کی آگاہی دی تھی۔"

"کیسے.......؟"

"آپ کو دیکھ کر میری روح یوں ٹھٹک گئی تھی جیسے ایک بھٹکے ہوئے پرندے کو اچانک اپنا نشیمن نظر آ جائے۔"

یہ کون ہے....... یہ کون ہے....... یہ کون ہے۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ لیکن پھر نفرت کا ایک طوفان میرے ہونٹوں تک آ گیا۔ ایسی مکاری کی باتیں کر کے اس نے سائرہ کا دل موہ لیا تھا اور اب میں اسے کچھ کہنے والی تھی کہ مسز ارشد قریب آ گئیں۔

''یہ سارہ زبیری ہے۔ جنید! تم شاید اسے جانتے ہو گے۔ ابھی ابھی کالج میں آئی ہے۔ بہت اچھی بچی ہے۔'' مسز ارشد کے اس بزرگانہ انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔

''کیا آپ سارہ زبیری کی بہن ہیں؟'' اچانک جنید نے اپنی گمبھیر آواز میں کہا اور میرے سامنے نفرتوں کے پہاڑ کھڑے ہو گئے۔

''جی ہاں!'' میں نے بڑی تندی سے کہا۔

''اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک ہی گھر میں ابراہیم اور آذر بھی جنم لے سکتے ہیں۔ بہر حال آپ وہ ہیں جن کی ذرا سی جھلک میں نے سارہ میں پائی اور بھٹک گیا۔''

''لیکن میں سارہ جیسی سادہ لوح اور عاقبت اندیش نہیں ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ کر آ گئی۔ گھر آ کر میں سارا وقت سلگتی رہی۔ میرا دل کہتا تھا 'پگلی نہ بن....... یہ وہی شخص ہے بالکل وہی....... جسے تو بائیس سال سے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ لیکن عقل کہہ رہی ہے' اس نے تیری بہن کی زندگی برباد کی ہے یہ وہ شخص ہے جو ایک عورت کو طلاق دے چکا ہے۔ اور ہمارا سماج جہاں طلاق شدہ عورت کو اس کا اصلی مقام نہیں دے سکتا۔ طلاق دینے والے مرد کی طرف سے بھی بدگمان ہو جاتا ہے۔ اس لیے میری بدگمانی حق بجانب تھی۔ لیکن اس رات' جب بھی میں آنکھیں بند کرتی مجھے جنید اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیتا۔ کالے سوٹ میں ملبوس' ایک مغموم اداس' پرسوز چہرے اور پرنم آنکھوں والا نوجوان! اس کی سرگوشیاں مجھے اپنے کانوں میں سنائی دیتیں تم میری روح کی پہچان ہو۔ لیکن تم جو بھی ہو میری بہن کو طلاق دے چکے ہو۔ اب تم میرے لیے کچھ بھی نہیں ہو....... اب میں کسی اور خاکی کا انتظار کروں گی....... اور خاکی ڈھونڈوں گی....... پھر کتنے دن یوں ہی بیت گئے۔

میرا خیال تھا میں اسے بھول جاؤں گی۔ لیکن اس سے ملنے کی طلب شدید پیاس کی مانند بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک روز سرراہ اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے بے جان سے قدم اٹھاتا آ رہا تھا میں بھی ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے تھکی تھکی سی جا رہی تھی۔ اس دن صبح بہت چمکیلی تھی ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بت بن گئے۔ پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے کپڑوں کو دیکھا اور حیرانی سے مسکرا دیئے۔

''میں جس وقت سے چلا ہوں آپ کے متعلق سوچ رہا ہوں۔''

میں بھی تو اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ مگر میں خاموش رہی۔

"اس وقت ہمارا ملاپ یوں ہوا جیسے نیلے آسمان پر دو سرمئی بادل مخالف سمتوں میں آ کر مل جائیں۔"

"اچھی تشبیہ ہے۔" میں ہنس پڑی۔

"میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟" اس کی آواز میں التجا تھی۔

"زندگی بھر کے لیے!" میرا دل پکارا....... لیکن میں نے صرف نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"شکریہ!" وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

"لیکن میں نے آپ کو اجازت نہیں دی۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"آپ کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ آپ زندگی بھر کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہیں۔" میرا دل سجدہ ریز ہو گیا۔ اسی کو روح کی پہچان کہتے ہیں اور میں خاموش ہو گئی۔

"تو کیا میں نے غلط سمجھا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"اس کا جواب دینا مشکل ہے!"

"کیوں.......؟"

"مجھے ہمیشہ سچ بولنے کی عادت ہے۔"

"میں سچ کی تلخی سہنے کا عادی ہوں۔"

"لیکن سچ کبھی کبھی اتنا میٹھا بن جاتا ہے کہ زندگی تلخ ہو جاتی ہے.......!"

ایسی مٹھاس سے اب تک میں محروم رہا ہوں۔" اس کی آواز میں محرومیوں کی لرزش تھی۔ میرا دل خون ہونے لگا۔

"آپ نے بالکل صحیح سمجھا تھا۔"

"جو آپ کی نظروں نے کہا تھا؟"

"جی.......؟"

"سارہ.......!"

"ہاں جنید......." میں بالکل بے بس ہو گئی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ کوئی روح کے تقاضے تھے۔ یہ کوئی آسمانی ملن تھا۔ جو آپ ہی آپ ہو گیا تھا۔ پھر ہم دونوں سڑک پر خاموش چلتے رہے۔ اس سنسان اور ویران سڑک پر ہمارے لیے زندگی کی تمام تر

بہاریں جاگ اٹھی تھیں۔ پھر میرے کالج کا گیٹ آ گیا۔ میں نے جنید کی طرف دیکھا۔

"میں کل آپ سے پھر ملوں گا۔"

"کہاں؟"

"اسی سڑک پر جس نے ہمیں منزل کا پتا بتایا ہے۔"

"اچھا.......!" ہم دونوں جدا ہو گئے۔

اگلے دن میں نے ہلکے گرے رنگ کا سوٹ پہنا۔ قرینے سے دوپٹہ اوڑھا اور اپنا کالا بیگ لے کر باہر آ گئی۔ دوسری طرف سے جنید آ رہا تھا۔ اس نے بھی ہلکے گرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور کالی ٹائی باندھے ہوئے تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لباسوں کو دیکھا اور خاموشی سے چل دیئے۔

اس سے اگلے دن میں نے دیکھا کہ وہ کریم کلر کے سوٹ کے ساتھ سرخ ٹائی لگائے آ رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے۔

"تم کب تک اس آزمائش میں پڑی رہو گی سارہ۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"مجھے آزمائش کی ضرورت نہیں ہے جنید۔ یہ سب تو اپنے آپ ہو رہا ہے۔ قدرت کے کام بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں۔"

"اور کتنے پیارے بھی۔"

"جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو مجھے محسوس ہوا تم مجھ سے نفرت کرو گی۔"

"ہاں میں نے تم سے نفرت کرنے کی پوری کوشش کی۔"

"لیکن میرا دل کہتا رہا تم مجھ سے ضرور محبت کرو گی۔"

"میں ایسا کرنے پر مجبور ہو گئی۔"

"اور تم جانتی ہو کہ میں نے تمہاری بہن کو طلاق دی۔"

"یا خود اس نے طلاق لی؟"

"لوگ تو یہی کہتے ہیں تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔"

"تالی بجانے کی ابتدا تو ایک ہی کرتا ہے۔"

"میں تمہاری نظر میں نہ سہی دنیا کی نظر میں مجرم ہوں۔"

"مجھے دنیا سے کیا لینا۔"

"زمانہ تمہیں ستائے گا سارہ۔"

"میں زمانے سے مشورہ لینے نہیں جاؤں گی۔"

"تم ابھی سماج کے اصولوں کو نہیں جانتی ہو۔"

"جنید تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ میں نے شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔"

"اچھا......!" میرے دل پر منوں برف گر پڑی "محبت نہ کرنے کا تہیہ تو نہیں کیا نا؟"

"نہیں میں محبت کروں گا۔ یہاں تک کہ مر جاؤں گا۔"

"پھر ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"

"کیا تم نے گھر میرے متعلق بتایا ہے؟"

"نہیں...... اس کی ضرورت فی الحال نہیں۔"

"تم نے کبھی مجھ سے طلاق کی وجہ نہیں پوچھی؟"

"یہ کیا ضروری ہے...... جو بندھن ٹوٹنا ہوتا ہے ٹوٹ جاتا ہے۔"

"تم نے اپنی بہن کی وکالت نہیں کی۔"

"میں جانتی ہوں وہ بڑی خود پرست اور خود پسند ہے۔"

"اور سارہ میں آخر وقت تک اس کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ ایک دم فیصلے صادر کر دیا کرتی تھی۔ اس نے ایک ہی رات میں طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر عدالت کے ذریعہ زبردستی طلاق لے لی۔"

"آج سے پانچ سال پہلے میں بھی ایسی ہی تھی۔ خود پرست اور خود پسند۔"

"پھر۔"

"پھر میں نے خود کو بدلنے کی کوشش کی۔ جب سرتاپا بدل گئی تو تم مجھے مل گئے۔"

"میرا دل چاہتا ہے کہ اب زندگی ٹھہر جائے بس۔"

"بڑے خود غرض ہو دوسروں کو بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دینا چاہتے ہو۔"

"یہ جوان دنوں میری کیفیت ہے....... اسی میں موت آجائے تو شاید ان دکھوں کا کفارہ ادا ہو جائے جو تقدیر نے اب تک مجھے دیئے ہیں۔"

"پاگل نہ بنو اب زندگی کوئی کروٹ لے گی۔"

اور وہ عرش سے اترا ہوا خاکی میری روح میں سماتا ہی چلا گیا۔ دو سال اور بیت گئے۔ پھر اچانک سارہ باجی کی زندگی میں کہیں احمد بھائی آ گئے۔ سارہ باجی نے ان سے شادی کر لی۔ میری راہ کا ایک بوجھ ہٹ گیا۔

اس شام میں کشتی چلا رہی تھی اور جنید سفید کپڑے پہنے میرے ساتھ بیٹھا تھا۔

"جنید میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا.......؟"

"کیا.......؟"

"کہ میں شادی کروں گی۔"

"اچھا.......!"

"اور تم اپنا فیصلہ بدل دو گے....... میرے لیے اور صرف میرے لیے۔"

"سارہ......." میں نے دیکھا جنید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے....... خوشی کے آنسو غم کے آنسو....... تشکر کے آنسو۔

"جنید.......!" میں نے اس کے رخساروں پر انگلی رکھی۔ "یہ بہت مقدس آنسو ہیں انہیں بہنے نہ دینا۔" اس نے کمال ضبط سے آنسو پی لیے۔

اور اسی وقت میری پلکیں جھک گئیں۔

"نظریں اٹھاؤ سارہ۔" جنید نے کہا۔

"اب میری آنکھوں میں تمہارے آنسو آ گئے ہیں۔"

"میری طرف دیکھو۔" میں نے نظریں اٹھائیں۔ اب میرے آنسو جنید کے ہونٹوں پر تھے اور ہم دونوں کھلکھلا کر مسکرا دیئے۔

اسی لمحے میرے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں اور میرا دل سہاگ کے گیت گانے لگا۔ مجھے ساری دنیا پھولوں معلوم ہونے لگی۔ اور جب میں نے اپنی اماں سے کہا کہ میں جنید سے شادی کروں گی تو ان کے سر پر آسمان آن گرا۔ انہیں دنیا کا ڈر اور خاندان کی ناک کٹتی ہوئی محسوس ہوئی انہیں میرا یہ فعل قابل گردن زنی معلوم ہوا اور جب سائرہ باجی کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے بے غیرت بدقماش ناعاقبت اندیش اور ڈائن کے خطابات سے نوازا۔ اور یہ بھی کہا اگر میں نے جنید سے شادی کر لی تو وہ زہر کھالیں گی۔ میری ماں نے مجھ سے بول چال بند کر دی۔ میری سوچ کے سارے دروازے مقفل ہو گئے۔ زمانہ پھر درمیان میں حائل ہو گیا اور میں تن تنہا بھٹکتے ہوئے جنید کا سہارا نہ بن سکی۔

"جنید!"

"ہاں! میں یہ سب کچھ جانتا تھا سارہ۔"

"مگر یہ سب نامناسب ہے جنید اس میں گناہ کیا ہے؟"

"گناہ یہ ہے کہ میں تمہاری بہن سے نباہ نہ کر سکا۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"شادی ہی کرنی ہے تو اس کے کئی راستے ہیں سارہ۔ ہم کورٹ میں جا کر بیاہ کر سکتے ہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے جا سکتا ہوں۔ تم گستاخ بن کر اپنی ماں کی نافرمانی کر سکتی ہو۔ لیکن میں ان میں سے کوئی بات نہیں چاہتا۔ میں تمہیں تمہاری نظروں میں نہ گراؤں گا۔ اپنی بلندیوں سے گر کر تم کبھی سکون نہ پا سکو گی۔ مجھے تو زندگی بھر بے چین رہنا ہی ہے۔"

"جنید! جنید......." میرا دل رونے لگا۔ "مجھے ترغیب دلاؤ' خدا کے لیے مجھے ترغیب دلاؤ تا کہ میں ساری دنیا کو ٹھکرا کر تمہاری بن جاؤں۔ یہ مجھے تم کون سا راستہ دکھا رہے ہو۔" میں روتی رہی۔

"اور پھر میں تمہاری اماں کا دل اور دکھانا نہیں چاہتا۔ سارہ وہ یہ بالکل نہیں جانتیں کہ طلاق میں سراسر ان کی بیٹی کا قصور ہے۔ لیکن ان کی نظروں میں' میں مجرم ہوں۔"

"پھر اب میں کیا کروں جنید؟"

"تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"کیا.......؟"

"کہ تم ضرور کسی اور سے شادی کرلوگی۔"

"نہیں، نہیں!! میں ہرگز ایسا وعدہ نہیں کرسکتی۔"

"تمہیں میری خاطر ایسا کرنا پڑے گا۔"

"میں جھوٹا وعدہ نہ کرسکوں گی۔"

"تم وعدہ نہ کروگی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟"

"بہت دور....... تاکہ تم میری پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکو۔"

"ایسا نہ کرنا جنید۔"

"کیوں؟"

"مجھے یقین ہے میں ایک دن اپنی ماں اور سنگ دل بہن کو منالوں گی۔"

"ایسا کبھی نہ ہوسکے گا سارہ اور جب تک میں تمہارے پاس رہوں گا تم اپنے مستقبل کے متعلق صحیح فیصلہ نہ کرسکوگی۔"

"جنید خدا کے لیے کہیں جانے کی نہ سوچنا۔"

"میرے ماتھے پر جو داغ لگا ہے وہ کیسے دھوسکوں گا سارہ......."

"میں اسے اپنے آنسوؤں سے دھولوں گی جنید۔"

"میں اس کا وعدہ نہیں کرتا۔"

"تم اب مجھے کب ملوگے.......؟" میں نے ہزاروں تمناؤں کے ساتھ پوچھا۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

جنید خاموشی سے باہر چلا گیا۔ پھر میرے آنسو کب تھمے۔ آنکھیں خشک ہوگئیں۔ تھک گئیں۔ دل میں سرخ قطرے گرتے رہے لیکن اب زندگی اس مقام پر آگئی ہے۔ جہاں حصول و ناکامی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ لوگ جو دلوں کے قریب رہتے ہوں .... جن کی خوشبو سانسوں میں رچی ہو۔ وہ اس دنیا کے سمندر میں قطرہ بن کر کھو جائیں تو بھی کہاں آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ بس

من وتو کا فرق مٹ جاتا ہے۔خواب وخیال ایک ہو جاتے ہیں اور پھر نگری نگری صدا لگانے والا جب ایک در پر بیٹھ جائے تو حرص و ہوس سے بلند و بے نیاز ہو جاتا ہے۔دل ایک گدا گر تھا۔اس کا کاسہ بھر کر بھی خالی نہ ہوا۔

اور میری تو اب بھی یہی عادت ہے کہ کہیں کوئی خوشنما پھول دیکھ لیتی ہوں تو توڑ کر کتاب میں رکھ لیتی ہوں۔

ہائے لوگ سوکھے ہوئے پھولوں کو ناکارہ کیوں کہتے ہیں۔وہ پھول جو مسلے نہیں گئے پامال نہیں ہوئے۔گلے کی زینت نہیں بنے۔جن کی کنواری خوشبو ہاتھوں کے لمس سے نہیں گہناتی۔وہ تو بہت مقدس پھول ہیں۔پاک اور اونچے۔کیا ان پھولوں کے سہارے حیات کے ویران دن بسر نہ ہو سکیں گے۔

جھروکے میں چاند

اتنی سی بات سے دل چکنا چور ہو جاتے ہیں اور زندگی کی بنی بنائی عمارت دھڑام سے نیچے آرہتی ہے۔

آخر عورت کے دل کی وقعت ہی کیا ہے اس دنیا میں!

بچے کا معمولی سا کھلونا بھی راہ میں پڑا ہو۔ تو لوگ اٹھا کر اوپر رکھ دیتے ہیں کہ کہیں پاؤں تلے آ کر کچلا نہ جائے۔

لیکن عورت کا دل کھلونے سے بھی کم تر....... کھلونے سے بھی سستا ہے....... بار بار پامال کرو....... بار بار توڑو .... کون منع کرتا ہے.......؟

ارے کوئی مالک بھی ہو اس دل کا....... کوئی ٹھکانہ بھی ہو اس دل کا....... امی ابا نے پالا پوسا....... تو کیا کیا نہ احسان جتایا....... سونے کا نوالا کھلایا....... تو دس بار جتایا۔

اتنا قیمتی کپڑا نہ پہنو۔

گہنے شادی کے بعد ہی اچھے لگتے ہیں۔

کبھی سال میں ایک بار فلم دیکھ لیا کرو۔

اس مہنگائی میں کتابوں کا بوجھ اٹھائیں یا فلم کا۔

سہیلیوں سے نہ ملو....... آوارہ نہ گھومو....... آرزوؤں کو بے لگام نہ کرو....... سر ڈھک ڈھک کے گزارا کیا۔

سہج سہج تمنا کا اظہار کیا....... جو چاہا وہ نہیں ملا تو صبر کا دل نشیں جام پیا۔

اور پھر ایک دن اپنوں نے کسی اجنبی کے کاندھے پر رکھ کے ارمان بھرا ڈولا رخصت کر دیا۔

ان کے احسانات جو تھے ان کمزور کندھوں پر۔

سو سسکتی روتی لڑکی سسرال آ گئی۔

آئی تو تھی دلہنیا....... ملہار راگ اور سہاگ گیت کی چھپر کھٹ پر ارمانوں کا جھولا جھولنے۔

مگر نوشہ میاں نے بھی....... گھونگھٹ اٹھاتے ہی فرائض کا سنگار دان تھما دیا۔

لو جی....... یہاں پھر گھٹ گھٹ کر جینے کا دوسرا جنم شروع ہوا۔

ساڑھی نہیں پہنو تمہارے میاں کو پسند نہیں۔

بال نہیں کاٹو ساس کو اچھے نہیں لگتے۔

باہر گھومنے مت جاؤ....... سسر برا مانتے ہیں۔

اپنے کمرے میں ٹھٹھے مت لگاؤ....... ایک نوجوان نند بھی ہے گھر میں.......!

یہ امنڈتی گھمنڈتی برساتی ندی جیسی جوانی....... اور یہ دھنک رنگ جوبن....... یہ سب کتابی باتیں ہیں بی بی۔

زندگی تو ایک پنجرہ ہے....... قفس ہے۔

زندگی کا چلن نہیں بدلتا۔ پنجرے بدلتے رہتے ہیں۔

کبھی لوہے کا....... کبھی چاندی کا....... کبھی سونے کا۔

اچھی اور خوبصورت عورت وہی ہے۔ جو جھٹ پنجرے سے مانوس ہو جائے۔

فائقہ مسلسل روئے جا رہی تھی....... روئے جا رہی تھی۔

کبھی کبھی صرف رونے کو جی چاہتا ہے....... زبان پر تالے لگ جائیں' تو آنسو زبان بن جاتے ہیں۔ آنسو آہٹ بن جاتے ہیں۔ ایسی آہٹ جو ہر بار دل پر ہتھوڑے کی طرح لگتی تھی۔

کیا بات ہے....... دنیا میں کوئی بھی آنسوؤں کی زبان نہیں سمجھتا۔ جس طرح ابھی ابھی امی اور ابا نے اس کی ہر بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔

تو وہ بھی کیوں بتاتی اپنے دل کی جلن۔

اب تک کچھ بتایا تھا جو آج کہتی۔

پر آج انہونی ہو ہی گئی....... کہ جو نہ ہوتا تھی کبھی۔

یہ سب کیسے ہو گیا۔ اسے تعجب بھی ہو رہا تھا۔

ہنستا بستا گھر پل میں یوں بھی ویران ہو جاتا ہے.......؟ جو سان گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

ایک دن ظہور میں کیوں آ جاتا ہے۔

خدا کی قسم اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے شوہر یا ساس سے لڑ کر میکے جا بیٹھے گی....... یہ سب آپ ہو گیا....... جیسے کہ قدرت نے منصوبہ بنا رکھا ہو۔

کل سب لوگ بے حد خوش تھے۔

واہ خوشی سے بھی کچھ آ گئے۔

کل عید تھی....... فائقہ نے اپنے لیے بڑے خوبصورت کپڑے بنائے تھے....... اپنے دونوں بچوں کے لیے بنائے تھے۔ارمغان کے لیے بطور خاص نئی اچکن سلوائی تھی۔

گو ان دنوں اس کا جی اچھا نہیں رہتا تھا۔ابھی پہلا پہلا مہینہ تھا۔پھر بھی وہ علی الصبح بیدار ہو گئی تھی۔

معمول کے مطابق اس نے صبح صبح سب کو چائے پلائی....... چائے لے کر سسر کے کمرے میں گئی....... نند کو جگایا .... چھوٹے دیور کو گدگدی کی۔

سارے گھر کو صبح عید کی نوید فائقہ نے ہی دی تھی۔

پھر جلدی جلدی باورچی خانے میں جا کر سویاں ابالیں....... شیر خرما بنایا۔میز سجادی تو بچوں کو جگا کر تیار کرایا۔

گھر بھر جیسے ایک جھپاکے سے روشن ہو گیا۔

جب سب نماز پڑھنے چلے گئے تو جلدی سے تیار ہو گئی۔ارمغان کہتا تھا۔جب میں عید کی نماز پڑھ کر آؤں تو تم مجھے تیار ملا کرو۔

"تیار کس سلسلے میں بھئی۔"

"تیار....... تیار......." اس نے اپنی ایک آنکھ بند کر کے کہا تھا۔

رومان کے ننھے ننھے جھروکے....... اور محبت کی ننھی ننھی کنکریاں بیاہتا کے جذبات کو جگائے رکھتی ہیں۔ورنہ اس یکسانیت سے بھری زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔

ارمغان کا معمول تھا....... نماز پڑھ کر آتا تو پہلے اپنی امی کو جھک کر عید مبارک کہتا اور پھر سب بہن بھائیوں کو....... اتنے میں فائقہ کھسک کر اپنے کمرے میں آ جاتی' وہ بھی آ جاتا۔

سات سال ہو گئے تھے شادی کو۔

مگر عید مبارک کہنے کی ہمیشہ وہی ادا رہی۔

وہ ادا کہ جس کی خاطر فائقہ سال بھر اپنی ساس کی سختیاں سہتی رہتی۔ اور اپنے نفس سے لڑتی رہتی۔

کل بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اور پھر شام گئے....... اسے کہیں فرصت ملی کہ اپنی امی جان کے ہاں جائے۔ سسرالی عزیزوں کو بھگتانے کے بعد ماں باپ کی باری آتی تھی۔

حالانکہ سب جانتے ہیں....... عید کے روز سب والدین اپنی ہی اولاد کا مکھڑا چومنا چاہتے ہیں....... پر لڑکی کے لیے تو یہی واجب ہے کہ سسرال کا منہ دیکھتی رہے جب وہ اجازت دیں....... جب وہ ترس کھا کے کہہ دیں کہ جا....... تیری بھی کوئی ماں ہے۔ اس کے کشکول میں اپنی باسی محبت کا کوئی کھوٹا سکہ ڈال جا کے۔

شام تک مہمانوں کی آؤ بھگت کر کر کے....... بار بار چائے اور شامی کباب بنا بنا کے وہ تھک گئی تھی۔ چور چور ہو گئی تھی....... مگر جب اسے میکے جانے کی اجازت ملی تو پروا کے تازہ دم جھونکے کی مانند کھل اٹھی۔

چھپاک سے غسل خانے میں گھس گئی....... ٹھنڈے پانی کا چھینٹا تھکی تھکی آنکھوں پر مارا تو وہ جاگ اٹھیں۔

جلدی جلدی میک اپ کیا....... آج اس نے اپنی بری والا سیٹ پہنا تھا۔ بارڈر والی ساڑھی پہنی تھی آنکھوں کو فیروزی شیڈ دیا تھا۔ گلابی گلابی لپ اسٹک نے سارا چہرہ گلابی کر دیا تھا۔

"چل میری فیروزہ بائی......."

جب ارمغان نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی جانب کھینچا تو وہ سچ مچ لجا گئی۔

"یہ محبت کے لمحوں میں تمہیں گندے گندے نام کیوں سوجھتے ہیں.......؟"

"اچھا تو فیروزہ بائی گندہ نام ہے؟"

"نہیں نہیں بڑا مقدس اور پوتر نام ہے....... وضو کے بعد لینا چاہیے......."

"پاگل عورت....... جب کوئی بیوی اپنے شوہر کو گھائل کر سکتی ہے....... تو وہ ہر طوائف کو مات کر دیتی ہے۔"

"بڑا نشہ آتا تھا۔ اس کی ایسی باتیں سن کر......."

ہاں ایسی باتوں نے ہی تو اس کے پاؤں میں سات سال سے بیڑیاں ڈال رکھی تھیں ورنہ کون سا ستم تھا جو اس گھر میں اس پر نہیں ٹوٹا تھا....... سب سے بڑے اور کماؤ پوت کی بیوی ہونا بعض اوقات کس قدر تکلیف دہ بن جاتا ہے۔

وہ خوب جانتی تھی۔

بن ٹھن کر وہ امی کے ہاں پہنچی تو وہاں عید رخصت ہو چکی تھی۔ اس عید کا شور تو صبح صبح ہوتا ہے۔ جب نماز کے بعد بچوں کو کلکاریاں جھانجھنیں بن کر بج اٹھتی ہیں۔ سڑکوں پر موٹروں کی پوں پوں' شہنائی کی آواز کو مات کرنے لگتی ہے اور زرق برق کپڑوں میں ملبوس...... ہر کوئی اپنے پیاروں کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔

اس کی تمام شادی شدہ بہنیں' بہنوئی' بھاوجیں...... سب ہو کر جا چکی تھیں...... وہ لوگ اب اپنے دوستوں کے ہاں چلے گئے تھے۔ گھر پر خاموشی تھی۔ گھر پر خاموشی تھی۔ مگر امی جان اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

ابا جی نے لال لال سو کا نوٹ لا کر ارمغان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"نانا جان' ہماری عیدی۔"

ننھے ساغر اور مینا چیخنے لگے۔

امی جان نے ان کا منہ چوم لیا۔

رخصت ہوتی ہوئی عید کے دامن سے فائقہ نے خوشیوں کی آخری گرد جھاڑ لی۔ پھر رات کا کھانا کھا کر وہ اپنے گھر آ گئی۔

راستے میں گرمی بہت ہو گئی تھی۔ وہ تھک بھی تو چکی تھی اس نے اپنا فیروزے کا بھاری سیٹ اتار دیا اور اپنے پرس میں رکھ لیا۔

گھر آئی کپڑے بدلے...... چیزیں سمیٹیں...... پرس وہیں پلنگ پر پڑا رہ گیا۔

رات گئے تک لوگ آتے رہے...... جب رات کے بارہ بجے سونے کے لیے لیٹی تو پرس کا خیال آ گیا۔

دوڑ کر دیکھا۔ تو پرس کھلا پڑا تھا۔ چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ لیکن پرس میں فیروزے کا سیٹ موجود نہ تھا۔

فائقہ کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک تو اس کا پسندیدہ سیٹ' دوسرا بری کی نشانی اور تیسرے ساس کا ڈر۔ پر ہوئی ہو کر رہتی ہے۔ نواڑ کا پلنگ بغیر چادر کے پڑا اس کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ اوپر تلے سب دیکھ لیا۔ اس وقت کوئی بھی گھر پر موجود نہیں تھا۔

یا اللہ سیٹ کہاں گیا۔ زمین کھا گئی یا آسمان نے اچک لیا۔

بات کہاں چھپ سکتی ہے۔

ارمغان سے کہا تو وہ الٹا الجھ پڑا۔ اس کی ازلی بے پرواہیوں کو کوسنے لگا۔

اس کی اماں تو پہلے ہی بہو اور بیٹے کے کمرے کی طرف کان لگائے رہتی تھیں۔فوراً دوڑی آئیں۔اور پھر جاتے جاتے آرام سے بولیں۔

''وہیں چھوڑ آئی ہو گی اماں کے گھر.......؟''

''بی اماں....... میں نے خود راستے میں اتارا تھا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں امی کے گھر نہیں چھوڑ کر آئی.......''

''اے میں پوچھتی ہوں راستے میں اتارنے کی کیا تک تھی نگوڑیاں بہانہ بھی ٹھیک سے نہیں بنا سکتیں۔''

فائقہ کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

ارمغان چپ چاپ کھڑا رہا۔

فائقہ کمرے سے باہر نکل گئی۔مبادا منہ سے کوئی غلط بات نکل جائے۔

جاتے جاتے اس نے سنا ارمغان کی اماں کہہ رہی تھیں۔

''یہ سب بہانے ہیں بیٹا....... میں اس کی ماں کو جانتی ہوں بڑی لالچی ہے۔اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ضرور بہو نے سیٹ اپنی ماں کو دے دیا ہوگا۔اور اب ہم سے جھوٹ بول رہی ہے۔کم بخت جھوٹ بھی سلیقے سے نہیں بول سکتی۔بھلا بچی پرس کھول کر سیٹ کہاں پھینک سکتی ہے؟''

فائقہ کچھ دیر گم صم سی کھڑی رہی۔اس کا خیال تھا۔ارمغان اس کے حق میں بولے گا۔کیونکہ اس نے راستے میں اسے سیٹ اتارتے ہوئے دیکھا تھا....... اور جملہ بھی چست کیا تھا۔

''بھئی گاڑی تو ٹھیک طرح سے چلانے دو....... ابھی سے سب کچھ اتارنے لگی ہو۔''

''بلی کو ہمیشہ چھچھڑوں کے خواب آتے ہیں....... گرمی سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔''

''اور ادھر اسٹیئرنگ میرے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔''

''بچوں کا تو خیال کرو۔''

وہ دونوں ہنستے کھیلتے گھر آ گئے تھے۔

اور اب ارمغان چپ کھڑا اپنی امی جان کی رننگ کمنٹری سن رہا تھا۔

سونے سے پہلے فائقہ نے پوچھا۔

"کیا آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ میں سیٹ اپنی امی کو دے آئی ہوں۔"

ارمغان چپ رہا۔

"حالانکہ میں نے آپ کے سامنے اتار کر پرس میں ڈالا تھا۔"

"آخر اتارنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ غصے سے بولا۔

"یہ بات آپ اپنی امی سے تو کہہ سکتے تھے۔" فائقہ بھی اسی انداز میں بولی۔

"میں کیوں کہتا.......؟"

"وہ ایک غلط اور بے بنیاد بات کہہ رہی تھیں اور آپ یہ الزام سن رہے تھے۔"

"اپنی ماں سے کہہ دیتا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"اگر اپنی ماں جھوٹ بول رہی ہو تو ضرور ٹوک دینا چاہیے۔ ایسی ماں دوست نہیں دشمن ہوتی ہے۔"

"بکومت! اب اگر تم نے زبان کھولی تو میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔"

فائقہ سن کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

یہ وہی آدمی ہے جو تھوڑی دیر پہلے اس کے ساتھ چہلیں کر رہا تھا۔

کیا چیز ہوتا ہے یہ مرد بھی....... لوگ کہتے ہیں۔ عورت کانوں کی کچی ہوتی ہے' لگائی بجھائی میں آ جاتی ہے....... مگر یہ مرد ہے' یہ سب جانتا ہے مگر اپنی ماں پر پردہ ڈال رہا ہے....... یا چاہتا ہے میں خواہ مخواہ یہ الزام اپنے اوپر لے لوں۔

فائقہ نے بھی منہ پھیر لیا۔

مگر باقی رات نیند کس کافر کو آئی۔

اتنا بڑا نقصان ہوا سو الگ....... یہ جو اس سے بڑا الزام لگ رہا تھا۔ اس نے تو اس کی نس نس میں انگارے بھر دیئے۔

اگلا پورا دن سرد جنگ کی نذر ہو گیا۔ اماں بی نے الگ منہ پھلائے رکھا۔ بات بات میں ایک میٹھا سا طعنہ دے دیتیں۔

"اے بہو! ذرا میکے جا کر دیکھ لو....... شاید وہاں گر گیا ہو تمہارا سیٹ اور تمہاری ماں نے سنبھال کر رکھ لیا ہو......."

فائقہ جانتی تھی' ان کا کہنے سے کیا مطلب ہے۔

کیا میرے ماں باپ اتنے رذیل ہو گئے ہیں۔ وہ دل میں سوچتی کہ ایک بیٹی سے زیور مانگ کے دوسری بیٹی کو چڑھائیں گے۔

دیتے وقت انہوں نے کیا کمی رکھی تھی........ دنیا بھر کی چیزیں جہیز میں دے دی تھیں۔

اور یہ ارمغان کی اماں........ یہ تو شروع دن سے ہی ہلکے ظرف کی ہیں۔اس کے جہیز کے زیور اٹھا اٹھا کر ہاتھوں میں پرکھ پرکھ کران کا وزن دیکھتی رہی تھیں۔چوبیس طلائی چوڑیوں کو دیکھ کر تو انہوں نے صاف کہہ دیا تھا۔

"اے یہ کس قسم کی پالش ہے........ مجھے تو پیتل کی معلوم ہوتی ہیں۔"

وہی چوڑیاں جو انہیں پیتل کی معلوم ہوتی تھیں۔بعد میں انہوں نے جی بھر کے پہننے بھی نہیں دیں۔جب بھی بازار جانے لگتی۔ صاف کہہ دیتیں۔

"بہو........ بازار میں اتنا سونا پہن کر نہیں جاتے........ چوڑیاں گھر پر اتار جاؤ........ کلائیوں میں اتنا سونا دیکھ کر دوکاندار بھی زیادہ بھاؤ بتاتے ہیں۔"

"اے اماں کے گھر جا رہی ہو........ صدقے جاؤں یہ چوڑیاں اتار کر رکھ دو........ اور کلائیوں میں بری کا کڑا پہن لو۔ تمہاری اماں کیا کہے گی کہ میکے کے زیور کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔"

زیور تو شروع دن سے ہی اماں بی نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ان کا خیال تھا۔"یہ نگوڑ ماری آج کل کی لڑکیاں زیورات کی حفاظت کرنا کیا جانیں۔انہیں تو بس فیشن کرنا آوے ہے۔"

حالانکہ فائقہ جانتی تھی کہ ہر عورت اپنے زیور کی حفاظت اپنے بچے کی طرح کرتی ہے۔

اسے سہاگنوں کا ہمہ وقت کلائیوں میں طلائی چوڑیاں پہننا بہت اچھا لگتا تھا۔مگر اماں بی کو پسند نہیں تھا۔انہوں نے باتوں باتوں میں کہہ دیا تھا کہ ہمہ وقت پہننے سے چوڑیاں گھس جاتی ہیں۔وزن کم ہو جاتا ہے۔

چوڑیاں ہی کیا........ اسے تو سارا زیور پہننے کی حسرت رہی........ کبھی سسرال یا میکے میں کوئی شادی ہوتی اماں بی زیوروں کی پٹاری نکال لاتیں اور تبرک کی طرح سینت سینت کر اسے کوئی جڑاؤ پہننے کو دے دیتیں اور شادی سے واپس آتے ہی پولیس افسر کی طرح سب کچھ اتروا لیتیں۔

یہی نہیں........ اور بھی بہت سے دکھ تھے۔جو وہ یہاں اٹھا رہی تھی۔

باورچی خانے کا سارا کام اس کے ذمے تھا۔بچوں کے لیے نوکر رکھنے کی اجازت نہ تھی۔

"اے ہم نے بھی بغیر نوکروں کے ہی بچے پالے تھے۔"

"موئی بدنصیب عورتیں نوکروں پر بچے چھوڑتی ہیں۔"

اور تو اور وہ اپنی بڑی بہنوں کی طرح وقت بے وقت میکے بھی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ اماں بی کو ہر اس لڑکی کے چال چلن میں شبہ ہوتا تھا۔ جو دوڑ دوڑ کر میکے جاتی تھی۔

"کپڑا خریدو گے تو پوچھ کے......"

"کھانا کھاؤ تو اجازت لے کے۔"

"کوئی عزیز یا دوست آجائے تو اماں بی کی سنسر شپ کے بغیر گفتگو نہیں ہوسکتی۔"

"جس کو وہ پسند نہیں کرتیں۔ اس کی تواضع کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتیں۔"

کوئی ایک بات ہوتی تو وہ گلہ بھی کرتی...... اتنی ڈھیر ساری باتوں کے لیے تو صبر کا گھونٹ ہی بھرنا پڑتا ہے۔

یہ سب وہ کس کے لیے کر رہی تھی۔

اسی دشمن جاں کے لیے...... جس کے ہاتھوں کی تپش میں وہ سلگنے لگتی تھی مگر سارا دن اس سے بھی کھل کر بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ رات گئے گھڑی دو گھڑی جب وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتے تھے۔ بس وہی گھڑیاں زندگی بن جاتی تھیں۔

ظالم کو محبت کرنے کے وہ وہ قاتل انداز آتے تھے کہ وہ اس کے لیے دنیا بھر کے ستم سہنے پر کمر باندھ لیتی تھی۔

اب...... زندگی میں پہلی بار اسے ارمغان کا رویہ بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ ارمغان اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو چوری چوری اپنے میکے کا گھر بھرنے لگی ہیں۔ بھلا اس کے میکے میں کس چیز کی کمی تھی......؟ آج تک اس نے اپنی چھوٹی بہن کو ایک دوپٹہ تک تو ارمغان سے چوری لے کر نہیں دیا تھا۔

ہاں ایک دن اتنی بات ضرور ہوئی تھی کہ اس نے ارمغان سے کہا تھا۔

"سائلہ کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ میری سب سے چھوٹی اور پیاری بہن ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی شادی پر ایک طلائی سیٹ تحفے میں لے دیں...... کیا خیال ہے آپ کا......؟"

"اماں سے بھی بات کر لینا......"

ارمغان نے صرف اتنا کہا تھا۔

"اونہہ......" فائقہ کو غصہ آ گیا تھا...... بڑے فرمانبردار بنتے ہیں...... اور جیسے اماں بی اجازت تو دے ہی دیں گی۔

اس کے بعد فائقہ نے کبھی طلائی سیٹ کا ذکر نہیں کیا۔شاید اماں بی کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ گئی ہو....... یا ارمغان نے ہی بتا دیا ہو....... تو پیشگی ہی یہ سب کارروائی کی جا رہی تھی۔

اب تو کبھی نام نہیں لے گی نا تحفہ دینے کا۔

مگر تعجب فائقہ کو بھی بہت تھا۔اس نے پرس لا کر اپنے کمرے کے نواڑی پلنگ پر رکھ دیا تھا۔اس وقت اس پر بستر نہیں بچھا ہوا تھا کہ سیٹ بستر میں گھس جاتا۔اس نے تو بار بار پلنگ کو جھاڑ کر دیکھا تھا۔کمرے کی ایک ایک چیز جھاڑی تھی۔

اور پھر صبح ہوتے ہی مینا کی پٹائی کر دی تھی۔بار بار پوچھا تھا کہ رات وہ پرس سے کھیل رہی تھی۔سیٹ کہاں گیا.......؟

رونے کے سوا دو سال کی مینا کوئی جواب نہ دے پائی تھی۔

بلکہ اس نے غصے میں ساغر کو بھی بلا وجہ پیٹ دیا تھا۔حالانکہ وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اس نے پرس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

گھر کی ساری فضا کشیدہ ہو گئی تھی۔

اماں بی کا غصہ تو اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ ہمیشہ سونے پر سانپ بن کر بیٹھنے کی عادی تھیں۔

مگر ارمغان نے کیوں منہ پھلا رکھا ہے.......؟ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا....... مرد تو سکون سے سوچ سکتا ہے۔کھل کر بات کر سکتا ہے۔چلو ہمدردی نہ جتائے مگر اس کی نیت پر شک بھی تو نہ کرے۔

کیا ہوتی ہے مرد کی اصلیت بھی۔

رات کو وہ اس سے خود ہی لڑ پڑی۔

"ایک تو میرا نقصان ہو گیا۔الٹا آپ نے منہ پھلا رکھا ہے....... کیا بات ہے.......؟"

"قصور کرنے کے بعد تم زبان بھی چلانے لگی ہو.......؟"

"کیا قصور کیا ہے میں نے؟"

"اپنے ضمیر سے پوچھو......."

"میرے ضمیر کا حال آپ خوب جانتے ہیں......."

"تمہارا ضمیر میرا آئینہ نہیں ہے۔"

"پچھلے سات سال سے آپ کے اشاروں پر چل رہی ہوں۔ابھی آپ کو میرا پتہ ہی نہیں چلا......."

"عورت ہمیشہ ایک سربستہ راز ہوتی ہے۔"

"یہ بات آپ اپنی اماں جان کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"شٹ اپ فائقہ....... اس طرح تم اپنا جرم چھپا نہیں سکتیں۔"

"تو گویا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں......."

"مجھے یقین ہے....... مجھے یقین ہے......." ارمغان نے چیخ کر کہا۔

"تو پھر ایسے آدمی کے پاس رہنے کا کیا جواز ہے....... جو مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو....... جسے میرے خلوص پر اعتبار نہ ہو' جو مجھے جانتا تک نہ ہو۔"

"تو پھر کسی ایسے آدمی کی تلاش کرلو....... جو تمہیں جان سکتا ہو' کھوج لگا سکتا ہو۔"

"گندی ذہنیت کا اظہار نہ کرو ارمغان....... ورنہ میرا اس گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

"تو تمہیں اس گھر میں رکھنا کون چاہتا ہے.......؟ ان حالات میں اگر تم یہاں رہنا چاہتی ہو تو اسے تمہاری بے وقوفی کے سوا میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اچھا تو ایک معمولی سے سیٹ کے لیے آپ مجھے گھر سے نکال دیں گے......."

"سیٹ معمولی ہو سکتا ہے' مگر بھرم بہت قیمتی ہوتا ہے۔"

"آپ کے خیال میں میرا بھرم کھل گیا ہے۔"

"ہاں ہاں' یہی کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو میرا یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

وہ چپ رہا۔

"میں چلی جاؤں گی ارمغان....... ضرور چلی جاؤں گی۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو ضرور چلی جاؤں گی۔"

وہ رونے لگی۔

"ٹسوے بہا کر نہ دکھاؤ....... تمہارا خیال ہوگا کہ میں تمہیں جانے سے روک لوں گا تو یہ بالکل تمہاری بھول ہے۔"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم مجھے روک لو....... میں بھی اگر اب رک گئی تو بڑی....... بے غیرت ہوں گی۔ سات سال میں

اور بھی کئی موقعے آئے تھے۔ مگر میں نے اس گھر سے نہ جانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اب اگر تم بھی نہیں چاہتے تو میں جا رہی ہوں۔"

فائقہ اٹھ کر اپنی تیاری کرنے لگی۔

ارمغان چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

پل بھر میں یہ مرد کتنا بے مروت بن جاتا ہے۔

فائقہ کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑائیاں تو ان کی پہلے بھی بہت ہوئی تھیں۔ میکے جانے کی نوبتیں بھی آئی تھیں کئی کئی دن تک دوسرے سے بولے نہیں تھے۔

مگر فائقہ نے کبھی میکے جانے کا نہ سوچا تھا۔ ایک خوبصورت صلح کے بعد ارمغان ہمیشہ اس کا شکر گزار نظر آتا۔

خبر نہیں....... فائقہ کے دل کو زیادہ ٹھیس پہنچ گئی تھی....... یا واقعی ارمغان اس سے اکتا گیا تھا۔

یا قدرت کی طرف سے ایسی گھڑی آن پہنچی تھی۔

وہ اپنا سوٹ کیس اٹھائے....... بچوں کو ساتھ لیے باہر نکل آئی۔

ارمغان جانتا تھا۔ وہ دوسرے جی سے ہے۔ ایسے میں وہ اس کے ناز اٹھایا کرتا تھا۔

آج اس نے پرواہ بھی نہیں کی۔ وہ اتنا بھاری سوٹ کیس اٹھا کر خود ہی جا رہی تھی۔

اس کی ساس نے باورچی خانے سے جھانک کر دیکھا۔

ڈرامہ اپنے کلائمکس کو پہنچ چکا تھا۔

اونچی آواز میں بولی۔

"میکے سے خالی ہاتھ واپس نہ آنا....... اگر تمہاری ماں سیٹ واپس کر دے تو آجانا ورنہ وہیں رہنا۔"

فائقہ کو تو جیسے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

وہ جو اس طرح جانے کا ذرا افسوس ہو رہا تھا....... وہ بھی جی سے نکل گیا۔

وہ اتنی تیزی سے گھر سے نکلی جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔

امی ابا نے بھی اس بات کو معمولی بات جانا۔

"اے ایسی معمولی رنجشیں تو ہر گھر میں ہو جاتی ہیں۔ کچھ دنوں میں سب کا غصہ جاتا رہتا ہے۔"

یہ کہہ کرامی سروتے سے یوں چھالیہ کاٹنے لگیں جیسے وہ خاموشی کی زبان سے یہ کہنا چاہتی ہوں....... جب سات سال دل پر جبر کیا تھا....... تو اب کیوں اصول کا حلقہ توڑا؟

خیر ابا جی کا خیال تھا کہ ذرا سا غصہ ہے دو چار دنوں میں اتر جائے گا۔شکوے شکایات کر کے دل کا زہر نکل جائے گا اور آپ ہی آپ چلی جائے گی۔

وہ آپ ہی آپ کیوں جاتی.......؟

یہ تو ارمغان کا فرض تھا کہ اسے لینے آتا....... زیادتی اس کی تھی۔اور جب وہ اپنی ماں بی کی چھایا میں معصوم چوہا بن کے بیٹھ گیا تھا تو وہ کیوں اپنا زہر نکال دیتی۔

کتنے بے مروت طوطا چشم ہوتے ہیں یہ شوہر۔

اس نے کئی بار دل میں سوچا تھا....... ذراسی غلطی....... ذراسی لغزش....... ذراسی بھول پر آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور بیوی سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی گناہوں بھری زندگی پر ہمیشہ عفوودرگزر سے کام لے۔جیسے ان کی تو غلطی بھی کوئی نہیں ہوتی۔

انجانے پاپ کا بوجھ آپڑتا ہے۔

ان کہی بات کی سزا مل جاتی ہے۔

معصومیت تہمت میں بدل جاتی ہے۔

آخر انسان تو سبھی ہیں۔اور بشری کمزوریوں سے مبرا کوئی نہیں۔

جب خوشبودار معطر راتیں....... اور عشق کی دل لوٹ لینے والی وارداتیں وہ ستم گر بھول گیا تھا۔

تو وہ کیوں ہاتھ پھیلاتی.......؟

بھیک مانگتی محبت کی....... چھی چھی....... تو کیا عورت ہمیشہ بھیک مانگنے کو پیدا کی گئی ہے۔پہلے والدین سے بھیک مانگتی ہے۔سیکورٹی چاہتی ہے۔

پھر سسرال والوں کے آگے دامن پھیلا لیتی ہے....... آخر میں اپنی اولاد کے آگے.......!

اونہہ....... یہ دامن تو قیامت تک پھیلا ہی رہتا ہے۔

کوئی اسے محبت کہہ لے....... خلوص کہہ لے....... یا مجبوری کہہ لے۔

اسے ساری وارداتیں جھوٹ ...... اور سب رشتے ملمع کاری نظر آنے لگے۔غصہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

اس پر اس کی ساس روز کسی آئے گئے سے کچھ کہہ دیتی۔اور وہ تھوڑے سے اضافے کے ساتھ اس کے پاس پہنچ جاتا۔حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بات پہنچانے والے اپنا حساب بے باق کرنے کے لیے اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کرتے ہیں جو منہ پر نہیں کہہ سکتے وہ کسی کا نام لے کر کہہ دیتے ہیں۔

مگر پھر بھی ...... کبھی غصہ نہ کرنے والی فائقہ ...... ساس پر ہر دم نثار ہونے والی ...... اور شوہر کی مجسم باندی خفا ہو بیٹھی تھی اور بری طرح خفا ہو بیٹھی تھی۔

جس آئینے پر کبھی میل نہ جمی تھی۔وہ آئینہ اتنا گدلا ہو رہا تھا کہ اسے دھونے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔

غضب یہ ہوا کہ اس کی طبیعت اور بھی خراب رہنے لگی ایسا ہمیشہ ہوتا تھا جوں جوں دن گزرتے تھے اور وہ بیزار ہوتی تھی ......لاچار ہوتی جاتی تھی ...... اور آخری مہینوں میں تو بالکل پلنگ کے ساتھ لگ جاتی تھی۔ارمغان کو معلوم تھا ...... اس کی طبیعت کا حال ...... مگر کھڑے کھڑے پوچھنے بھی نہیں آیا۔

دکھ درد میں ساتھ دینے والی ...... اور جان قربان کرنے والی بیوی کچھ بھی نہیں ...... پل میں سب ناطے ٹوٹ گئے۔ایک اماں جان رہ گئیں ...... تو وہ شاید قیامت تک جینے کا تہیہ کر کے آئی تھیں۔

کچھ اور مہینے گزرے تو فائقہ نے سنا ارمغان ملک سے باہر چلا گیا ہے ...... تب اسے اپنی بدنصیبی کا یقین سا ہو گیا۔

کبھی کبھی جی میں سوچتی اس نے ناحق ضد کی ...... خود ہی چلی جاتی تو اچھا تھا ...... خواہ مخواہ ضد میں بچوں کی زندگی بھی برباد کی ...... دو گھٹنے سے لگائے بیٹھی تھی ...... اور تیسرا آنے والا تھا۔

اپنا بھرم رکھنے کے لیے امی جان نے تو یہی مشہور کر رکھا تھا کہ اس بچے کے دوران اس کا جی اچھا نہیں رہتا۔مسلسل بیمار رہتی ہے۔اس لیے میکے میں لے آئی ہوں ...... ولادت کے بعد چلی جائے گی۔

مگر کہنے والوں کی زبان تھوڑی پکڑی جاتی ہے ...... وہ تو یہ بھی آ کر کہہ دیتے تھے کہ اس کی ساس آج کل نئی بہو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

اف اللہ وہ تھرا جاتی ...... ناکردہ گناہ کی اتنی روح فرسا سزا بھی ہو سکتی ہے؟

انہی دنوں اس کے ہاں ننھا جام آ گیا ...... ارمغان نے تو اس کا نام پیشگی ہی تجویز کر دیا تھا ...... مگر وہ سوچوں کے

کربناک دورا ہے پر تھی۔

"ایک سیٹ کی حقیقت کیا ہوتی ہے......." ابا برابر کہہ رہے تھے۔" میں نیا سیٹ بنوا دیتا ہوں....... جا کر اپنی ساس کو دے دو....... پندرہ بیس ہزار کے لیے اپنی زندگی کیوں داؤ پر لگا رکھی ہے۔"

مگر....... فائقہ نے اسے اپنے وقار کا سوال بنا لیا تھا۔ بات پندرہ بیس ہزار کی نہیں تھی۔ بھرم کی تھی....... اعتماد کی تھی۔

کیا یہ سب کرنے کے باوجود ارمغان کو اسی طرح چاہ سکے گی؟ اپنی ساس کی عزت کر سکے گی....... اور پھر اس کا تو یہ مطلب ہو گا کہ اس نے وہ الزام قبول کر لیا۔ ساس تو ہر دم اٹھتے بیٹھتے یہی کہے گی کہ....... "مارے شرم کے بدلوا کر سیٹ دے دیا۔"

افوہ.......

کیسے کیسے اذیت ناک کانٹے تھے....... جو جسم و جان میں چبھ رہے تھے۔

زندگی کے ننھے ننھے مسائل کو ہم اپنی انا کے ناگ بنا لیتے ہیں....... کبھی معاف کرنے کی رسم ہو....... تو کبھی کوئی زندگی برباد ہو۔

کوئی دل نہ دکھے.......!

سسرال کی طرف سے آس ٹوٹی تو جیسے فائقہ کی زندگی میں سناٹا چھا گیا۔

رینگ رینگ کر اور سسک سسک کر لمحات اس کا منہ چڑانے لگے۔ سارا دن تو ننھے جام میں لگی رہتی....... اتنی روشنی حافظے پر پڑتی کہ چھوٹی بڑی ہر بات یاد آنے لگتی۔

بعد کے دنوں میں کج ادائیاں بھول جاتی ہیں....... دلبرائیاں یاد آ کے تڑپانے لگتی ہیں۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ تھوڑے عرصے کی جدائی کتنی خوبصورتی ہوتی ہے....... کبھی کبھی دور بھی ہونا چاہیے۔ دور جانے سے نفرتوں کی گرد اتر جاتی ہے۔ محبت کی صورت واضح نظر آنے لگتی ہے۔

پھر فائقہ سوچنے لگتی۔

ناحق ضد کی....... پہلے بھی ساس بکتی جھکتی تھی۔ وہ کان بند کر لیا کرتی تھی۔ دو چار دن بول بال کے وہ چپ ہو جاتی تھی۔

پہلے بھی ارمغان اپنے دل کا بغض نکالا کرتا تھا۔

دو چار دن بعد ایک آدھ جھڑپ کا ہو جانا تو ضروری تھا اور پھر مرد تو اونٹ ہوتا ہے....... اپنا عناد ضرور نکالتا ہے۔

وہی درگزر کر دیا کرتی تھی۔

ماں اور بیٹے کے درمیان وہ گیند کی طرح اچھلتی رہتی تھی۔

ماں اپنے بیٹے کا غصہ بھی فائقہ پر نکالتی۔

اور ماں کی ہر بے ہودگی کا غصہ ارمغان فائقہ پر نکال لیا کرتا۔

گویا وہ اس گھر میں ایک تجرباتی عنصر کی طرح استعمال کی جا رہی تھی۔

مگر اسے خوشی بھی تھی دو کناروں کے درمیان وہ ایک پل کا کام دے رہی تھی۔ کبھی اس نے خلیج بن جانے کی کوشش نہیں کی۔ ان تمام اذیتوں کے باوجود وہ بیٹے کو ماں سے بدظن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ماں بیٹے کے رشتے کو پہچانتی تھی اور سوچا کرتی تھی .... میرا ساغر جب بڑا ہو جائے گا۔ تو پھر اس کی زندگی میں بھی ایسے مسئلے پیدا ہوں گے۔ وہ ایک اچھی ماں اور ایک اچھی ساس بن کر دکھائے گی۔

جہاں اتنا کچھ سہہ لیا تھا۔

اتنی زندگی گزر گئی تھی....... وہاں باقی ماندہ دن بھی گزار دیتی۔ بھلے ماں باپ سے ملنا چھوڑ دیتی۔

اب ان بچوں کا کیا ہوگا؟

ساغر اور مینا ابو کے بغیر بہت اداس تھے۔ بلکہ چڑچڑے ہو گئے تھے۔

اور جام کو تو کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ تین مہینے کا ہو گیا تھا۔ ہر آیا گیا پوچھتا تھا کہ فائقہ سسرال کیوں نہیں جاتی۔

اور جب اس کی ساس سے پوچھا جاتا تو وہ صاف کہہ دیتی۔

"اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اپنا منہ چھپا کر بیٹھ گئی ہے۔ یہاں کیا کرنے آئے گی.......؟"

ارمغان بھی یہاں نہیں تھا۔

جانے کہاں چلا گیا تھا۔

یہاں ہوتا تو وہ ضرور اسے منا لیتی۔ بے غیرت بن کر چلی جاتی۔

انا....... وقار....... پندار۔

سب منہ زور جوانی کے ہتھیار ہیں۔

جب جوانی کو لگام ڈالی جاتی ہے۔

تو چھن سے یہ ہتھیار ٹوٹ جاتے ہیں۔

خواہ مخواہ وہ ضد میں آ گئی تھی۔

ضد کا طلسم ٹوٹا تھا....... تو وہ شکست خوردہ سی کھڑی تھی۔

کیا کرتی.......؟

حیرت سے سب کا رویہ دیکھا کرتی....... زندگی کا یہ نیا رخ اس کے سامنے آیا تھا۔لڑکی اپنے گھر میں خوش ہو۔اس کا شوہر اس کی عزت کرتا ہو تو "میکے" والے بھی سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ورنہ.......

کیسا سرد سرد اور جی جلانے والا سب کا رویہ تھا۔

بھابھیاں بات بات میں طنز کرتیں۔

بہنیں بے بات ہی سمجھانے بیٹھ جاتیں۔

امی نے اس کی پرواہ کرنا ہی چھوڑ دی تھی برا نہیں کہتیں تھیں تو اچھا بھی نہیں کہتیں۔ان کے پاس اس کی بات سننے کا بھی وقت نہیں تھا۔

ابا جی کھڑے کھڑے سر پر ہاتھ پھیر جاتے۔

بھائی یوں مزاج پرسی کرتے جیسے ترس کھا کر چمکار رہے ہوں۔

بچے ڈانواں ڈول پھرتے۔

بچوں سے ان کا نخرہ چھن گیا تھا۔

اپنے باپ کا گھر تو ایک سلطنت ہوتی ہے....... تخت ہوتا ہے' تاج ہوتا ہے.......

بے تاج کر دیئے تھے اس نے بچے.......!

جام کو سینے سے لگا کر دودھ پلاتے وقت اس کے سینے میں ہوک اٹھا کرتی۔

ساون کے مٹیالے دنوں میں....... دور کسی گھنے درخت کے پیچھے چھپ چھپ کر کوکنے والی کالی کوئل کی طرح وہ اپنا آپ چھپائے بیٹھی تھی....... گو دل سے ہوک اٹھا کرتی۔مگر سنسان دوپہروں میں دردناک کوک پر کون کان دھرتا ہے۔

زندگی کی کہانی وقت سے پہلے ختم ہو جائے....... تو پھر کہاں سے ابتدا کی جائے.......؟

جن دنوں پچھتاوے اس کی جان جلا رہے تھے....... انہی دنوں رمضان بھی شروع ہو گیا۔

بڑی عقیدت سے اس نے روزے رکھے اور بڑے خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھیں....... اور رات کو تاروں بھرے آسمان تلے لیٹ کر نم تکیے کا تن اپنے آنسوؤں سے گیلا کیا۔

صبح عید تھی۔

چاند نظر آ گیا تھا۔

گھر میں شور مچا تھا۔لوگ باگ عزیز دوست بھاگ بھاگ کر چاند کی مبارک باد دینے آ رہے تھے۔ان میں پیش پیش وہ لوگ تھے۔جنہوں نے ایک بھی روزہ نہیں رکھا تھا۔لیکن یوں خوش تھے۔جیسے آج ساری زنجیریں ٹوٹ گئی ہوں۔

فائقہ نے کھانا بھی برائے نام کھایا....... اور بچوں کو لے کر اوپر آ گئی۔

اوپر چھت پر اس نے ایک کمرہ لے کر رکھا تھا۔اور سب سے الگ تھلگ وہیں پڑی رہتی تھی۔

اس نے بچوں کے لیے بھی نئے کپڑے نہیں بنائے تھے۔اپنے تو خیر کیا بناتی حالانکہ امی نے بطور خاص بازار جا کر اس کے اور بچوں کے کپڑے لا دیئے تھے۔

جانے ایسی مہربانیوں سے اسے دکھ کیوں ہونے لگا تھا؟

بچوں کو مار پیٹ کے اس نے جلدی سلا دیا....... اور پھر خود آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔

پچھلا سال یاد آ گیا۔

کیا کیا نہ تیاریاں کی تھیں اس نے....... گھر آباد ہو تو خوشیاں دہلیز سے باہر نکلتی ہیں۔عورت کا ظرف بہت بڑا ہونا چاہیے۔ ذرا سی تنگ دلی اس کا اپنا سکون لوٹ لیتی ہے۔

وہ پڑی روتی رہی۔

وہ ایک ایک اشک کے ساتھ یادوں کی مالا پروتی رہی۔

اس کا جی چاہتا وہ عید کی صبح نہ دیکھے اور کہیں چلی جائے۔

امی نے اسے دو تین دفعہ آوازیں دی تھیں۔

آئے ہوں گے رشتہ دار...... اس نے دل میں سوچا...... ہمدردی کے بہانے کچوکے لگائیں گے۔

یوں چکاریں گے جیسے نشتر زنی کر رہے ہوں۔

وہ بھی چپکی پڑی رہی۔

ہر بات جب نیچے کوئی مہمان آتا...... نئے سرے سے شور اٹھتا نئے سرے سے اس کے دل میں درد بیدار ہوتا۔

پھر یادوں کا تازہ دم ریلا اس کی آنکھوں سے سیلاب کی صورت میں امڈ آتا...... نیچے خوب گپ بازی ہو رہی تھی

...... سب کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں...... بار بار اس کا نام لیا گیا۔ اسے بلایا بھی گیا۔

مگر وہ بہری گونگی بنی پڑی رہی۔

لوگ تو اپنا فرض ادا کر رہے ہیں...... اس کی دلجوئی کرنے کے لیے اسے بلا رہے ہیں...... وہ کیوں جائے نیچے......؟

اس نے پورے چہرے پر تکیہ رکھ لیا۔ تا کہ کوئی آواز اس کے کانوں میں نہ آئے...... اور کروٹ بدل لی۔

اچانک موتیا کے پھولوں میں بسا بسایا ایک جھونکا آیا...... اور پھر اس کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ اس کی قوت شامہ بہت تیز تھی۔

پھر بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا۔

اس نے سن رکھا تھا...... کہ ویران کوٹھوں پر بھوت پریت بسیرا کر لیتے ہیں...... کبھی کبھی چڑیلیں روپ بدل کر یوں ہی

خوشبو کی لپٹیں اڑاتی آتیں...... اور بچوں کو لپٹ جاتی ہیں۔

فائقہ تڑپ کر اٹھی۔

اٹھتے ہی کسی سے ٹکرائی اور پھر زمین پر گر گئی۔

مارے خوف کے اس کی چیخ بھی نہ نکل سکی۔ وہیں فرش پر پتھر ہو گئی...... جب کسی انسانی جسم نے جھک کر اسے اٹھایا۔ تو وہ

اس مدھم روشنی میں دیکھنے کے قابل ہو سکی۔

"آپ...... آپ......"

"ہاں میں......!"

ارمغان نے موتیوں کے گجرے اس کے سرہانے رکھ دیئے۔

کیسی سہاگن سی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی۔

اسے سمجھ نہیں آئی وہ کیا کرے........؟"

"بیٹھنے کے لیے نہ کہو گی........؟"

"یہ جگہ اس قابل کہاں کہ آپ بیٹھ سکیں........"

"طعنے نہ دو........ بڑی دور سے آ رہا ہوں........"

فائقہ جھر جھر رونے لگی۔

ارمغان اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔

پھر لپک کر اسے پکڑا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

کہاں تو وہ گھڑی بھر پہلے اس کے لیے بے تحاشا اداس تھی اسے یاد کر کے آنسو بہا رہی تھی........ اس کے قرب کی تمنا کر رہی تھی۔

اور کہاں........ اس کے قریب آتے ہی سارے گلے شکوے آپ ہی جاگ اٹھے۔

آج آپ نے کیسے تکلیف گوارا کی........ بچوں کا خیال کیسے آ گیا........ کیا میرا بن باس پورا ہو گیا........؟"

"بن باس تو میں کاٹ کر آ رہا ہوں........" وہ ہنس کر بولا۔

"مجھے تو اچھے خاصے ہٹے کٹے نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں یہ فرق ہوتا ہے ماں اور بیوی کی نظر میں........"

"تو رہیے اپنی ماں کے پاس۔ کس نے بلایا تھا........"

"بھئی میں اپنی ماں کے پاس کہاں تھا۔ میں تو اسے بھی چھوڑ گیا تھا۔"

فائقہ کو ساری باتیں یاد آ گئیں........ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

"مجھے معلوم ہے تم مجھ سے خفا ہو........ لیکن میری بات تو سن لو........"

"تم جانتی ہو اماں جان بہت ضدی ہیں۔ تمہارے آنے کے بعد انہوں نے مجھے قسم دی تھی کہ میں تمہیں لینے نہ جاؤں۔ اگر میں قسم توڑ کر آ بھی جاتا تو گھر میں ایک مسلسل بدمزگی سی رہتی۔ جس میں تمہاری پوزیشن کمزور ہو جاتی۔ اس لیے میں اماں جان کو تنگ کرنے کے لیے دوبئی چلا گیا تھا۔ وہاں جا کر لکھ دیا کہ میں ان حالات میں گھر واپس نہیں آؤں گا۔ جب تک وہ مجھے تمہیں لانے کی

اجازت نہیں دیں گی۔ وہ برابر کہے جارہی تھیں' فائقہ خودگئی تھی' خودہی آجائے۔۔۔۔۔۔۔ "لیکن میں تمہیں لے کر جانا چاہتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار تم روٹھی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں منانا میرا فرض تھا۔۔۔۔۔۔۔ ایک بار پہلے بھی میں سہروں' باجوں کے ساتھ تمہیں یہاں سے لے گیا تھا۔ میں ہر بار تمہیں لینے کے لیے آسکتا ہوں' مگر اماں جان کی خودی مجروح کر کے نہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں انہیں خود اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

"ابھی رمضان میں اماں جان کا ایک بہت مزے کا خط آیا تھا۔ وہ خط پڑھتے ہی میں چلا آیا۔"

"میں بھی تو سنوں کتنے مزے کا تھا وہ خط۔۔۔۔۔۔۔؟"

فائقہ نے تنے تنے سے لہجے میں کہا۔

"امی جان نے لکھا تھا۔ ایک دن وہ سارے گھر کی صفائی کرا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ تو خیال آگیا کہ تمہارے کمرے میں جو نواڑ کا پلنگ پڑا ہے وہ نکلوا کر دوبارہ کسوا دوں۔ بہت ڈھیلا ہو گیا۔ نواڑ کھلوائی تو اندر سے تمہارا سیٹ برآمد ہوا۔۔۔۔۔۔۔ غالباً مینا نے سوراخوں میں سے اندر ڈال دیا تھا۔"

"اس کے ساتھ ہی امی جان نے جلد آنے اور بہو کو لانے کی درخواست بھی لکھی تھی۔ تو میں حضور کے قدموں میں چلا آیا۔"

یہ سنتے ہی جہاں فائقہ کو روحانی مسرت ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ وہاں غصے کا ایک ابال اٹھا۔ اب وہ حق پر تھی۔ اس کا پلہ بھاری تھا۔ اس لیے وہ اپنا سارا غصہ نکالنا چاہتی تھی۔

ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔

"اب بھی آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری اماں' تمہارے لیے کوئی نیک اور دیانت دار بہو ڈھونڈ لیتی۔۔۔۔۔۔۔ سال بھر مجھے اذیتیں دے کے کس شان سے مسکراتے چلے آئے ہو۔ جیسے میں تمہیں یا تمہاری اماں کو معاف ہی تو کر دوں گی۔"

"تو کیا سزا دو گی تم ہمیں۔۔۔۔۔۔۔؟"

"بس زندگی بھر نہیں جاؤں گی میں تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔" فائقہ ایک دم سے بھاری بھر کم عورت بن گئی۔ اس کی آواز میں خود اعتمادی اور لہجے سے عزم جھلکنے لگا۔

"الو کی پٹھی۔۔۔۔۔۔۔" ارمغان نے سارے پھول کھینچ کر اس کے منہ پر دے مارے۔۔۔۔۔۔۔ یہ اس کی پرانی ادا تھی۔۔۔۔۔۔۔ کچھ بالوں میں اٹک گئے اور کچھ اس کی گود میں آگرے پھر اس کا بازو زور سے پکڑ کر بولا۔

"تو نے مجھے بری بری عادتیں ڈالی ہیں....... اتنے ناز اٹھائے ہیں میرے کہ مجھے کسی دوسری عورت کے قابل نہیں چھوڑا .... کم بخت دن رات کا کون سا حصہ ہے جب تو مجھے یاد نہیں آئی....... خط ملتے ہی پاگلوں کی طرح دوڑا آیا ہوں۔اماں کے ہاں نہیں گیا....... سیدھا یہاں آیا ہوں۔تجھے لے کر وہاں جاؤں گا۔"

ارمغان کے ہاتھوں کی جنبش جارحانہ سی ہوگئی۔

"اور تو مجھ سے پوچھتی ہے....... میں کیوں آگیا ہوں....... کیوں آگیا ہوں میں....... ابھی بتاتا ہوں۔کل عید ہے اور تجھے یاد ہے سات سال سے ہمارے گھر میں کیا ہورہا ہے۔میں جب عید کی نماز پڑھ کر آتا ہوں۔تو تو چوتھی کی دلہن بنی میری منتظر ہوتی ہے....... مجھے دیکھتے ہی کھسک کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور سب کی نظر بچا کر میں بھی تیرے پیچھے آجاتا ہوں۔ذرا سوچو تو......."

تمہاری اس ایک ادا کے لیے میں سال بھر انتظار کرتا ہوں۔تیرے اس والہانہ پن پر نثار ہونے کے لیے....... اور کیا تو چاہتی تھی کہ میں یہ عید تیرے بنا ہی گزار دیتا....... ستاروں کی مدھم روشنی میں ارمغان اس کی گیلی گیلی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

روٹھی روٹھی فائقہ کے دل میں گھونگھرو بج اٹھے....... سارا جسم آگ کے شعلوں میں جلنے لگا۔

میں جانتی ہوں۔

وہ سوچنے لگی۔

میں جانتی ہوں....... میں ہار جاؤں گی۔

تیرے ہاتھوں کی تپش کے آگے....... تیری باتوں کے خمار کے آگے اور تیری اس آخری بات کے لیے۔

سارے سال کے دکھ....... اذیتیں....... کرب' ہجر کے صدمے' رسوائیاں' اضطراب کی منزلیں....... سب بھول جاؤں گی۔

سب گلے شکوے کی منزلیں....... سب بھول جاؤں گی۔

سب گلے شکوے طاق پر رکھ دوں گی۔

سر جھکا دوں گی۔

اور جفا شعار! تیری اسی ادا کے آگے۔

میں مان لوں گی۔

چپ چاپ....... دل وجان سے۔

میں جانتی ہوں۔

میں جانتی ہوں.......

اس نے دھیرے سے اپنا سر ارمغان کے سینے پر رکھ دیا۔

کہ عید اپنی زرتار پالکی میں بیٹھی قدم قدم افق کی طرف بڑھ رہی تھی.......!

◆◆◆

نقاب

''حریم کالج'' کے گیٹ سے کچھ تھوڑی دور پر ایک دلخراش حادثہ ہوگیا۔ ہوا یوں کہ تین برقعہ پوش لڑکیاں بس سے اتر کر تیز تیز قدموں سے کالج کے گیٹ کی طرف آرہی تھیں۔ دس بج چکے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ کہیں گیٹ کا چوکیدار اب دروازہ کھولنے سے انکار ہی نہ کردے۔ اسی خوف کے مارے وہ چلنے کی بجائے گویا دوڑتی آرہی تھی۔ ویسے بھی یہ کالج شہر کی حدود سے باہر تھا اور یہ سڑک جلدی سنسان ہوجاتی تھی۔ اسی لیے وہ مین روڈ کو چھوڑ کر کالج کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہری ہری گھاس پر باڑھ کے زیر سایہ بھاگی چلی آرہی تھی کہ جانے کس سمت سے تین لفنگے جھپٹ کر نکلے اور انہیں دبوچ لیا۔ نیم تاریک سڑک پر چھ انفاس میں کشتی ہونے لگی۔ لڑکیاں اپنے بچاؤ کے لیے ہر ممکن کوشش کررہی تھیں۔ اس لیے ان کے پرس' کتابیں اور خریداری کے تھیلے دور جا گرے تھے۔ سوئے اتفاق اس وقت مین روڈ پر کوئی بس یا ٹرک بھی نہیں گزر رہا تھا جس کی تیز روشنی ان بدمعاشوں کو خوف زدہ کر کے جگا دیتی۔ گو کالج کا گیٹ چند گز کے فاصلے پر تھا' مگر وہ بدنامی کے خوف سے مدد کے لیے چلائی بھی نہیں تھیں۔ پھر ایک اور خدشہ بھی تھا۔ سنسان رات میں مدد کو آنے والے کہیں سارے ہی لٹیرے نہ بن جائیں۔ بسیار کوشش کے بعد دو لڑکیاں اپنا آپ چھڑانے کے قابل ہوگئیں۔ اس لیے چھوٹتے ہی وہ کالج کی طرف دوڑ گئیں۔ مگر تیسری لڑکی جو قدرے دیر سے پہنچی' لٹ چکی تھی۔ چوکیدار نے انہیں پہچان کر دروازہ کھول دیا اور وہ کالج کے اندر داخل ہوگئیں۔ اندر پہنچ کر تیسری لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ باقی دو اسے تسلیاں دیتی جاتیں۔

''خدا کے لیے اس طرح نہ روؤ' سارا ہوسٹل اکٹھا ہوجائے گا۔ لڑکیاں طرح طرح کے سوالات پوچھیں گی اور ہم بدنام ہوجائیں گی۔''

مگر وہ ہذیانی انداز میں روتی جاتی اور کہتی جاتی ''ہائے اللہ تم نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔''

''بے وقوف! ہم نے تو بڑی مشکل سے اپنا آپ چھڑایا۔ اگر تجھے چھڑانے لگتے تو وہ لوگ ہمیں پھر پکڑ لیتے۔''

''مگر تم نے اپنا آپ بچا لیا' میری مدد نہیں کی۔ ہائے میں مر جاؤں' میں کہیں کی نہ رہی۔''

وہ سر پٹخ پٹخ کر رو رہی تھی اور جو منہ میں آتا کہہ رہی تھی۔ اس لیے اسے ہوسٹل کے اندر لے جانے سے پہلے دونوں لڑکیوں نے دور پرے ایک بنچ پر بٹھا دیا اور اچھی طرح رونے کا موقع دیا۔ تیسری لڑکی جس کا نام زبیدہ تھا' اس کی بس تقدیر بری تھی جب لڑکے

نے اچانک پیچھے سے آ کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑا تو اس کے دونوں بازو بھی ساتھ ہی جکڑے گئے۔ جبکہ دوسری دونوں لڑکیوں کے بازو اور ہاتھ آزاد تھے۔ زبیدہ نے اپنے بازو چھڑانے کے لیے زور لگایا تو چہرے کا نقاب کھسک گیا۔ نہ صرف کھسکا بلکہ زورا زوری میں نقاب کی رسیاں اس کی گردن کے گرد لپٹ گئیں۔ نقاب کچھ اس طرح گھوم گیا کہ وہ خود اپنے نقاب میں قید ہو گئی۔ نہ کچھ دیکھ سکتی تھی نہ مدافعت کر سکتی تھی لڑکا حاوی ہوتا گیا۔ اگر اس کا نقاب اس کے چہرے کو قید نہ کرتا تو یقیناً وہ اتنی کمزور نہ تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

کتنی بار وارڈن نے تنبیہ کی تھی کہ سب لڑکیاں رات کے آٹھ بجے ہوسٹل میں واپس آ جایا کریں کیونکہ آج کل حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ مگر وہ تینوں کوئی پہلی بار تو گئی نہیں تھیں پہلے بھی کئی بار وہ شاپنگ کرنے کی اجازت لے کر میٹنی شو دیکھ آتی تھیں۔ آج انہیں میٹنی شو میں ٹکٹ نہیں ملے تو انہوں نے چھ بجے والا شو دیکھ لیا۔ چوکیدار سے ان کی کافی جان پہچان تھی۔ دو چار روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتی تھیں۔ اس لیے وہ بطور خاص ان کو پہچاننے لگ گیا تھا۔ مگر انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اس قسم کا حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر بھی زبیدہ روتی رہی۔ کچھ لڑکیاں اچانک ان کے کمرے میں آ گئیں اور کرید کرید کر رونے کی وجہ پوچھنے لگیں۔

آصفہ اور مریم نے جلدی سے کہہ دیا "اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

"تو جاؤ سک روم سے گرم پانی کی بوتل لے آؤ۔" ایک نے جلدی سے کہا۔

"ابھی جا کر لاتی ہوں۔" مریم نے آہستہ کہا۔

ان کے جانے کے بعد زبیدہ کے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔ "خدا کے واسطے زوبی اپنے اوپر رحم کرو۔ کیوں اشتہار بن رہی ہو۔"

"میں کیا کروں....... میں کیا کروں....... میری زندگی برباد ہو گئی۔ میں تباہ ہو گئی اور تم کہہ رہی ہو چپ رہوں۔"

"پھر بھی اب صبر کرو زوبی۔" آصفہ نے اسے چمکار کر کہا۔

"صبر کرنے سے کیا یہ سب کچھ واپس مل جائے گا؟"

"نہیں....... واپس تو نہیں مل جائے گا۔ مگر تم بدنامی سے ضرور بچ جاؤ گی۔ اللہ نے اس بات پر پردہ ڈالا ہے تم بھی ڈالو۔ سوچو اگر عین اس وقت لوگ سڑک پر جمع ہو جاتے تو کیا ہوتا؟ صبح کو یہ خبر اخبار میں لگ جاتی۔"

"ہائے اللہ میں مر کیوں نہ گئی۔" زبیدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچے اور پھر ہذیانی انداز میں چیخنے لگی "ہائے اللہ! تم

دونوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔"

وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ واقعی انہوں نے اس کے لیے کچھ کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ وقت تو قیامت کا وقت تھا۔ کوئی نہ جانتی تھی کہ کس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بس ہر ایک کو ایک ہی دھن کہ کسی طرح جنگلی بھیڑیے کے چنگل سے چھوٹ جائے۔ تینوں اپنے اپنے طور پر زندگی بھر کا زور لگا رہی تھیں اور حلق میں اپنی چیخیں دبا رہی تھیں۔ جونہی دم بھر کو وہ چھوٹیں۔ کالج کی سمت دوڑیں۔ کون کب پہنچی؟ یہ تو انہیں ہوش نہ تھا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے زمین پر بکھری ہوئی اپنی چیزیں بھی نہیں سمیٹیں۔ کتنا خوبصورت پرنٹ تھا۔ جس کا ایک ایک سوٹ دونوں نے لیا تھا۔ مریم کے پرس میں بقایا پچاس روپے تھے اور آصفہ کے تو ابھی ایک سو روپے باقی تھے۔ اس نے ابھی کالج کی فیس بھی دینا تھی۔ لیکن اپنی عزت کے آگے ان باتوں کا ہوش کہاں رہتا ہے؟ اپنی اپنی پونجی بچا کر بھاگیں تو پلٹ کر نہیں دیکھا۔

زبیدہ تمام رات ہذیانی انداز میں روتی رہی' چیختی رہی۔ حتیٰ کہ صبح کالج بھی نہ جا سکی اور اسی پیٹ درد کا عذر دھر کے انہوں نے اس کی عرضی بھجوا دی۔ آصفہ جا کر وارڈن سے گرم پانی کی بوتل لے آئی تھی۔ تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ زبیدہ واقعی بیمار ہے۔ دن کے وقت جب وارڈن راؤنڈ پر نکلی' تو کھڑے کھڑے اس کے کمرے میں بھی آ گئی۔ اس کی سوجی سوجی آنکھیں اور زرد پیلی رنگت دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ واقعی زبیدہ کو تکلیف ہے۔ زبیدہ اس وقت بھی اپنے آپ میں نہ تھی۔ وارڈن کو دیکھ کر کچھ دیر تو اٹھنا ہی بھول گئی اور جب ہوش میں آ کر اٹھنا چاہا تو وارڈن نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"لیٹی رہو۔ لیٹی رہو۔ تم نے کوئی دوا لی ہے۔" اس نے پھر پوچھا۔

"جی اسپرین کھائی تھی۔" وہ ٹوٹے ہوئے دل سے بولی۔

"اگر ڈاکٹر کے پاس جانا چاہو تو میں بھجوا دوں؟"

"جی نہیں۔" زبیدہ نے تقریباً لرز کر کہا۔ "میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

ہوسٹل میں آئے دن لڑکیوں کو اس قسم کا درد ہوتا تھا اور پھر دوسرے تیسرے دن ٹھیک بھی ہو جاتی تھیں۔ اس لیے وارڈن اپنی تسلی کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد زبیدہ پھر زار و قطار رونے لگی۔

زبیدہ اوکاڑہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور آئی تھی۔ اوکاڑہ میں وہ اپنی نانی کے پاس رہتی تھی۔ اس کے ماں باپ میں کبھی نہیں بنی جب وہ چھوٹی سی تھی تو اس نے گھر میں بس لڑائیاں ہی دیکھی تھیں۔ آخر اس کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دے

دی۔ کچھ عرصہ بعد اس کی ماں نے ساہیوال کے ایک زمیندار سے شادی کر لی اور اسے نانی کی تحویل میں دے دیا۔ کیونکہ زمیندار زبیدہ کو اپنے پاس رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ زبیدہ کی ماں کبھی کبھی نانی کے پاس آ کر اس سے مل جایا کرتی تھی۔ اور بہت سے پیسے اور تحفے تحائف بھی لاتی تھی۔ ویسے اس کی ماں کے زمیندار سے اور بچے بھی تھے۔ اس لیے وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کرتی تھی۔ زبیدہ کی نانی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالف تھی۔ بی اے کرنے کے بعد جب زبیدہ نے اپنی نانی سے بی ایڈ کرنے کی اجازت مانگی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس لیے بھی کہ بی ایڈ کرنے کے لیے اسے لاہور جانا پڑتا۔ اور نانی تو اسے اوکاڑہ میں بھی اسے اس طرح رکھتی تھی جس طرح مرغی بچے کو پروں تلے رکھتی ہے۔ آخر زبیدہ نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا یعنی آنسو۔

کئی دن تک روتی رہی۔ کھانے پینے سے بائیکاٹ کر دیا۔ اپنی ازلی بدنصیبیوں کو کوسا۔ اپنی قسمت کا ماتم کیا۔ تب کہیں جا کر نانی کا دل پسیجا اور ہزار ہا ہدایات کے ساتھ اس نے اسے لاہور روانہ کر دیا۔ چونکہ یہ کورس ایک سال کا تھا۔ اس لیے زبیدہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر خوب سیر سپاٹا کرتی۔ بازار جاتی' شاپنگ کرتی۔ فلمیں دیکھتی۔ اور خوش رہتی۔ اسی طرح مگن' چھ مہینے گزر گئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اوکاڑہ جا کر تو اسی قفس میں بند ہونا پڑے گا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ قفس کے باہر کی ہوا اسے راس نہ آئے گی۔ اپنے اس طرح لٹ جانے کا منظر جب اسے یاد آ جاتا' تو چھاجوں رونا شروع کر دیتی یہ قہر نہیں تو کیا ہے۔

اس نے اپنے آپ کو سات پردوں میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اور پردے ہی پردے میں کسی نے اس کو لوٹ لیا تھا۔ اور یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ اس نے لوٹنے والے کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ انسان تھا یا حیوان' شیطان تھا یا درندہ۔ اس کے پاس اپنے قتل ہونے کا کیا ثبوت تھا؟ اس کی کہانی پر کون یقین کر سکتا تھا؟ لوگوں نے تو یہی کہنا تھا کہ لاہور جا کے اسے ہوا لگ گئی؟ یہ کیسی گرم ہوا لگی تھی کہ اس کا تن من ہر گھڑی جھلس رہا تھا۔ وہ اپنی فریاد لے کر کہاں جائے؟ وہ اپنے آنسو کس کو دکھائے زندگی کا جو ورق پھٹ گیا تھا اسے کہاں تلاش کرے؟

پورے آٹھ دن...... اپنی لٹی ہوئی جوانی کا ماتم کر کے اس نے پھر کالج جانا شروع کر دیا۔ کالج جانے تو لگی لیکن ایک وہم بھوت کی طرح ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا۔ نہ اسے بھوک لگتی' نہ پیاس ستاتی' کھانے کی میز پر سب لڑکیوں کے ساتھ یونہی دو چار لقمے زہر مار کر کے اٹھ جاتی۔ اسٹڈی کے وقت بیٹھی کاپی پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچا کرتی۔ آدھی چھٹی کے وقت تنہا کسی درخت کے نیچے جا بیٹھتی اور خلاؤں میں دیکھا کرتی' یہ بھوت شکلیں بدل بدل کر اسے ڈرایا کرتا اور اسے کہتا۔ ایک مشکل ترین گھڑی آگے کھڑی ہے۔ ایک نہ ایک دن آ کے رہے گی۔

پھر وہ مشکل ترین گھڑی آ کے رہی۔ اس دن وہ نئے سرے سے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ واویلا کیا چیخی چلائی۔ مریم اور آصفہ نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔

”یہ دوسرا مہینہ جا رہا ہے؟“

”اچھی طرح یاد کرو شاید تمہیں غلطی لگ رہی ہو۔“

”یعنی مجھے غلطی لگ سکتی ہے؟“ زبیدہ نے جھلا کر کہا۔ جو ایک دن انگلیوں پر گنتی رہتی ہے۔ ”اب کیلنڈر نکال کے حساب لگاؤں یا ڈاکٹری معائنہ کروا کے اپنا منہ کالا کرا دوں؟“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ مریم کا منہ لٹک گیا۔

اب تینوں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ”تم دونوں نے مجھے اس وقت چپ کرا دیا تھا۔“ زبیدہ چیخی۔

”تو کیا کر لیتیں تم اس وقت؟“ آصفہ نے پوچھا۔

”اگر اسی رات سارا واقعہ وارڈن کو بتا دیتی‘ تو وہ عینی گواہ بن جاتی اور خود ہی کوئی تدارک بھی کرتی۔ اب کون میری بے گناہی کا یقین کرے گا۔ سب اسے میرے کرتوت کہیں گے۔“

”ہمیں کیا معلوم تھا ایسا بھی ہوتا ہے۔“ آصفہ منہ ہی منہ میں منمنائی۔ ”اور ہم تو تجھ پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ تیری عزت کی خاطر بات پی جانا چاہتے تھے۔“

”تو لو۔ اب میری عزت خاک میں مل گئی ہے۔ صبر کا اجر مل گیا ہے مجھے۔ بدنامی سے بچ گئی ہوں میں۔ اب تو جس کو پتہ نہیں اس کو بھی پتہ چلے گا۔ اب مجھ پر تھوکا جائے گا۔ مجھے ننگ انسانیت کہا جائے گا۔ اور دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ اسے میرا گناہ کہا جائے گا۔“

زبیدہ روتی رہی اور وہ دونوں سر جھکائے یوں بیٹھی رہیں۔ جیسے وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں۔ تھوڑی دیر رونے کے بعد زبیدہ نے سر اٹھا لیا اور کہا۔ ”میں خودکشی کر لوں گی۔ بس اور کوئی راستہ نہیں میرے لیے۔“

”اور خودکشی کرنے سے کیا تجھ پر پردہ پڑ جائے گا۔“ مریم جلدی سے بولی ”خودکشی کے کیس میں تو سب سے پہلے پوسٹ مارٹم کرتے ہیں اور پھر ساروں کو تیری خودکشی کی وجہ بھی سمجھ میں آ جائے گی۔“

”ہائے اللہ میری نانی تو اس صدمے سے فوراً مر جائے گی۔ وہ اسی خوف سے مجھے لاہور بھیجنے پر راضی ہی نہ تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے میری نانی ہی کی بددعا لگ جائے گی۔“

''انہیں تیری خودکشی واقعی مارڈالے گی۔'' آصفہ بولی۔

''پھر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

''سوچتے ہیں....... کچھ کرتے ہیں۔'' مریم نے آہستہ سے کہا۔''اگر اللہ نے اس وقت پردہ رکھا تھا تو اب بھی مدد کرے گا۔ کوئی راہ نکل آئے گی۔ وہ جانتا ہے' تم بے گناہ ہو۔''

''یہاں دنیا میں میری گواہی دینے والا کون ہے؟ اس خبیث مردود نے بھی میرا چہرہ نہیں دیکھا۔'' زبیدہ پھر دھواں دھار رونے لگی۔ آصفہ اور مریم آہستہ آہستہ کھسر پھسر کرنے لگیں۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر زبیدہ کو چپ کرا دیتیں۔ روتے روتے سر اٹھا کر زبیدہ نے کہا ''تم جانتی ہو ایک ایک دن مجھے بدنامی کی موت کی طرف لیے جاتا ہے۔ آخر کب تک یہ بات چھپے گی۔ کب تک میرا جسم اس بھید کو چھپائے گا؟''

''ہاں'' مریم نے سیانوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔''تو آرام سے سو جا' ہم کوئی حل نکالتے ہیں۔''

''خدا کرے مر جائے وہ مردود۔ اس پر آسمان ٹوٹے بجلیاں گریں۔ اس کا جنازہ اٹھے....... کتے کی موت مرے وہ۔ کسی کی آئی اس کو آ جائے۔ خبیث بھیڑیے کو سرطان ہو جائے.......'' زبیدہ رو رو کر جب ہلکان ہو جاتی تو ہمیشہ اس نادیدہ درندے کو اسی طرح گالیاں اور کوسنے دینے لگتی۔ جی بھر کر کوس کے اس کا کلیجہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو وہ سو گئی۔

تب مریم کو یاد آیا کہ اس کی ایک بچپن کی سہیلی نور پور کے گاؤں میں رہتی ہے' جس کی ایک خالہ لیڈی ڈاکٹر ہے وہیں نور پور کے گاؤں کے ہسپتال میں کام کرتی ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس سہیلی تک رسائی کیسے ہو؟ آیا اتنا عرصے بعد مل کر وہ ان کی پذیرائی کرتی ہے یا نہیں یا اس کی خالہ اس مصیبت سے نجات دلواتی ہے یا نہیں۔ بار بار سوچنے کے باوجود بھی اس کے علاوہ کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

تینوں اس بات پر متفق تھیں کہ ایک بار چل کر اپنی پتا سنائی جائے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تینوں ایک ساتھ کالج سے کس طرح چھٹی لیں۔ ابھی تینوں سوچوں کے برزخ سے گزر رہی تھیں کہ انہیں پتہ چلا بہار کی چھٹیوں کے لیے کالج ایک ہفتے کے لیے بند ہو رہا ہے۔ تینوں نے اسے تائید غیبی جانا' لیکن زبیدہ نے انہیں بتایا کہ'' نانی بڑی وہمی عورت ہے۔ اگر اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ میں چھٹیوں میں گھر آنے کے بجائے کہیں اور چلی گئی ہوں تو وہ اتنی مصیبت کھڑی کریں گی کہ کالج میں رہنا محال ہو جائے گا۔'' تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ تینوں مل کر پہلے اوکاڑہ جائیں۔ وہاں نانی کی چاپلوسی کر کے اس سے چوتھی سہیلی کی شادی میں شرکت کی اجازت

لے کر نور پور جائیں۔

یونہی ہوا۔ بڑی کوششوں کے بعد نانی راضی ہوئی بلکہ وہ تو ساتھ جانے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ مگر مریم نے یہ کہہ کر اسے سمجھایا کہ شادی کے فوراً بعد کالج کھل جائے گا اور وہ تینوں سیدھی ہوسٹل چلی جائیں گی۔ پھر نانی کو واپس کون لائے گا؟

نور پور پہنچیں تو سہیلی پہلی سی محبت سے پیش آئی اور سارا قصہ سن کر انہیں اپنی خالہ کے پاس لے گئی۔ گو اس کی خالہ اس قسم کے کام نہیں کرتی تھی۔ مگر لڑکیوں کی حالت زار دیکھ کر ان کی کسمپرسی پر ترس آ گیا۔ چھٹیوں کے بعد زبیدہ کالج آئی تو بالکل بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کے ذہن پر وزنی بوجھ تھا۔ مگر جسم خالی خالی لگتا تھا جیسے موتی نکال کر کسی نے سیپ کو ساحل پر پھینک دیا ہو' یا جیسے اس کا تن ایک خالی خولی ڈبہ ہو جس میں لوگ ردی کاغذ اور گندگی پھینک جاتے ہیں۔ بدنامی کا خوف اور رسوائی کا قلق تو مٹ گیا تھا مگر اپنی ذات کو کھو دینے کا بڑا دکھ تھا۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ اونچے سروں میں سانس بھی نہیں لی تھی۔ ابھی آنکھ کھولی تھی اور اپنا آپ گنوا بیٹھی تھی۔ اسے یوں لگتا اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔

افوہ! کیسی اذیت دہ بات تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا' اسے کس نے لوٹا' کیوں لوٹا کیوں اسے برباد کیا' کیوں اسے ناشاد کیا' اس نے دنیا میں کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ محبتوں کی تو اس کی زندگی میں پہلے ہی کمی تھی۔ اور اب کس کے پیار کی تمنا ہوتی؟

اچھا' اگر تو اس شخص کو دیکھ لیتی' جان بھی لیتی' تو پھر کیا کر لیتی' تو؟ وہ اپنے آپ سے پوچھتی کیا اس کے پاؤں پکڑ کر اس کا ساتھ مانگتی' توبہ توبہ وہ تھرا اٹھتی۔ ایسے ذلیل اور گھٹیا آدمی کا ساتھ مانگتی۔ درندے کو اپنا جیون سانپ دیتی۔ ہاں مگر اس کے منہ پر تھوک سکتی تھی۔ نفرت سے اس کے جسم کے سارے رونگٹے تن جاتے اور وہ سوچتی' کاش وہ بدبخت' بدباطن شخص کسی طرح سامنے آ جائے تو وہ اس کے منہ پر تھوک دے۔ ایک بار اس بھیڑیے کے منہ پر تھوکنے کی تمنا اسے لکڑی کی طرح جلا ڈالتی اور جب اس کے اعصاب ڈھیلے ہوتے تو وہ دھواں دھواں ہونے لگتی۔ سچ ہے اپنی سب سے قیمتی پونجی لٹا کر کون سکون سے سو سکتا ہے۔ اس کا خوبصورت پیکر جس کو اس نے کلیوں اور پھولوں جیسے خوابوں سے پروان چڑھایا تھا' جس کے اردگرد خوشبوؤں کی دیوار چن رکھی تھی' جس کو ہر نظر بد سے محفوظ رکھا ہوا تھا' جس پر اس کی اپنی نگاہ کی کڑی نگرانی تھی۔ وہی پیکر آناً فاناً چرا لیا گیا۔ تو اسے یوں محسوس ہوتا' یہ اس کا اپنا آپ نہیں ہے۔ اس کی روح کسی دوجے کے خول میں بند ہوگئی ہے۔ اسی لیے تو روح ہمیشہ جسم سے الگ رہتی ہے۔

امتحان شروع ہوئے تو وہ امتحانوں میں مگن ہوگئی۔ پہلے ہر بات کا ایک مقصد تھا۔ اب بے مقصد امتحان دے رہی تھی اور بے مقصد جی رہی تھی۔ امتحانوں کے بعد تدریسی لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ایک بے نام اداسی اور ایک مغموم سی

زردی ٹھہر گئی تھی۔ بظاہر اس کی وجہ امتحان ہی نظر آ رہے تھے۔ مگر اس کی دونوں سہیلیوں کے علاوہ اس کی چپ کا راز کوئی نہ جانتا تھا اور جس دن سے انہوں نے مل کر یہ بڑی مہم سر کی تھی' اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دی تھی' جیسے انہوں نے ذہن سے وہ دل ہلا دینے والا حادثہ کھرچ دیا ہو یا کھرچ دینا چاہتی ہوں۔

جب امتحان کا رزلٹ آ گیا تو زبیدہ نے چپکے چپکے اسکولوں میں عرضیاں دینی شروع کر دیں۔ نانی کی خواہش تھی کہ جلدی سے زبیدہ کے ہاتھ پیلے کر دے۔ رشتے بھی آ رہے تھے مگر زبیدہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد کہیں ملازمت مل جائے تاکہ شادی کا خوف دل سے نکل جائے۔ پھر اللہ نے اس کی مدد کی اور اوکاڑہ کے ایک ہائی سکول کی ٹیچر فوت ہو گئی اور ہیڈ مسٹریس نے فوری طور پر اسے عارضی ملازمت پر رکھ لیا۔ اس بات پر نانی بہت خفا ہوئی شور مچایا' دھمکایا' اللہ کے واسطے دیئے۔ مگر زبیدہ نے بس اتنا کہا "نانی! میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔ دو چار سال نوکری کر کے پیسے کماؤں گی۔ پھر جہاں تم کہو گی شادی کر لوں گی۔ زبردستی کرو گی تو میں زہر کھا لوں گی۔"

مگر نوکری کرنے کے بعد بھی اس کے رشتے آ رہے رہے۔ وہ انکار کرتی رہی اور نانی جھلاتی رہی۔ اس کی سنجیدگی' انتھک محنت اور لگن دیکھ کر ہیڈ مسٹریس نے اس کی سفارش کر کے اسے مستقل طور پر رکھ لیا۔ اب وہ باقاعدہ استانی بن گئی تھی۔ دن کے وقت اسکول رات کے وقت کاپیاں۔۔۔۔۔۔ چار سال گزر گئے اور نانی چیخ کر ہار گئی۔ زبیدہ کے منہ سے ایک بار "نہ" نکلی تو پھر لوہے کی لکیر بن گئی۔ تب نانی نے لاچار ہو کر اس کی ماں کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

سردیوں کی ایک اداس اور زرد شام میں جب دھوپ در و دیوار کو بوسہ دے کر کب کی جا چکی تھی' وہ چارپائی پر بیٹھی اسکول کی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ اچانک اس کی بنی سنوری ماں گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اس بار وہ اکیلی نہیں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک نوجوان بھی اندر داخل ہوا تھا اور حسب معمول وہ بہت سا ساز و سامان اور تحائف بھی اٹھائے ہوئے تھی۔ ماں کی طرف سے ایسی نوازشیں اسے پہلے بھی خوش نہ کیا کرتی تھیں۔ اب تو وہ اپنے آپ سے بھی روٹھ چکی تھی۔ وہ چارپائی پر اکڑوں بیٹھی رہی۔ اس کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ ماتھا چوما' اور پھر نانی کے بارے میں پوچھا یہ جان کر کہ نانی اندر ہے وہ اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ نوجوان بھی اندر چلا گیا۔ زبیدہ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ سب مردوں سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ انسانوں کے لبادے میں سب شیطان ہی لگتے تھے۔ اطمینان سے بیٹھی اپنا کام کرتی رہی۔ جب سب کاپیاں چیک کر لیں تو پھر اٹھ کر اندر آ گئی۔ نانی نے اسے بتایا کہ اس مرتبہ اس کی ماں ہفتہ بھر رہنے کے لیے آئی ہے۔ اب اس کا شوہر بھی نرم پڑ گیا اور زبیدہ کو ساتھ رکھنے

پر آمادہ ہوگیا ہے۔ مگر زبیدہ نے یہ بات اس طرح سنی جیسے سنی ہی نہیں' چپ چاپ باورچی خانے میں جا کر کھانا بنانے لگی۔ کھانا بنانے کے بعد اس نے میز لا کے ماں کے آگے رکھی۔ جب جھاڑ کر میز پوش بچھا رہی تھی تو اس کی ماں نے اس کا تعارف اس نوجوان سے کرایا۔

''زوبی' یہ عباس علی ہے۔ میرے جیٹھ کا بیٹا ہے۔ وہیں ساہیوال میں وکالت کرتا ہے اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ آج کوئی میرے ساتھ آنے والا نہیں تھا تو اس خوش بخت نے کہا میں چھوڑ آؤں گا۔'' زبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر بولی۔ ''یہ ابھی واپس چلا جائے گا۔ کیونکہ صبح کچہری میں اسے ضروری کام ہے۔'' زبیدہ چپ چاپ میز پر کھانا چنتی رہی...... بعد میں گرم گرم پھلکے پکا کر ان کے آگے رکھتی رہی۔ کھانا کھانے کے بعد عباس علی باہر نکل گیا۔

ان کے پاس دو ہی تو کمرے تھے۔ ایک میں نانی سوتی تھی' اور دوسرے میں وہ خود۔ اس کا کمرہ قدرے اچھا تھا۔ جس میں چار کرسیاں اور ایک میز بھی رکھی تھی۔ اس نے دوسرے پلنگ پر اپنی ماں کا بستر لگا دیا۔ برتن اٹھا کر دھوئے۔ باورچی خانہ بند کر کے آئی اور تینوں ہلکے ہلکے سروں میں باتیں کرنے لگیں۔ اتنے میں عباس علی اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے سب سے پہلے زبیدہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت زبیدہ پہلی بار اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ یوں نظریں ملنے پر زبیدہ نے جھٹ اپنی نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ عباس علی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی ماں کو مخاطب کر کے بولا۔

''چاچی' ابھی باہر مجھے میرا ایک پرانا دوست مل گیا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ میں آج ساہیوال نہیں جاؤں گا۔ بلکہ کل کسی وقت چلا جاؤں گا۔''

''اچھا۔'' اس کی ماں خوش ہوگئی۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ورنہ میں ڈر رہی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ تو رات کے وقت بس کا سفر کرے۔''

زبیدہ نے دل میں سوچ لیا کہ آج رات اسے نانی کے پاس سونا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے کمرے میں تیسرے پلنگ کی گنجائش نہیں تھی۔

صبح سب کو جلدی جلدی ناشتہ کرا کے زبیدہ نے کپڑے بدلے اور اسکول جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ برقعہ پہن کر باہر آئی تو صحن میں عباس علی کھڑا تھا۔ ایسے' جیسے اس کا انتظار کر رہا ہو۔ زبیدہ نے سرسری انداز سے اسے دیکھا اور باہر نکل گئی۔ دوپہر کو وہ سکول سے واپس آئی تو اسے گھر کے باہر کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اس کا خیال تھا وہ چلا گیا ہوگا مگر وہ تو ابھی تک یہیں تھا اور گھر کے باہر یوں کھڑا تھا

جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ زبیدہ اس کے قریب سے گزری تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔

اونہہ' زبیدہ زن سے اس کے قرہب سے نکل گئی۔ پتہ نہیں وہ کیوں نہیں گیا تھا اور اس نے اپنی چاچی سے کیا کہا تھا۔ زبیدہ نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ ہاں ایک بات اسے پتہ چلی تھی۔ وہ عجیب نظروں سے زبیدہ کو دیکھتا تھا۔ ایسے جیسے آگے بڑھ آنا چاہتا ہو' گلے لگا لینا چاہتا ہو۔ ماتھا چوم لینا چاہتا ہو' کچھ اور قریب آنا چاہتا ہو۔ زبیدہ کو جب اچانک اس بات کا ادراک ہوا تو اس کا دل خواہ مخواہ دھڑکنے لگا۔ عباس علی خوبصورت آدمی تھا۔ پکا ہڈ' کاٹھ اونچا لمبا' مضبوط ہاتھ پاؤں' توانا اور صحت مند۔۔۔۔۔۔۔ ہمہ وقت اس کے چہرے پر ایک معصومیت رہتی تھی۔ معصومیت کے اس نقاب میں وہ ہراساں ہراساں اور کھویا کھویا بڑا اچھا لگتا تھا۔ جیسے اسے کوئی بات یاد نہ آ رہی ہو۔۔۔۔۔۔ مگر زبیدہ نے ٹھنڈی آہ بھر کے منہ موڑ لیا۔ وہ کسی بھی شریف آدمی کے قابل نہ تھی۔ نظروں کی حوصلہ افزائی کرنے سے کیا فائدہ تھا۔

دوسرے دن وہ اسکول سے واپس آئی تو وہ باہر موجود نہ تھا۔ اندر آئی تو اندر بھی نہیں تھا۔ شام تک وہ اسے نظر نہ آیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ جا چکا ہے۔ زبیدہ نے اطمینان کی سانس لی۔ ایک ہفتہ اس کی ماں وہاں رہی اور اسے زمانے کی اونچ نیچ کے بارے میں سمجھاتی رہی۔ اپنے گھر کی اہمیت پر زور دیتی رہی۔ مگر جو اونچ نیچ زبیدہ نے پہلے قدم پر دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد کچھ ماننے پر تیار نہ تھی۔ زبیدہ نے چپ کی مالا اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ وہ ہمیشہ گمشدہ خزانوں کی تلاش میں رہتی اور انہونی باتوں کے خواب دیکھا کرتی۔ یہی کہ کاش اس کی ماں اسے پھر سے جنم دے ایک بار۔

جس روز اس کی ماں نے واپس جانا تھا۔ اس روز اچانک عباس علی آ گیا۔ اس کی ماں عباس علی کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس کے آنے کی وجہ پوچھتی' عباس علی جلدی سے بولا۔

''چاچی آج مجھے یہاں ایک ضروری کام تھا۔ سوچا تمہیں بھی لیتا چلوں۔ کیا پروگرام ہے؟''

''ہاں'' وہ بولی۔ ''میں تو بالکل تیار ہوں۔''

''اچھا پھر کل چلیں گے۔'' عباس علی بولا'' آج رات مجھے اپنے دوست کے ساتھ ایک کام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کی ماں نے پھر عباس علی کی سعادت مندی کا قصیدہ پڑھ کے اس کو دعائیں دینی شروع کر دیں۔

رات کو زبیدہ کو پھر نانی کے کمرے میں سونا پڑا۔ علی الصبح جب وہ اٹھی تو اس کے سرہانے ایک نیلا لفافہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر اسے تکیے کے نیچے کھسکا دیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا کہ کسی کی نظر تو نہیں پڑی۔ نانی فجر کی نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھی اور ماں

دوسرے کمرے میں تھی۔ اسے پتہ چل گیا کہ یہ لفافہ عباس علی نے رکھا ہے۔ پہلے نظروں سے پیام دیتا رہا وہ جاہل بن گئی تو اب حال دل لکھ کے یہاں رکھ گیا۔

وہ لفافہ بغل میں دبا کے باہر نکل گئی۔ اسے اس لفافے کو کھولنے کی جلدی تھی نہ اس کا دل دھڑکا تھا....... وہ جانتی تھی کہ اس لفافہ میں کیا لکھا ہوگا۔ اسے اگر غم تھا تو یہ کہ....... وہ ایسے کسی لفافے کو سینے سے لگا کر چوم نہیں سکتی۔ یہ لفافہ اس کی تقدیر نہیں بن سکتا تھا۔ اس لفافے مین اس کے لیے نوید زندگی نہ تھی۔ پھر بھی اس نے صبح کی کنواری روشنی میں نیم کے درخت تلے کھڑے ہو کر لفافہ چاک کر دیا۔ بڑی خوب صورت تحریر میں لکھا تھا۔

"زبیدہ!

میں نے تمہیں دیکھا تو تمہارا ہو گیا۔ اس سے پہلے میں نے اتنا گم صم سا حسن نہیں دیکھا تھا۔ اگر تم مجھے قبول کرو تو میں چاچی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ اگر مجھے قبول نہ کرو تو خدا کے واسطے اس کی وجہ ضرور بتانا۔"

عباس علی

وجہ.......؟ دو کڑوے کڑوے آنسو آدھی سوئی آدھی جاگی آنکھوں میں ابھر آئے اس نے خط ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے نالی میں بہا دیا۔ اس کی زندگی میں ان خطوں کا یہی مقسوم تھا۔ وہ اپنا دردِ دل کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی مرد محبت کے معاملے میں تنگ دل ہوتا ہے اور یہ بھی اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے وجہ بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ناشتے کے وقت عباس علی اسے ملتجی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ مگر اس نے بڑی احتیاط سے اپنی آنکھوں کو انجان بنائے رکھا۔ جب وہ برقعہ اوڑھ کر اسکول جانے کو نکلی تو وہ بھی چپکے سے نکل کر آ گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ڈیوڑھی سے نکل گئی تو دور تک اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

دوپہر کو واپس آئی تو وہ پھر ڈیوڑھی کے باہر کھڑا تھا۔ منتظر آنکھوں میں بے شمار التجائیں لیے ہوئے۔ میں کیا کروں؟ زبیدہ اس کے قریب سے ہوا کا جھونکا بن کر گزر گئی۔

شام کو عباس علی اس کی ماں کو لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زبیدہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اتنے رشتے اس نے لوٹائے مگر ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔ مگر عباس علی کو مایوس لوٹاتے ہوئے اسے عجیب سا دکھ ہو رہا تھا۔

ایک مہینہ گزرنے کے بعد عباس علی اس کی ماں کا کوئی پیغام لے کر اچانک آ گیا۔ نانی سے باتیں کرتے وقت وہ مسلسل زبیدہ کی طرف دیکھتا رہا اور زبیدہ کے دل پر آرے چلتے رہے۔ وہ اس کی معصوم اور ملتجی آنکھوں سے بچ کر کہیں روپوش ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر کوئی ایسی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ جاتے وقت وہ پھر زبیدہ کے پلنگ پر ایک نیلا لفافہ چھوڑ گیا۔

زوبی!

اگر تم مجھے آزمانا چاہتی ہو تو آزما لو۔ میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ خواہ قیامت آ جائے۔

تمہارا......عباس علی

زبیدہ نے یہ خط بھی ریزہ ریزہ کر دیا مگر عباس علی کا اس گھر میں آنا جانا رہا۔ کبھی کسی مقدمے کے بہانے، کبھی کسی دوست سے ملنے کے وسیلے اور کبھی اس کی ماں کا کوئی سندیسہ لے کر آ جاتا۔ ہمیشہ ایک خط چھوڑ جاتا....... ایک خوشبو چھوڑ جاتا....... ایک خلش چھوڑ جاتا۔

چھ مہینے گزر گئے اور زبیدہ چپ کے منتر میں اسیر رہی۔ گو عباس علی کی خاموش محبت اس منتر کو توڑنے کی کوشش کرتی مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ اپنے حصار کو تنگ کر لیتی۔ ایک بار وہ بے تاب ہو کر زبیدہ کے اسکول پہنچ گیا اور وہیں سے اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ ایک سنسان گلی میں اس کے برابر آ گیا اور بڑی اپنائیت سے بولا۔

"زبیدہ! تم میرے خطوں کے جواب کیوں نہیں دیتی؟" زبیدہ چپ رہی۔

وہ پھر بولا۔ "زبیدہ! کیا تم مجھے اتنا ناپسند کرتی ہو کہ میری بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں۔"

زبیدہ کے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ سوگواری سے ہنس کر بولی۔ "ہم غریب لوگ ہیں۔"

"بس یہی وجہ ہے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"اور مجھے شادی سے خوف آتا ہے۔" بے اختیاری طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔

عباس علی تھوڑی دیر چپ رہا پھر سمجھ گیا۔ چونکہ اس کی ماں کو ایک بار طلاق ہوئی تھی اس کا نفسیاتی اثر ہے۔ "مجھ پر بھروسہ رکھو زبیدہ، شادی ہی تو محبت کی معراج ہے۔"

زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میرے نصیب میں ایسی خوشیاں نہیں ہیں....... آپ پتھر سے سر نہ پھوڑیں۔ میں بھی

اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ آپ کسی اور جگہ شادی کر لیں۔"

"میں تو ڈر رہا تھا زبیدہ۔" وہ بولا "شاید تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔ مگر اب تسلی ہو گئی ہے۔ میں تمہیں کچھ اور سوچنے کا موقع دوں گا۔ مگر شادی انشاء اللہ تمہی سے کروں گا۔"

زبیدہ نے لرز کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اف کتنا معصوم چہرہ تھا اس کا۔ نہ مکر وہ نہ فریب....... کچھ نہ تھا اس کے چہرے پر....... ایک سادگی تھی۔ ایک التجا تھی....... ایک شریفانہ سی معصومیت تھی۔ اور اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی فرشتہ صفت بچہ اپنے دل پسند کھلونے کو دیکھ رہا ہو۔ وہ اپنی ہر بات سے بھلا مانس نظر آ رہا تھا....... زبیدہ کے دل میں طوفان سا اٹھنے لگا۔ ایسے لوگ تو دل کا درد بانٹ لیتے ہیں۔ وہ اس سے ناحق ڈر رہی تھی۔ شاید دنیا اتنی بری جگہ نہ ہو۔ جیسی اس نے سوچ رکھی ہے۔ زبیدہ جب بھی عباس علی کی صورت دیکھتی ڈگمگ ڈول جاتی۔

اس گفتگو کے بعد اگر چہ اس نے آنا کم کر دیا تھا اور خط بھی کوئی نہیں لکھا۔ مگر اس نے ساری بات ماں اور نانی کے آگے رکھ دی تھی۔ اس کی ماں کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ وہ سدا سے چاہتی تھی کہ زبیدہ اس کے خاندان میں شامل ہو جائے۔

پھر بھی وہ چھ مہینے انکار ہی کرتی رہی۔ راتوں کو تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی....... کبھی کبھی عباس کا خط آتا۔ مگر ماں تو ہر مہینے آ دھمکتی اور اس کی منتیں کرنے لگتی اور نانی اٹھتے بیٹھتے اس کی بڑھتی عمر کا احساس دلاتی۔ پھر اس روز روز کی چخ چخ سے زبیدہ تھک گئی....... بھانڈا پھوٹنا ہو تو بھلے بیچ چوراہے پر پھوٹے یا گھر کے اندر....... وہ مسلسل ایک کرب رسوائی سے گزر رہی تھی۔ یہ کرب اس کا خود ساختہ بھی ہو سکتا تھا۔ اب وہ اس کرب سے....... اس کے بوجھ سے تھک گئی تھی۔ اور اسے تھکا دینے والا عباس علی تھا جو اپنی طبعی شرافت مستقل مزاجی اور دھیمے پن سے کسی وقت اس کے دل کا چور دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا تھا....... جدھر دیکھتی ادھر عباس علی نظر آنے لگتا۔ اس کی سونی سیج پر عباس علی کا سہرا نظر آتا۔ سوئے ہوئے سارے ارمان انگڑائی لے کر جاگ اٹھے اور مردہ امیدوں پر کسی نے آب حیات چھڑک دیا۔ ساری تبدیلی اس طرح آئی جس طرح رات کے بعد آپ ہی آپ دن آ جاتا ہے۔

پتہ نہیں اب انکار کے بھرم کے ٹوٹنے کا وقت آ گیا تھا یا صبر کا اجر ملنے والا تھا۔ زبیدہ کچھ نہ جانتی تھی۔ بہت دن تک الجھتی، سلجھتی کشمکش اور الجھن میں گرتی پڑتی ہار گئی۔ شاید یہ عباس علی کا سچا جذبہ تھا کہ وہ جیت گیا اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

شادی کی رات جب وہ دلہن بن کے چھپر کھٹ پر بیٹھی تھی تو اس کے دل پر وہی وحشت سوار ہونے لگی تھی۔ دل اور ضمیر میں جنگ ہونے لگی۔ ضمیر کہتا خالی سیپ پیش کرنا محبت کی ریت نہیں۔ یہ صریح دھوکا بازی ہے اور دل کہتا تیرا کیا قصور ہے؟ ساری دنیا ایک

دوسرے سے فریب کر رہی ہے۔ تجھے کسی نے لوٹا تو کسی کو لوٹ لے۔ آج کی رات تیری اپنی ہے۔ آج کی رات ذرا احتیاط سے قدم اٹھا۔ آنکھیں بند کر کے اس پل صراط سے گزرنا ہو گا۔ محبت کی اتنی چاندنی بچھا دے کہ عباس علی کی آنکھیں چندھیا جائیں .... زلفوں کا جال اس طرح بچھا دے کہ اس کی فہم کے راستے گنجلک ہو جائیں۔ محبت اور حلیمی سے زمین بن جا کہ وہ تیرے اندر سما جائے۔ اس کو حاصل کر لے۔ پا لے اس کو اپنا حق استعمال کر....... جو بھی ہوا اس کو بھول جا اور دیکھ مرد اوٹ ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر کینے کا زہر رکھ لیتا ہے۔ زندگی میں کبھی کبھی ضرور نکالتا ہے۔

جب عباس علی اندر آیا تو وہ احساس کے سوا نیزے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اتنی محبت تھی' عباس علی کے چہرے پر کہ وہ تھرا اٹھی۔ ایسے سچے اور کھرے انسان کو وہ دھوکا دینے چلی تھی۔ اور کیا خبر کہ تھوڑی دیر بعد یہ ساری محبت نفرت میں بدل جائے۔ کیا خبر وہ اسے آبرو باختہ عورت سمجھ کر اپنے گھر سے نکال دے۔ کیا خبر وہ ہمیشہ اس پر شک کرتا رہے۔ وہ تو ایک ہی بار قسمت کے جہنم میں گری تھی۔ پر کیا خبر عباس علی اسے ایک عادی مجرم سمجھ لے۔

وہ قریب آ کر بیٹھا تو زبیدہ کو جھرجھری آ گئی۔ اس نے ایک دم فیصلہ کیا کہ وہ پہلے عباس علی کو سب کچھ بتا دے گی۔ جن سے محبت کرتے ہیں ان سے جھوٹ کے سودے نہیں کرتے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ عباس علی کا چہرہ ہمیشہ کی طرح معصوم اور مصفا تھا۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں اور سارے چہرے پر شعاعوں کا اجالا تھا۔ وہ جنون سے بس ایک دو ہاتھ پرے تھا اور اس کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے زبیدہ ایک دم بول اٹھی۔

''عباس' میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' اپنی آواز خود زبیدہ کو اجنبی محسوس ہوئی۔ عباس علی نے سلگتی نظروں سے اس کا چہرہ چوم کر اس کی طرف عجیب انداز سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ آج کی رات کچھ نہ کہو۔ آج کی رات کہنے کے لیے نہیں ہے۔ آج کی رات محسوس کرنے کی رات ہے۔ آج کی رات اس طرح گزر جانے دو جس طرح پیاسا میخانے میں آ بیٹھتا ہے اور پہلے جام پر ہی ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور صبح تک وہ اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ آج کی رات تم اپنا دل پیش کرو' میں جان دوں گا۔ تم مجھے فریب دو' میں فریب کھاؤں گا۔ آج کی رات زندگی میں ایک ہی بار آتی ہے اور آج کی رات کی تپش مجھے ایک عرصے سے سلگا رہی ہے اور آج کی رات کچھ نہ کہو۔

اور لمحہ بھر کو زبیدہ کے دل نے اس کے پہلو میں چٹکی بھری۔ آج اس لمحے یہ تیرا ہے تیرا اسیر ہے۔ اسیر کو فقیر کر لے۔ پھر پتہ نہیں یہ رات نصیب ہو یا نہیں۔ کل کا سورج تجھے کہاں لے جائے۔ احساس کے برزخ سے نکل جا اور اپنی جنت تعمیر کر لے' مگر وہ ایک فقرہ

کہہ چکی تھی جواب تک اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

''عباس'' وہ جلدی سے بولی ''تم ہمیشہ مجھے ایک بے حس اور پتھر دل لڑکی سمجھتے رہے ہو۔ پورا سال تم نے شرافت سے ایک میری ہاں کے انتظار میں گزار دیا۔ سنو عباس! میں بے حس لڑکی نہیں ہوں....... '' زبیدہ نے دم لیا۔ اتنا کہہ کر ہی وہ ہانپ گئی تھی'' میں بھی ایک انسان ہوں عباس۔ ارمانوں سے بھری ہوئی ایک کمزور لڑکی ہوں....... تم نے مجھے حاصل ہی نہیں کیا جیت لیا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے تم سے محبت ہو گئی۔'' عباس علی کا دل دھڑکا ''اگر محبت نہ ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن میں محبت میں دیانت داری کی قائل ہوں اور مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ جس مرد سے مجھے محبت ہوئی ہے' اس کا ظرف کتنا ہے؟ میرے دل پر ایک بوجھ ہے جو میں سالوں سے اٹھائے پھر رہی ہوں۔ اس بوجھ کے ساتھ میں تمہارے ساتھ چل نہ سکوں گی۔ اس لیے تمہارے ساتھ چلنے سے پہلے ہلکی پھلکی ہونا چاہتی ہوں۔ تم پہلے میری بات سن لو پھر مجھے ہاتھ لگانا۔''

عباس علی کا سلگتا ہوا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ اس کا دل چاہا زبیدہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دے اور اس سے کہے میرے لیے سب سے خوبصورت بات تو تمہارا اظہار محبت ہے۔ جن ہونٹوں سے یہ پھول گرائے ہیں ان ہونٹوں سے اب اور کچھ نہ کہو۔ اب یہ ہونٹ میرے حوالے کر دو۔ ان کا خراج ادا کروں۔ مگر وہ گم صم سا بیٹھا رہ گیا۔

اور زبیدہ نے ''حریم کالج'' کے گیٹ کے پاس ہونے والے مکروہ واقعے کی ایک ایک تفصیل بتا دی۔ وہ سب بتا دیا جو نہیں بتانا تھا۔ وہ سب کہہ دیا جو نہیں کہنا تھا۔ عباس علی کی مست معصوم آنکھیں تھوڑی دیر پہلے چھلکتا پیمانہ بنی ہوئی تھیں' حیرت سے پھیلنا شروع ہوئیں تو سکڑنا بھول گئیں۔ ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ذرا پرے کھسک گیا۔

زبیدہ نے اس کا یہ حال دیکھا تو ڈر گئی اور ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''اسی لیے مجھے شادی سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے ملازمت کر لی تھی۔ زندگی اسی طرح گزار دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ مگر تم نے آ کر میرے ہر اصول کو توڑ دیا۔ میرے خیالات کو بدل کر رکھ دیا۔ اس سے پہلے میں نے کئی رشتے لوٹائے تھے۔ نانی شور مچاتی تو پرواہ نہ کرتی۔ ماں کی کسی بات پر کان نہ دھرتی تم آئے تو میں نے کان بند کر لیے اور انکار کرتی رہی۔ مگر میرا یہ انکار کمزور ثابت ہوا۔ تمہارے معاملے میں میرا دل بھی کمزور ثابت ہوا۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے۔ مجھے رکھو یا نکال دو۔ یہ کہہ کر زبیدہ نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور رونے لگی۔

عباس علی ایک جھٹکے سے اٹھا اور جا کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے زبیدہ کی طرف پشت کر لی اور سگریٹ سلگا کر منہ کے ساتھ لگا لیا۔ اس کے اٹھ کر جانے سے پلنگ ہلا تھا۔ اس لیے زبیدہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کی طرف پیٹھ کیے سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہا

تھا۔

افوہ! یہ تو نے کیا کر دیا زبیدہ؟ اگر اسے یہ سب نہ بتاتی تو کیا ہو جاتا۔ اپنے سپنوں کا شیش محل اپنے ہاتھوں سے تو نے چور کر دیا ہے۔ مریم اور آصفہ نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ یہ بات کبھی اپنے شوہر کو نہ بتانا۔ اپنی ہر خطا پر پردہ ڈالنے والے عورت کی بے گناہی کا یقین نہیں کرتے۔ مگر اس نے سب ہدایتوں کے باوجود وہ کر دیا جو نہیں کرنا تھا۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھ کے پھر رونے لگی۔ اچھا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس نے ابھی اپنی ملازمت سے استعفیٰ نہیں دیا تھا۔ نانی اور ماں نے بہت مجبور کیا تھا۔ مگر اس نے بس ایک مہینے کی چھٹی لے لی تھی۔ اس کے لاشعور میں کہیں ایک خطرہ سا تھا۔ جلدی جلدی اس کے دل کو صبر آ گیا اور اس نے سوچا۔ چلو اچھا ہوا۔ ایک بک بک تو ختم ہو گئی اب کوئی اسے شادی کے لیے مجبور نہیں کرے گا اور وہ بھی عباس کے آگے ہاتھ جوڑ دے گی کہ بے شک اسے گھر سے نکال دے مگر طلاق نہ دے تاکہ وہ بقیہ زندگی مسز عباس بن کر گزار دے۔ نکاح کے دو بول کے عوض وہ اسے اپنا نام تو دے سکتا ہے۔

ابھی وہ آئندہ زندگی کے منصوبے بنا رہی تھی کہ اچانک عباس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ موہوم سی امید جو اسے چھپر کھٹ سے وابستہ کیے ہوئے تھی' وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اس کے آنسو پھر تیزی سے بہنے لگے۔ کتنے سالوں سے وہ اس طرح آنسو بہا رہی تھی مگر آنسوؤں کی فصل ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ کب تک روئے گی تو۔ آج رونا دھونا ختم کر دے اچھی طرح رو چکنے کے بعد اسے صبر آ گیا۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے زیور اتارے۔ رونے سے اس کی ناک سوج گئی تھی اور ننھی سی نتھلی ناک میں پھنس گئی تھی۔ نتھلی اتارتے وقت اسے بہت تکلیف ہوئی۔ پھر اس نے ٹیکا اتارا' جھمکے اتارے اور ایک ایک چیز اتار کر تکیے پر رکھتی گئی۔ اسکول کی استانیاں کہہ رہی تھیں' وہ آج بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اس نے تو بے چارے عباس کو جی بھر کے دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کے اندر آتے ہی دھماکا کر دیا۔ بس گھڑی کی گھڑی یہ زیور پہنا تھا۔ پتہ نہیں اب اس کا کیا مصرف ہوگا۔ سہاگ رات ویران ہو جائے تو تن پر زیوروں کا بوجھ رہ جاتا ہے۔ اس بوجھ کے ساتھ رات کو نیند نہیں آتی۔ جب ساری چوڑیاں اور انگوٹھیاں بھی اتار چکی تو پرس میں سے ایک رومال نکالا' اس میں سارا زیور رکھ کے اوپر ہلکی سی گرہ لگا دی اور پوٹلی کو پاس پڑی تپائی پر رکھ دیا۔ پھر کھڑی ہو گئی۔ سرخ کپڑوں میں سے حسرتوں کے شعلے نکلنے لگے۔ اسے کوئی خاص شوق نہیں تھا سرخ کمخواب کا لہنگا پہننے کا۔ یہ شوق غالباً عباس کو تھا اور یہ جوڑا انہی کی جانب سے آیا تھا۔ دوپٹہ بہت وزنی تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے دوپٹہ تہہ کر کے جمایا۔ پھر اپنے صندوق میں سے ایک سادہ سا سوٹ نکال کر پہنا اور سرخ لہنگے سوٹ کو قرینے سے تہہ کر کے کرسی پر رکھ دیا' جیسے کسی کو لوٹانا ہو۔ غسل خانے میں گئی اور منہ دھویا۔ اب اس کے وجود پر شادی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ بالکل پہلے کی طرح ہو گئی تھی۔ خالی خالی ٹھن ٹھن بجتی ہوئی۔ اور سوچ رہی تھی۔ جس بات

پر زندگی بھر پردہ ڈالا وہ صبح نشر ہو جائے گی۔ جو رو سیاہی مقدر بن چکی ہو اسے کون مٹا سکتا ہے۔ اگر پانچ سال پہلے یہ بات کھل جاتی تو اب تک قصہ پارینہ بن چکی ہوتی اب پھر نئے سرے سے الزامات کے الاؤ سے گزرنا ہوگا اور اپنی انا کا رستا ہوا لہو دیکھنا ہوگا۔

وہ آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ نیند کا دور و نزدیک کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی سہیلیاں سمجھ رہی ہوں گی کہ وہ اپنی سہاگ رات منا رہی ہے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ وہ اپنی سوگ رات منا رہی ہے....... کروٹیں بدل بدل کر وہ تھک گئی اور صبح کے انتظار میں سولی پر لٹکی ہوئی تھی .... وہ صبح جو اس کے کرتوت طشت از بام کرنے والی تھی۔ کیونکہ اب وہ جلدی اس سارے کرب سے گزر جانا چاہتی تھی۔ پھر ایک دم کسی نے دھکا مار کر دروازہ کھولا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ یہ عباس علی تھا۔ اندر آ کر اس نے پہلے کی طرح دروازے کی کنڈی لگا دی۔ اس کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے سارا رنگ اور روپ نچوڑ لیا ہو۔ دھواں دھواں اور بجھا بجھا۔ اسے عباس کی شکل دیکھ کر بڑا ترس آیا۔ غصہ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر اس نے عباس علی کو یہ سب نہ بتایا ہوتا تو پھر وہ اس کا دوسرا روپ دیکھ لیتی۔ اس کے جنون کا رنگ دیکھ لیتی۔ اس کی محبتوں کی انتہا دیکھ لیتی۔ آج اس نے عباس علی کو بھی رنج پہنچایا تھا۔ کیا کیا ارمان نہ ہوں گے اس کے دل میں؟

کاش اس میں حوصلہ ہوتا تو وہ یہ سب شادی سے پہلے اسے بتا دیتی۔ آج رات یہ ظلم نہ کرتی۔ عباس علی مرے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا آیا۔ اور اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ زبیدہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہمہ تن گوش ہو گئی۔ وہ روح کش فیصلہ جو وہ کبھی نہ سننا چاہتی تھی اسے سننے کے لیے تیار ہو گئی۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا۔ شاید عباس اسے معاف کر دے، بخش دے۔ لیکن کیا بخشش میں ملی ہوئی محبت سے زندگی سنور سکتی ہے۔

عباس علی آہستہ سے اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ منہ دھو کے سارا میک اپ اتار دیا تھا اور اب پھر وہ گم صم اور مغموم لگ رہی تھی۔ رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ایک بے نام اداسی اس کے چہرے کے ایک ایک نقش پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور عباس کے دل کو پھر کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ اس کا دل چاہا بڑھ کر اس بے نام اداسی کو اس کے ایک ایک نقش پر سے اپنے ہونٹوں کے ساتھ اس طرح چن لے کہ دوبارہ زبیدہ کے چہرے پر سفاک بے حسی کے سائے نظر نہ آئیں مگر .... وہ سنبھل گیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ تو کچھ اور کہنے آیا تھا اور وہ سب کہنے کے لیے اس نے خود میں بے تحاشا حوصلہ اکٹھا کیا تھا۔ اگر دیر کر دی تو شاید حوصلے کی ساری کشتیاں جل جائیں اس لیے اس نے جلدی سے زبیدہ کا ٹھنڈا برف ہاتھ پکڑ لیا اور لمبی سانس چھوڑ کر کہنے لگا۔

"زبیدہ! میں بھی تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور یہ بات کہنے کا حوصلہ مجھے تم جیسی بہادر عورت نے دیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے کی

بات ہے۔ تین دوست لاہور کے ایک ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ہر رات وہ سڑکوں پر ''شکار'' کرنے کو نکلا کرتے تھے۔ تم جانو عمر کا وہ دور بڑا خطرناک اور مہم پسند ہوتا ہے۔ گناہ اور ثواب کا ذہن میں کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ہر روز ایک نیا تجربہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ نوجوان سرخ آندھیوں کی لپیٹ میں ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ ایک رات وہ تینوں دوست حیوانی جذبوں کا ہاتھ تھام کر ہوسٹل سے نکلے اور طے کیا کہ سڑک پر چلتی لڑکیوں کا ''شکار'' کیا جائے۔ اتفاق سے ''حریم کالج'' کے گیٹ کے پاس ہی تین برقعہ پوش لڑکیاں نظر آ گئیں۔ برقعہ پوش لڑکیاں بزدل ہوتی ہیں۔ اپنی مدافعت کے لیے چلا بھی نہیں سکتیں۔ مبادا ان کی بدنامی ہو جائے۔ لڑکے شیطان کے شکنجے میں تھے۔ اس لیے انہوں نے آگے بڑھ کر ان لڑکیوں کو دبوچ لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لڑکیاں اپنا آپ چھڑا کر بھاگ گئیں۔ مگر تیسری بدقسمتی سے اپنی ہی نقاب کی لپیٹ میں آ گئی۔ ہاتھ پاؤں تو اس نے بھی بہت مارے مگر لڑکے نے وقت ضائع نہیں کیا اور اس کے پندار کا شیشہ کرچی کرچی کر دیا۔

تینوں لڑکے ہوسٹل پہنچے تو نوجوان دوستوں کو اکٹھا کر کے یہ کارنامہ سنایا گیا۔ دوستوں نے اس بہادر اور جیالے سورما کو کندھوں پر اٹھا کر نعرے لگائے اور اسے اپنا لیڈر مان لیا۔ اس وقت اس لڑکے کو احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ زندگی میں اس ناہنجار لڑکے نے اور بھی بہت گناہ کیے ہوں گے۔ لیکن آج جب تم نے اپنی زندگی کے ایک گہرے زخم سے پردہ اٹھا کر دیانت داری سے ازدواجی زندگی کی ابتداء کرنی چاہی تو میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اتنی دیر مجھے اپنے آپ کو آمادہ کرنے میں لگی۔ میں نے سوچا' اتنا ظرف تو مجھ میں بھی ہونا چاہیے .... کہ آج رات تمہارے قدموں پر سر رکھ کر میں یہ کہہ سکوں کہ .... زبیدہ! وہ'' جیالا .... بہادر .... شیطان صفت درندہ میں ہی تھا۔''

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ اور کہتا۔ زبیدہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

◆◆◆

کچ دا کھڈونا

پھر اس نے اپنے ہی بال نوچ لیے دانتوں سے اپنی اوڑھنی تار تار کر لی اور گندے نالے میں اتر کر لڑکیوں پر پانی کے چھینٹے اڑانے لگی۔

"اوئی۔ہائے۔"

پائنچے سنبھالتی اور چہرہ چھپاتی ہوئی لڑکیاں آگے پیچھے دوڑ کر کھیتوں اور درختوں کی آڑ میں چھپنے لگیں۔

اللہ رکھی پر ایک انتقامی جذبہ طاری تھا اس کا منہ حسب معمول سرخ بھبھوکا ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے اور منہ سے کف جاری تھا اور وہ پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر نالے کا گندہ پانی ادھر ادھر دوڑتی ہوئی لڑکیوں پر پھینکے جا رہی تھی۔

"اری اللہ رکھی خدا تجھے غارت کرے۔"

"کھڑی کھڑی ڈوب مرے کم بخت۔"

"تجھ کو کسی کی آئی آئے۔"

لڑکیاں زور زور سے اسے کوسنے بھی دے رہی تھیں۔ مگر اس پر ایک عالم طاری تھا وہی عالم جو دن میں ایک مرتبہ ضرور اس پر طاری ہوا کرتا تھا اور جس عالم میں وہ انسان سے جانور بن جاتی تھی اس حد تک بھیانک اور خوفناک کہ ساری بستی کے لوگ اس سے خوف کھانے لگتے تھے۔ تبھی سب نے اس کا خفیہ نام چڑیل رکھ چھوڑا تھا۔

اللہ رکھی کا باپ جانے کب کا مر کھپ چکا تھا۔ اس کی ماں تنور میں روٹیاں لگا کر اپنا اور اس کا پیٹ پالتی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی میں یہ واحد تنور تھا۔ سارے گاؤں کے گھرانے یہیں سے روٹیاں لگواتے تھے اور بھاڑے کے طور پر تھوڑا تھوڑا آٹا اللہ رکھی کی ماں کو دے جاتے۔

سخت سردیوں میں جب دو تین مہینے کے لیے اس کا تنور بند ہو جاتا تو اسے زندگی گزارنا دو بھر ہو جاتی وہ اللہ رکھی کی منتیں کرتی کہ وہ گاؤں کے امیر گھرانوں میں جا کر تھوڑا بہت کام کر دے اور کچھ کھانے کو لے آئے مگر اللہ رکھی کے مزاج کو ایسی گھٹیا باتیں بالکل پسند

نہیں تھیں اس پر اس کی حرکتیں ایسی غیر انسانی تھیں کہ کوئی گھرانہ اسے کسی طرح کا کام دینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔کون جانے کس وقت وہ مغلوب الغضب ہو جائے اور بنا بنایا کام بگاڑ کر چلی جائے اور تو اور اس کی ہم جولیاں بھی اس سے خوف کھاتی تھیں۔

پانچ چھ کی ٹولی بن کر تو اس سے ٹکر لے لیتیں' لیکن جہاں کسی کو اکیلے میں اللہ رکھی نظر آئی اس نے جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے ادھر ادھر کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

اور اگر شومئی قسمت سے اللہ رکھی کسی لڑکی کو یوں چھپ کر بھاگتے ہوئے دیکھ لیتی تو اس کی شامت ہی آ جاتی۔اگلی پچھلی ساری کسر نکال لیتی۔اس کے ہاتھوں کے ناخن لمبے تھے۔بال ہر وقت الجھے رہتے یوں معلوم ہوتا اس نے سالوں سے سر نہیں دھویا اور اگر کبھی سر کو بھگونے کا گناہ کر بھی بیٹھی ہے تو اسے کنگھی سے شرمسار ہر گز نہیں کیا۔بے تکے سے کپڑے جو اس کے مرمرا یسے ترشے ہوئے جسم پر ٹوٹی شاخوں کی طرح جھولتے رہتے اس کی ماں گاؤں کے ایک ایک گھر سے کپڑے مانگ کر لاتی انہیں پیوند لگا کر پہننے کے قابل بناتی تب بھی اللہ رکھی کو وہ کپڑے پسند نہ آتے۔

وہ مانگے تانگے کے کپڑے پہننے کے حق میں ہی نہ تھی حالانکہ اس کے کپڑے اس قدر بوسیدہ ہو جاتے کہ اس پر عریانی کا الزام لگتا وہ اس حالت میں بھی ملنگ بنی پھرتی رہتی۔لوگوں کے دلوں میں اس کی نفرت دو چند ہو جاتی اور اس کی ماں مجبور ہو جاتی کہ اس نے روٹیاں لگا کر جو دو چار روپے اکٹھے کئے ہیں ان سے اسے کپڑے لے دے۔

چنانچہ اللہ رکھی کو سال میں دو ایک بار نئے کپڑے مل جاتے جنہیں وہ بے دردی سے پہنتی اور فراخدلی سے پھاڑتی' یوں وہ اتنی لٹیری قسم کی تھی کہ اگر گاؤں کی کسی لڑکی کا کرتا یا اوڑھنی اسے پسند آ جاتی تو زبردستی اس سے چھین کے لے جاتی اس طرح سال بھر میں اسے کافی کپڑے مل جاتے اور اتنے ہی وہ پھاڑ بھی ڈالتی۔

آج بھی ذرا سی بات پر خفا ہو کر اس نے اپنی نئی اوڑھنی تار تار کر دی تھی ابھی پچھلی عید پر ماں نے کوڑی کوڑی جمع کر کے اسے یہ اوڑھنی لے کر دی تھی۔

بات صرف اتنی ہوئی کہ گاؤں کی ساری لڑکیاں مل کر پھٹی (کپاس) چننے جا رہی تھیں اللہ رکھی نے ان کا ساتھ دینا چاہا یوں اسے بھی دو چار روپے کمانے کا لالچ تھا۔کیونکہ کے موسم میں تو گاؤں کی کوئی لڑکی بھی گھر نہیں بیٹھتی تھی۔سال بھر میں وہ اسی موسم کا تو انتظار کرتیں جب وہ اتنی آمدنی کر لیتیں کہ اپنے لیے سونے کی بالیاں اور کپڑے بنا لیتیں۔

اس موسم میں گھر بیٹھنا وہ حماقت سمجھتیں' علی الصبح لال پیلی اوڑھنیاں اوڑھ کر اور سروں پر روٹی کی پوٹلیاں رکھے سب عورتیں'

لڑکیاں اور بچیاں کھیتوں کی جانب نکل جاتیں اور دور دور بکھر کر دھرتی کے سفید پھول چنتے ہوئے وہ آسمان کی حسد و رقابت میں مبتلا کر دیتیں سورج اس نظارے کی تاب نہ لا کر کبھی بادلوں کی آڑ لیتا اور کبھی آسمان سے منہ جوڑ کر ساز باز شروع کر دیتا۔

ہر سال تو اللہ رکھی کپاس چننے والیوں کو دور دور سے کنکر مارا کرتی تھی ان کی روئی والی پوٹلیاں لے کر ہوا ہو جاتی یا پھر کسی بدنصیب کی اکٹھی کی ہوئی کپاس ہتھیا لیتی اگر کوئی احتجاج کرتا تو اسے دانتوں سے کاٹ کر لہولہان کر دیتی۔

اس مرتبہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے سب لڑکیوں کے ساتھ مل کر کپاس چننے کی ٹھان لی اس کے نیک ارادے سے ماں خوش ہوئی۔

جب بھی وہ کوئی انسانی حرکت کرتی تو اس کی ماں خدا کا شکر ادا کرتی کہ شاید اس بلا کو عقل آ گئی۔

صبح ہی صبح اس نے ماں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا سر پر نئی لال اوڑھنی ڈالی روٹی کو رومال میں باندھا اور کھیتوں کی سمت چل پڑی۔ راستے میں اسے عورتوں کی ایک ٹولی مل گئی...... انہوں نے جب اللہ رکھی کو اس روپ میں نئے ارادے سے آتے دیکھا تو انہیں اپنا رزق چھنتا ہوا محسوس ہوا۔

اگر اللہ رکھی کھیت میں گھس گئی تو کوئی دوسری لڑکی کپاس نہ چن سکے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سب عورتوں کو ناخن چبھو چبھو کر اور دانتوں سے کاٹ کر گھر جانے پر مجبور کر دے اور آج کا سارا کام اپنے ذمے لے لے۔

چنانچہ اللہ رکھی کے قریب آنے سے پہلے انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو مار کر بھگا دیں گی۔

ساری کی ساری عورتیں دیوار بنا کر کھڑی ہو گئیں۔

اللہ رکھی بڑے سبھاؤ سے چلتی ہوئی ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اگر وہ جھگڑے پر آمادہ ہوتی تو دور سے ہی لال جھنڈی بنی آتی تھی پر آج تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ صلح کا سفید جھنڈا اٹھائے امن کی پیامی بنے چلی آ رہی ہو۔

”اری اور کھی کہاں جا رہی ہے۔“

پہل تاباں نے کی۔

تاباں گاؤں کے چودھری کی بیٹی تھی نام تو اس کا مہتاب بی بی تھا مگر ساری سکھیاں اسے تاباں کہہ کر پکارتی تھیں۔ وہ نہ صرف چودھری کی بیٹی تھی بلکہ اپنی ہم جولیوں میں سب سے زیادہ حسین تھی اور اسے اپنے حسن پر بھی ناز تھا۔ یوں اکڑ اکڑ کر چلتی جیسے دھرتی کو روند کر اس پر احسان کر رہی ہو سب لڑکیوں پر اس کا رعب چلتا۔ جس کھیل کا وہ حکم دیتی وہی کھیلا جاتا جس کے ساتھ جیسا برتاؤ وہ چاہتی

کیا جاتا۔لڑکیاں گویا اس کے حکم کی باندیاں تھیں اگر کسی نے اس کے حکم اور غرور کا تمسخر اڑایا تھا تو وہ اللہ رکھی تھی۔

اس لیے اللہ رکھی سے نفرت کرنے کے باوجود اس کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھا ہوا تھا اس کی زبان نہیں پاگل کی تلوار تھی جہاں چاہے لگ جائے اور وہ سب لڑکیوں کی حاکم ہو کر ایک حقیری لڑکی سے بے عزتی نہیں کروانا چاہتی تھی۔اللہ رکھی نے نہ تو اسے کبھی حسین جانا اور نہ ہی چودھری کی بیٹی سمجھ کر اسے قابل عزت سمجھا تھا۔

''چودھری کی بیٹی ہوگی تو اپنے گھر ہوگی میرے ساتھ تو جس نے مقابلہ کرنا ہے لڑائی کرلے۔''

پھر وہ مردوں کے سے انداز سے آستینیں اوپر چڑھانے لگتی اور لڑکیاں ہائے وائے کرتی بھاگ جاتیں۔

''یہ کوئی لڑکی ہے؟''

''یہ تو کوئی بلا ہے'بھوت ہے۔''

''چڑیل ہے ہر وقت مردوں کی طرح اچھلتی کودتی پھرتی ہے۔بے شرم کہیں کی'اسے کسی کا لحاظ نہیں'سر پر کوئی بزرگ جو نہیں رذیل کی اولاد۔''

لیکن اللہ رکھی صرف عورتوں سے ہی نہیں مردوں سے بھی نہیں ڈرتی تھی اگر گاؤں کا کوئی مرد اس کی جوانی کو للکارتا یا ماہیے کا بول اسے ستانے کی غرض سے اونچا گاتا تو وہ اس کا گریبان پکڑ لیتی ناخنوں سے اس کا منہ لہولہان کر دیتی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرا دیتی خود اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ جاتی اور کہتی۔

''بول کمینے تو مجھے کیا سمجھتا ہے۔''

اور جب تک وہ اعتراف نہ کر لیتا کہ وہ اسے اپنی سگی بہن سمجھتا ہے وہ اسے نہیں چھوڑتی تھی اس لیے گاؤں کے نوجوانوں نے اسے چھیڑنا بند کر دیا تھا اس کے پاس سے یوں گزر جاتے جیسے کوئی آسیب زدہ مکان ہو ذرا دم کوئی ٹھہرا اور اس پر اس کا سایہ پڑا۔

ابھی پچھلے مہینے بھی تو ایسا ایک حادثہ ہو چکا تھا۔چودھری کا بھتیجا جو شہر میں پڑھتا تھا۔پہلی بار اس گاؤں میں آیا تھا وہ سر پر خوشبوئی تیل لگا کے انگریزی طرز کی مونچھیں بنا کر روز گاؤں کے پنگھٹ کی طرف نکل جاتا اور لڑکیوں پر آوازیں کستا۔

ایک تو مہمان دوسرے چودھری کا بھتیجا چودھری کا اپنا لڑکا بھی کوئی نہ تھا اس لیے ساری لڑکیاں مارے مروت کے چپ ہو رہتیں کہ آیا ہے تو چلا ہی جائے گا۔

مگر ایک دن اس کی اللہ رکھی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

اس روز اللہ رکھی ماں کی منت سماجت کو قابل اعتنا سمجھ کر کنوئیں سے پانی لینے آ گئی تھی سب لڑکیاں پانی بھر کر کب کی جا چکی تھیں۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا....... ورنہ کسی نہ کسی بات پر اللہ رکھی کی کسی سے ہاتھا پائی ضرور ہو جاتی۔

چودھری لال دین کے بھتیجے نے اسے آنکھ ماردی۔

اللہ رکھی خلاف عادت مسکرا دی....... اس کے وار کرنے کے طریقے ہی نیارے تھے وہ سمجھ گئی کہ نو وارد ہے۔ ورنہ دن دہاڑے شیر کی کچھار کو چھونے کی جرات نہ کرتا۔

لہک لہک کر چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

اس کے الجھے ہوئے بال اس کی بڑی بڑی پاگل کر دینے والی آنکھیں' میدے ایسا رنگ اور سرخ انگارہ ہونٹ۔

اور اس کا جسم.......

الٰہی توبہ! ڈھیلے ڈھالے فرغل نما چولے میں اس کا ترشا ہوا۔ ہزار قیامتیں جگاتا ہوا جسم۔

چودھری کے بھتیجے نے سوچا اتنے دنوں کی خاک نوردی کام آئی پھنسی بھی تو کیسی لاجواب چھوکری۔

قریب آ کے اللہ رکھی نے مٹکے زمین پر رکھ دیئے اور اٹھلا کے بولی۔

''کیا بات ہے جناب؟''

''کچھ نہیں حضور!''

''سوچ رہا تھا اتنی نازک کمر پر تم نے دو مٹکے اٹھا رکھے ہیں۔ اجازت ہو تو یہ بوجھ میں اٹھا لوں اور تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔''

''اگر چھوڑ آؤ تو اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔''

اللہ رکھی نے اپنے چہرے کی خوبصورت وحشت میں معصومت ملاتے ہوئے کہا۔

''مگر پہلے یہ گھڑے بھر تو دو۔''

اس نے دونوں مٹکے زمین پر رکھ دیئے۔

نوجوان خوشی سے دیوانہ ہوا تھا۔ بڑھ کر کنوئیں کا ڈول چرخی سے اتارا اور آہستہ آہستہ اسے کنوئیں میں چھوڑنے لگا۔

اتنے میں نہ جانے کیا ہوا کہ خود اس کا سر گول مول گھومنے لگا اللہ رکھی نے اسے پیچھے سے اتنے زور سے دھکا دیا تھا کہ رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور وہ بے چارہ آدھا کنوئیں کے اندر اور آدھا باہر کو لٹک گیا تھا اس پر غضب یہ کہ اللہ رکھی نے پیچھے سے اس

کے دونوں بازو پکڑ لیے تھے اور اس طرح جھٹکے دے رہی تھی کہ جیسے اسے کنوئیں میں گرانا چاہتی ہے۔

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔"

نوجوان نے التجائیں کرنی شروع کیں۔

"پھر کسی عورت کو اکیلی دیکھ کر چھیڑو گے۔"

اللہ رکھی اسے جھٹکے دیتی جاتی اور ساتھ ساتھ پوچھتی بھی جاتی۔

"نہیں نہیں۔ میری توبہ ہے میں قسم کھاتا ہوں ہائے لوگو مجھے بچاؤ۔ ارے کوئی ہے۔"

وہ چیخیں مارتا جاتا اور ساتھ ساتھ لوگوں کو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

اس کی چیخ و پکار سن کر قریب قریب کام کرنے والے چند کسان اکٹھے ہو گئے تھے لیکن رکھی سے دو دو ہاتھ کرنے کی انہیں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"بس معاف کر دے رکھی۔ بس چھوڑ دے رکھی۔"

دور کھڑے اس کی منتیں کر رہے تھے۔ بالآخر رکھی جب اسے بے حد تنگ کر چکی اور ہزار ہا قسمیں اور وعدے لے چکی تو اس نے اسے باہر نکال لیا اس دن کے بعد سے چودھری کے گھر کے دروازے اللہ رکھی پر بند ہو گئے تھے۔ یہ سب کچھ تاباں کے حکم سے ہوا اس کا خیال تھا۔

"اللہ رکھی کون سی ایسی چور ہے جو اس نے میرے بھائی کی بے عزتی کی۔"

مگر ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اللہ رکھی کی مردمی کی دھوم دور دور کے گاؤں میں بھی مچ گئی اور مرد اس کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگانے لگے تھے۔

بڑے بوڑھوں کا خیال تھا۔

اس پر کسی بدروح کا سایہ ہے اس لیے آدھا مرد بن گئی ہے۔ اس کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا تھا۔ اور مردانہ وار دندناتی سارے گاؤں میں کدکڑے لگاتی پھرتی ہے۔"

مگر اللہ رکھی کو اس کی کیا پروا تھی وہ فخر کے مارے سارے گاؤں میں اکڑتی پھرتی۔

آج اس کو انسانی طور طریقوں سے آتا دیکھ کر سب ہی گاؤں والیاں جل گئی تھیں۔ کم بخت ذرا منہ دھو کر بال سنوار کر شعلہ جوالہ

لگ رہی تھی اس لیے تاباں نے ہی جل کر پہلا وار کرنے کا ارادہ کیا اور اس سے ادھر آنے کا سبب پوچھ بیٹھی۔

"چھٹی (کپاس) چننے جا رہی ہوں تم لوگوں کے ساتھ۔"

"ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔"

"کیوں؟"

وہ غرائی۔

"کیونکہ تو بڑی بدتمیز ہے۔"

تاباں نے غرور سے کہا۔

"اچھا!"

ایک دم رکھی کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے پیشتر اس کے یہ شعلے ان لڑکیوں تک لپک جاتے رکھی نے جانے کیا سوچ کر انہیں مدھم کر لیا اور نرم آواز میں بولی:

"آج بھی کیا میں بدتمیز لگ رہی ہوں؟"

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے سر سے اوڑھنی سرکا دی جیسے کہہ رہی ہو۔

"عرصہ بعد تو میں نے قرینے سے بال سنوارے ہیں دانتوں پر دنداسا لگایا ہے اور اجلے کپڑے پہنے ہیں۔"

"کنگھی کر لینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے تجھے تمیز تو نہیں آ سکتی۔"

آشاں نے آگے ہو کر کہا۔

"دیکھو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں آج کوئی خرابی نہیں کروں گی' مجھے عید کے لیے نئے کپڑے لینے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ چلنے دو۔"

اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"توبہ! تیری زبان کا تو وہ اعتبار کرے جو تجھ جنم جلی کو جانتا نہ ہو۔"

نذیراں نے چڑ کر کہا۔

"اور تجھے کیا پتہ تمیز کیا ہوتی ہے۔ تو تو زری جنگلی ہے پھر ہے تو وائی کی بیٹی تیرے تو خون میں شرافت نہیں ہے۔"

"دیکھ سرداراں مجھے غصہ مت دلاؤ ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔"

"خبردار جو زبان کھولی۔"

تاباں آگے بڑھ کر غرائی۔

"آج ہم ساری لڑکیاں مل کر تیرا قیمہ کر دیں گی۔ دیکھ لے ساری کی ساری تیار کھڑی ہیں۔ اور تیری ماں یہ قیمہ روٹیوں میں بھر کر سارے گاؤں کو کھلائے گی۔"

آشاں نے شہ دی۔

"کم بختو میں تم سب کے منہ نوچ لوں گی۔"

رکھی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"میں تم سب کمینیوں سے نہیں ڈرتی ایک ایک کر کے سب آؤ اور میرا مقابلہ کرو۔"

"ایک ایک کر کے آتی ہے ہماری جوتی۔"

سب سے پہلے تاباں نے اپنی جوتی اتھا کر ماردی اور دیکھا دیکھی ساری لڑکیوں نے جوتے نکال کر اس کی طرف پھینکنے شروع کیے۔

وہ غصے سے بے قابو ہو گئی آج جب کہ وہ دوستانہ رویہ بنا کر گھر سے نکلی تھی آج ہی اس کے جذبے کو جوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

جواب میں وہ پتھر اٹھا اٹھا کر ان لڑکیوں کی طرف پھینکنے لگی۔

جب اس اژدھام کے سامنے اس کا بس نہ چلا تو اس نے اپنا منہ نوچ لیا کپڑے پھاڑ ڈالے اور سامنے بہتے ہوئے گندے نالے میں گھس کر چھینٹے اڑانے لگی۔ ساری عورتیں ڈر کر کھسک گئیں اور وہ اکیلی رہ گئی۔

اکیلی مغموم اور غصے میں بپھری ہوئی۔

آج اگر اس کا ہاتھ آسمان تک جا پہنچتا تو اس ناانصافی پر وہ آسمان کے گریبان کی بھی دھجیاں اڑا دیتی۔

لیکن وہ اپنی دھن کی پکی تھی۔

سب عورتوں کو بھگا کر وہ تنہا ہی کپاس چنتی رہی اور شام تک اس نے اتنے پیسے بنا لیے جن سے ایک دوپٹہ اور قمیض نئی بن سکتی تھی۔

اگلے دن احتجاج کے طور پر وہ گھر سے باہر نہیں نکلی بلکہ تنور پر بیٹھ کر ماں کے ساتھ پیڑے بناتی رہی ایسا دن سال میں دو تین مرتبہ ہی آتا تھا۔ جب وہ ماں کا ہاتھ اپنی خوشی سے بٹاتی تھی ماں اسے ہر طریقے سے سمجھا کر تھک چکی تھی وہ بے چاری چلنے پھرنے سے

معذور تھی۔ مگر اسی حالت میں تنور گرم کرتی پیڑے بنا بنا کر روٹیاں لگاتی اس کے علاوہ تنور پر دال وغیرہ پکا کر رکھتی آنے والے مسافر اس کے تنور سے کھانا بھی کھاتے تھے۔ اس طرح اس کی گزر بھی اچھی ہو جاتی تھی تنور کے چھپر کے ساتھ اس نے گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی بنائی تھی رات کو تھک ہار کر وہ اس جھونپڑی میں پڑ رہتی۔

مگر رکھی نے تو جھونپڑی کو ایک پڑاؤ بنایا ہوا تھا۔ کھانے کے وقت آجاتی زبردستی ماں سے روٹیاں چھین کر پیالے میں دال ڈال لیتی اور کھانے بیٹھ جاتی۔ کھانے کے بعد وہی پیالی دھو کر غٹا غٹ پانی پی لیتی اور کدکڑے لگاتی گاؤں کی جانب بھاگ جاتی۔

پہلے پہل تو لوگ اس کی ماں کے پاس شکاتوں کے پلندے لے کر آتے رہے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ جوائی بے قصور ہے اور بے بس بھی تو وہ طرح طرح سے اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ان کی ہمدردی بھری باتیں سن کر جوائی خاموشی سے آنسو بہاتی رہتی اور اس کے ننھے منے آنسو تنور میں گرتے رہتے ذرا سی چھس کی آواز اور بس۔

ننھے منے قطرے بھلا اتنی شدید آگ کو کہاں بجھا سکتے ہیں۔

جوائی اپنی بیٹی سے خود بھی تنگ آ چکی تھی۔ اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ رکھی کی شادی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ اس کی شعلہ سامانیوں کی شہرت ساتھ والی بستیوں میں بھی پہنچ سکی تھی اپنے گاؤں میں سے تو کوئی غریب سے غریب چھوکرا بھی اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار نہ تھا۔

''توبہ توبہ اس قیامت کی بچی کو کون سنبھال سکتا ہے۔''

ہر کوئی کانوں کو ہاتھ لگا لیتا۔

اس کی ماں کی کوشش تھی کہ کسی دور کے گاؤں میں اس کی بات پکی ہو جائے دو چار رشتے جو دور پار سے آئے بھی گاؤں آتے ہی اس کی عادات و خصائل کی سدھ بدھ پا کر لوٹ گئے۔

جب بھی رشتے والے اسے دیکھ کر لوٹ جاتے تو ماں آہیں بھر بھر کر رو رو کر اسے سمجھاتی اور خدا کا واسطہ دیتی کہ ان رشتے والوں کے سامنے تو نچلی بیٹھا کر۔ ''ذرا سی دیر کو تمیز دار بن کر دکھانے سے فائدہ کیا ماں! تجھے معلوم تو ہے میں ٹک کر نہیں بیٹھ سکتی اور مجھے امید ہے کہ جو مجھے لے جائے گا دوسرے ہی دن واپس بھیج دے گا تو میں اپنے نام کو بٹہ لگوانے کے لیے جاؤں ہی کیوں!''

وہ بڑی ڈھٹائی سے کہتی اور پھر منہ لپیٹ کر سو رہتی۔

ایک بار اس کی ماں نے ذرا جرات مندانہ قدم اٹھایا' ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے لے گئی اور دور دراز کے ایک گاؤں میں اس کا

رشتہ طے کرآئی بلکہ شادی کی تاریخ بھی وہیں مقرر کرآئی تا کہ پہلے والی بات نہ ہو۔

جس صبح بارات کو آنا تھا اس نے رکھی کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے کہا کل تو شریف لڑکیوں کی طرح پرائی ہو کر چلی جائے گی۔ اس گاؤں میں بارات آ کر کبھی واپس نہیں گئی اگر ایسا ہو گیا تو گاؤں کی بدنامی ہو جائے گی اور لوگ کہیں گے آخر نیچ ہی نکلے نا؟"

بات تھوڑی تھوڑی رکھی کی سمجھ میں آ گئی۔ ساری رات وہ دبکی پڑی رہی اور زنجیر کو پاؤں کے قریب دیکھ کر روتی رہی۔

صبح سارے گاؤں میں رکھی کی شادی کی خبر مشہور ہو گئی۔ گاؤں کی عورتیں باری باری آنے لگیں تا کہ دیکھ سکیں کہ شیر بر پا بہ جولاں کیسا لگتا ہے؟

رکھی ایک چٹائی کے اوپر منہ پھلائے خاموش بیٹھی تھی اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اور نہ ہی کسی کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

گھوڑوں پر بارات آ گئی۔ شور مچ گیا۔ رکھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

لڑکیوں نے اسے اندر آ کر چھیڑنا شروع کیا۔

"اری اٹھ اپنے دولہا کو دیکھ لے۔"

مگر وہ پتھر بنی بیٹھی رہی۔

اتنے میں ایک سرخ جوڑا اور ٹیکا اندر آ گیا۔

"اٹھ کر کپڑے بدل لے۔"

اس کی ماں نے کہا۔

حقیقت میں اس وقت رکھی کا دل چاہ رہا تھا کہ کپڑے اٹھا کر جلتے ہوئے تنور میں پھینک دے تا کہ اس زنجیر کے ٹکڑے ہو جائیں' جو اس کی آزادی کو سلب کرنے والی ہے اچانک ہی ہنستی ہوئی تاباں جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ آج اس کی آنکھوں میں غرور دوبالا ہو گیا تھا۔ دراصل اسے رکھی کی جلا دینے والی خوبصورتی سے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔ آج وہ مطمئن تھی اور مسرور بھی وہ رکھی کا دولہا دیکھ کر آئی تھی۔ آتے ہی بولی۔

"اری میں تیرا ابا دیکھ کر آئی ہوں۔"

''ابا'' رکھی نے مغموم سی آنکھیں اٹھائیں۔

''اری وہی جس کے ساتھ تیری شادی ہو رہی ہے تو کہتی تھی نہ کہ تجھے ابا کہنے کا بڑا چاؤ ہے اب اپنے شوہر کو ہی ابا کہہ کر اپنا دل خوش کر لیا کرنا۔''

تاباں ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

''تاباں؟''

رکھی نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ تاباں کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔

''سچ بتا!''

اس کا گلہ بھر آیا۔

''رکھی تو کوئی فکر نہ کر بوڑھے شوہر بڑا راج کراتے ہیں اور پھر جلد ہی مر جاتے ہیں' تو دوسرا کر لینا۔''

آج تاباں جیت گئی تھی اور رکھی' جوائی کی بیٹی ہار گئی تھی۔

چھن چھن چھن رکھی کے ذہن میں زنجیر کھٹکنے لگی اس کا ذہن الٹ پلٹ ہونے لگا اس کی مردانہ حس بیدار ہو گئی۔

اتنے میں قاضی اندر پوچھنے چلا آیا۔

''نہیں نہیں نہیں۔''

رکھی نے اتنے زور سے کہا کہ باہر بیٹھے ہوئے آدمی بھی سہم گئے۔ رکھی کی ماں وہیں دہلیز میں بیٹھ گئی۔ پیشتر اس کے کہ قاضی باہر جا کر یہ خبر دے رکھی خود ہی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

ایک جھریوں دار چہرہ جس نے خضاب سے اپنے موئے سفید سیاہ کر رکھے تھے' سہرا باندھے بیٹھا تھا۔

''قاضی جی تم خود ہی انصاف کرو یہ بوڑھا آدمی میرا شوہر بننے کے لائق ہے یہ مجھ سے تگنا بڑا لگتا ہے۔ میں ابھی پورے اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوئی اور یہ قبر میں بھی پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اتنی ہی میں بری ہوں تو مجھے کنوئیں میں دھکا دے دو مگر اس جیتی جاگتی قبر کے حوالے نہ کرو۔''

دلہن کو دروازے پر کھڑے یوں بے باکانہ بولتے دیکھ کر سب لوگوں کے سر جھک گئے اک مرگ آسا خاموشی چھا گئی۔ رکھی نے لال جوڑا اور ٹیکہ اٹھا کر دولہا کے منہ پر دے مارا۔

"لے یہ لیتا جا اور میری طرف سے اپنی بیٹی کے جہیز میں دے دینا۔"

مرد جوتیاں پہننے لگے رکھی کھیتوں کی طرف بھاگ گئی۔ پھر جتنے منہ اتنی باتیں۔

رات کو جب رکھی گھر آئی تو ماں رو رو کر بدحال ہو چکی تھی۔ اس نے ماں کو منانا چاہا مگر اس نے نہ بولنے کی قسم کھالی' گاؤں کے لوگوں نے احتجاج کے طور پر تندور سے روٹیاں پکوانی بند کر دیں۔

مگر تا بہ کہ .... آخر حالات معمول پر آ گئے اور گاؤں والوں نے رکھی کو ایک بدروح کا سایہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ البتہ اتنا فرق ضرور پڑا کہ پہلے وہ وقتاً فوقتاً گاؤں کے ہر گھر میں گھس جاتی تھی اب اسے بلا اجازت کسی گھر میں گھسنے کی اجازت نہ تھی رکھی کی ماں کو اپنا تنور اور جھونپڑی آبادی سے دور بنا کر دے دیا گیا تا کہ گاؤں کی کنواری لڑکیاں رکھی کے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔

یہی غنیمت تھا اگر وہ رکھی اور اس کی ماں کو گاؤں سے ہی نکال دیتے تو کیا ہوتا۔

پہلے بھی وائی کو تقدیر ایک مرتبہ اسی طرح بے آبرو کر چکی تھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے' جب جوائی ابھی اللہ جوائی نہ بنی تھی بلکہ وہ گاؤں کے ایک سکھ نمبردار کی چہیتی بیٹی دلجیت کور تھی۔ مگر مقدر نے اس کے دل کو جس کا غلام بنا دیا تھا وہ اس کے باپ کا غلام تھا۔ صرف ملازم ہوتا تو بھی باپ صبر کر لیتا وہ تو غیر مذہب کا بھی تھا۔ چنانچہ وہ غلام رسول کی خاطر مسلمان ہو گئی اور انہوں نے گھر سے بھاگ کر خفیہ شادی کر لی۔ باپ نے نہ صرف ان کو گھر سے نکال دیا' بلکہ ان کے پیچھے آدمی لگا دیے کہ وہ ان دونوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اور انہیں کہیں سکون سے رہنے کی مہلت نہ دینا چاہتا تھا۔

وہ گاؤں گاؤں پیدل سفر کرتے اور چھپتے پھرتے تھے۔ مگر جہاں بھی ان کے قدم جمتے اس کے باپ کے مخبر وہیں پہنچ جاتے۔

اسی اثناء میں اللہ جوائی کا پیر بھاری ہو گیا۔ یہ غریب ابھی دربدر پھر رہے تھے کہیں ان کا مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔

اثاثہ پاس نہ تھا کہ کسی شہر کا رخ کرتے۔

ہندوؤں اور سکھوں کے کسی گاؤں میں بھی ان کا ٹھکانہ نہیں مل سکتا تھا۔ وہاں ہر جگہ اس کے باپ کا اثر رسوخ کام کر جاتا اسی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے ایک رات جوائی پر بڑی بھاری مصیبت آن پڑی۔

جب وہ ایک درخت کے نیچے پڑی دردزہ سے کراہ رہی تھی تو غلام رسول بیٹھا آنسو بہا رہا تھا اور اوپر آسمان اس پر اپنا سایہ کئے ہوئے تھا۔

پہلا بچہ جو بڑی مرادوں اور آرزوؤں سے آتا ہے اور جس کی آمد کے لیے ماں باپ دونوں چشم براہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس

کے سواگت کے لیے کچھ بھی نہ کیا تھا۔

حتیٰ کہ ایک کوٹھڑی بھی ان کے پاس نہ تھی جس کے سایہ تلے وہ بیٹھے ان لمحوں کو گزار سکتے۔

رات بھر وہ غریب درد سے تڑپتی رہی تھی۔ اور وہ دور بیٹھا اس کو دیکھتا رہا تھا۔

اسے امید نہیں تھی کہ اس کی بیوی آج زندہ بچ سکے گی۔

علی الصبح جب اس نے ایک بچے کے رونے کی آواز سنی تو اسے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

اسی لیے تو اس نے اپنی لڑکی کا نام اللہ رکھی رکھا تھا۔ جسے اللہ نے دوسری زندگی عطا کی تھی۔

دودن کے بعد پھر انہوں نے اپنا سفر شروع کر دیا اب کے زادراہ کے طور پر ان کی گود میں ایک بچی تھی۔

ان کا خیال تھا وہ کسی ایسے گاؤں میں پناہ لے سکتے ہیں۔ جس کی زیادہ آبادی مسلمان ہو اور جس کا نمبر دار مسلمان ہو۔

انہیں اس گاؤں میں پناہ بھی مل گئی تھی اور وہ منزل پر پہنچ کر ٹھکانہ بنانے کا بھی سوچ رہے تھے مگر اس کے والد کے مخبروں نے اسی رات غلام رسول کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

ٹھکانہ ملا بھی تو کب!

جب آسرا دینے والا نہ رہا۔

اللہ جوائی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اسی گاؤں میں آمدنی کا کوئی ذریعہ پیدا کرے۔ چنانچہ اس نے تنور میں روٹیاں لگانی شروع کر دیں۔

بے اندازہ سفر صدمات اور زچگی میں بے احتیاطی کی وجہ سے اس کے جوڑوں میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ وہ ہر دم چار پائی کے ساتھ لگی رہتی۔

شروع شروع میں وہ بچی کی طرف بالکل توجہ نہ دے سکی۔ یوں بھی وہ بچی کو لاشعوری طور پر منحوس خیال کرنے لگی تھی۔ جس کے پیدا ہوتے ہی اس کا محبوب چھن گیا۔ اور وہ بیمار اور معذور ہو گئی تھی۔

وہ زیادہ چلنے پھرنے کا کام نہیں کر سکتی تھی اسے صرف تنور کے کام میں آسانی تھی جہاں وہ سارا کام بیٹھے بٹھائے کر لیتی تھی۔

سردیوں میں تو اس کے قویٰ بالکل جواب دے جاتے تھے بچی سارا دن پڑی روتی رہتی۔ کسی راہ گیر کو ترس آ جاتا تو کھانے کی کوئی شے اس کے ہاتھ میں پکڑا جاتا گاؤں کے بچے طرح طرح سے اسے تنگ کرتے' کوئی اسے سکھنی کہتا اور کوئی حرامی۔

وہ جب کبھی ان باتوں سے عاجز آ کر ماں کی طرف رجوع کرتی تو ماں بھی اسے کھانے کو پڑ جاتی اور ہمیشہ کہتی۔

"تو ہے ہی منحوس میں تجھے کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اندر باہر کسی کو ہمدرد وغمگسار نہ پا کر وہ ننھی سی فرشتہ صفت بچی خونخوار اللہ رکھی بن گئی۔

اس دن کے بعد سے اللہ رکھی مسلسل تنور پر رہنے لگی تھی۔ ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ تنور گرم کرنے کے لیے گھاس پھونس اکٹھا کر کے لا دیتی۔ اور جب لوگ اپنے گھروں سے گندھا ہوا آٹا لے کر آتے تو ان کے ساتھ بیٹھ کر پیڑے بنوا دیتی گول گول سنگ مرمر کے ترشے ہوئے پیڑے جنہیں وہ بڑی مہارت سے ایک ہتھیلی پر نچا کر دوسری ہتھیلی پر منتقل کر دیتی۔

اس کی ماں دل میں حیران ہوتی کہ یہ ہے وہ کھلنڈری لڑکی جس نے ماں کے کام کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی۔

مگر اب کیسے سبک اور خوبصورت پیڑے بنا رہی تھی جیسے اس کے ہاتھ عادی ہوں مدت سے۔

اس کی اس تبدیلی پر ماں خوش بھی بہت رہتی تھی اس لیے اس کی جھڑکیوں اور گالیوں میں کمی آ گئی تھی۔

مگر حقیقت میں اللہ رکھی ذہن میں ایک انتقامی پلان بنا رہی تھی۔ اس روز جو گاؤں کی ساری عورتوں نے اس کی بے عزتی کی تھی تو ان پر گندا پانی پھینک کر بھی اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

اس کا تو یہ مطلب تھا کہ سارا گاؤں کھلم کھلا اسے ذلیل سمجھنے لگ جائے۔

ویسے وہ آزردہ بھی تھی اور اپنی آزردگی کو چھپانے کے لیے اس نے گاؤں کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن تنور پر اپنے آپ کو مصروف رکھتی۔

اللہ رکھی پیڑا بناتے بناتے چونک گئی سامنے کی پگڈنڈی سے مٹی کا ایک بگولا اٹھا جو گاؤں کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

"اس تپتی دھوپ میں کون آ رہا ہے؟"

اللہ رکھی کے گال تمتمائے ہوئے تھے۔ منہ پر جا بجا خشک آٹا لگا ہوا تھا۔ کچھ سوکھا آٹا اس کے گھٹنوں پر ڈھیر ہو گیا تھا اور وہ آلتی پالتی مارے دوپٹے کو پیچھے گرائے پیڑے بھی بنائے جاتی اور اس بڑھتے ہوئے بگولے کو دیکھ رہی تھی۔

زیادہ گاہک جا چکے تھے وہی بیٹھے تھے جو آج دیر سے آئے تھے۔ لگانے والی باقی دو تین پراتیں رہ گئیں تھیں نہ جانے کیسے چند لمحوں کے لیے اللہ رکھی کا دھیان اس بگولے کی طرف سے ہٹ گیا۔ شاید وہ کسی گاہک کو روٹیاں گن کر دینے میں مگن ہو گئی تھی۔

اور جب ٹپ ٹپ کی آواز سن کر اس نے نظر اٹھائی تو اس کا جنگلی بلی کی طرح اچھلتا ہوا دل دھک سے رہ گیا۔ پیڑا اس کی ہتھیلی پر

پڑا تھا۔ ناک کھجانے سے اس پر تھوڑا سا آٹا لگ گیا تھا۔ وہ منہ کھولے آنکھیں پھاڑے آنے والے راہی کو دیکھے جا رہی تھی۔

اونچا لمبا' چوڑا چکلا جوان گھبرو آنکھوں میں لال ڈورے مونچھیں تنی ہوئی۔ گردن کندن کی طرح دہکتا ہوا چہرہ صحت و توانائی کا شاہکار لگ رہا تھا۔

اب اس کے گھوڑے کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی وہ دور قریب ہر جگہ نظر دوڑاتا ہوا گاؤں کی سمت جا رہا تھا ایک سرسری سی نظر اس نے تنور والوں پر بھی ڈال لی۔

ایک سرسری اور حقیر نظر۔

لال لال ڈوروں والی مغرور نظر۔

پیڑہ رکھی کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اتنی جلدی کہ تنور پر بیٹھے ہوئے کسی شخص نے بھی اس کا اٹھنا محسوس نہیں کیا۔

سوار تنور سے آگے جا چکا تھا۔

''کتنا خوبصورت گھبرو ہے۔''

کسی نے کہا۔

اللہ رکھی نے اپنے پاؤں پر سے آٹا جھاڑا' اس کا دل چاہ رہا تھا' لپک کر اس کے پیچھے جائے اور اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ جائے اور اس کی کمر پر ہاتھ ڈال کر کہے۔

''آخر تم آ ہی گئے نا؟''

پیشتر اس کے کہ وہ کدکڑے لگاتی ہوئی بھاگ پڑتی ماں نے حیرت سے اس کا سراپا دیکھا اور بولی۔

''تو کہاں جا رہی ہے رکھی ابھی دو تین پراتیں پڑی ہیں۔''

''بس بس۔''

رکھی کے اندر وہی الہڑ آزاد اور خودمختار رکھی جاگ اٹھی۔

''میرا کام ختم.......میرا کام ختم۔''

اور وہ اسی سمت بھاگی' جدھر گھوڑے والا گیا تھا۔

"پہچانتے ہو یہ کون ہے۔"

"نہیں۔"

دوسرے نے کہا۔

"چودھری صاحب کا جوائی (داماد) ہے۔"

"بھئی بڑا الا جواب ہے۔" سب مڑ مڑ کر ادھر دیکھنے لگے۔

"رکھی۔اورکھی۔"

رکھی کی ماں نے نیا خطرہ محسوس کرتے ہوئے رکھی کو پکارنا شروع کیا جو گھوڑے کے سموں کے نشانات پر سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔

"واپس آ جا رکھی کوئی شرارت مت کرنا....... یہ چودھری صاحب کا جوائی ہے۔"

"چودھری صاحب کا جوائی؟"

رکھی کا جنگلی دل بند ہونے لگا اس نے اتنی دور اپنی ماں کی پکار سن لی تھی۔ دل پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔

"تو....... تو....... اس کا مطلب ہے یہ تاباں کا منگیتر ہے او تاباں تیرا ستیاناس ہو جائے تو واقعی مجھ سے بازی لے گئی یہ

.......یہ جو میرے سپنوں کا راجہ ہے وہ تیرے سہاگ کا پھول ہے۔

ہائے ری قسمت۔

تو غریبوں کا مذاق اس طرح کیوں اڑاتی ہے۔

رکھی کی حالت اس کبوتری کی سی تھی۔ جسے اڑتے ہی شکاری نے گولی ماردی ہو اور وہ ڈھیلے کی طرح لڑھک کر زمین پر آ پڑی ہو۔

بے حس اشک ریز اور خون آلود رکھی کے اندر مختلف قسم کے جذبات سر اٹھانے لگے۔

نفرت' حقارت' انتقام ہزیمت اور محبت....... اور محبت سب پر حاوی ہو گئی۔

اور محبت سب پر حاوی ہو جاتی ہے۔اس کے ہاں دوست دشمن کی کوئی تمیز نہیں یہ غریبی امیری پر سوچنے کی مہلت نہیں دیتی اس کا فیصلہ یک طرفہ ہوتا ہے۔

اس کا فیصلہ موت ہوتا ہے۔

اور دل والے اس فیصلے کو قبول کر لیتے ہیں۔

چند لمحوں میں....... اچھلنے کودنے....... پھلانگنے اور کاٹنے والی رکھی نے بہت بڑا فیصلہ کر لیا وہ عقل جو دور دور سے چڑاتی تھی اور اس کے بھیجے میں نہیں سماتی تھی۔ آ کر اس کے گلے مل گئی۔ اس موڑ پر جہاں وہ جنون کا خیر مقدم کر رہی تھی راہوں میں ابھی تک مٹی کے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔ راہی کا گھوڑا اسی دلکی چال سے جا رہا تھا' رکھی گھوڑے کے سموں کے نشان پر بیٹھی تھی اور معدوم ہوتے ہوئے گھوڑے کے قدموں سے جو مٹی کے ننھے منے بگولے اٹھ رہے تھے ان کو دیکھ رہی تھی۔

"آ....... میں تیری اوک سے اپنی جنم جنم کی پیاس بجھالوں۔ دیر سے آنے والے راہی میں کب سے تیری راہ تک رہی تھی"

تو آیا بھی تو کسی اور کا مقدر بن کر۔

ہائے جنم جلی' پگلی' جھلی' کملی رکھی۔

کسی کے سورج سے اپنا گھر کب منور ہوتا ہے؟

کسی کے مقدر سے اپنے دل کی کلی کب کھلتی ہے؟

کپڑے تار تار کرنے والی رکھی۔

بندے بندے کو ٹھکرانے والی رکھی۔

تیرا پیراہن جنون چاک کرنے والا اور تجھے ٹھکرانے والا آ پہنچا ہے۔

"اب ڈرتی کیوں ہے؟"

"تنور میں اگر سر جھونک سکتی ہے تو اس آگ سے کیوں خوف کھا رہی ہے؟"

میں قربان جاؤں تیرے' ہٹ ہٹ کے تجھ کو دیکھوں گی۔ تیرے قریب نہیں آؤں گی۔"

اس نفرت کا اندازہ نہیں کروں گی' جو تیرے دل میں میرے لیے ہوگی۔

چلوں گی تیری راہ پر ہی!

راہی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا' ماحول پر سناٹا چھایا ہوا تھا رکھی کی ماں نے اسے زمین پر بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ بے فکر ہو کر تنور پر جا بیٹھی تھی۔

رکھی ہولے سے اٹھی۔

بیٹھنے اور اٹھنے میں رکھی بدل گئی تھی۔

لڑکھڑاتی ہوئی ڈولتی ہوئی ایک شکست خوردہ چال سے وہ سموں کے نشانات پر چل کھڑی ہوئی تھی ہر قدم پر وہ گھوڑے کے سموں کے نشان اپنے ننگے پیروں سے مٹا دیتی گویا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی جانے والے کا کھوج پا سکے۔

وہ رکھی جو زبردستی جینے کی قائل تھی۔ چھینا جھپٹی جس کا مسلک تھا بن دیکھے بھالے کہے سنے بنا شکست کھا گئی تھی۔

جانے وہ کب تک اپنے ہی خیالوں میں ڈوبی آنکھیں مسل مسل کر چلتی رہی کہ....... اچانک گھوڑے کی ہنہناہٹ سن کر وہ چونک گئی سامنے ندی پر مسافر اپنے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا۔ رکھی کا دل مارے خوشی کے یوں اچھلنے لگا جیسے وہ اسی کے انتظار میں رک گیا ہو۔ سموں کے نشانوں پر قدم رکھتی ہوئی وہ ہولے سے اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

پانی پی کر گھوڑا پیچھے ہٹنے لگا اچانک بدکا اور مسافر سمیت زمین پر چت ہو گیا۔

سافر کا شملہ پانی میں بھیگ گیا وہ بالکل سیدھا گرا تھا۔

اللہ رکھی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

فوارے کی طرح رواں' بے خوف نقرئی ہنسی۔

نوجوان حیران ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے تو اسے ایک خوبصورت بھوت کا گمان ہوا جب تھوڑی دیر بعد اس کے حواس بجا ہوئے تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ ہاتھوں اور کہنیوں پر آٹا لگا دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس لڑکی کا نزدیکی تنور سے کوئی تعلق ہے۔

"لاؤ چودھری جی! آپ کے کپڑے جھاڑ دوں پیچھے سارا گارا لگا ہوا ہے۔ آپ کی ہونے والی دلہن سمجھے گی شاید آپ اکھاڑے میں ہار کر آ رہے ہیں۔" رکھی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو کون ہے منحوس لڑکی۔" جوان گرجا۔

"منحوس"

رکھی کا دل ٹوٹ گیا ماں بھی کہتی ہے تو منحوس ہے۔ گاؤں والے بھی کہتے ہیں تو منحوس ہے اور تیرے پیار کا حاصل بھی کہتا ہے کہ تو منحوس ہے۔

"کیوں چودھری جی! کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے کہ میں منحوس ہوں۔"

اس نے سوگوار تبسم سے پوچھا۔

''میرا گھوڑا آج تک کسی شے سے ڈر کر نہیں بدکا۔ اور یہ تو گہرے پانیوں میں چلنے کا عادی ہے۔ آج پہلی مرتبہ تجھے دیکھ کر یوں گرا ہے۔''

''ہائے چودھری جی! میرا دل بھی تو تمہارے گھوڑے کی طرح تھا' نڈر بے خوف اور گہرے پانیوں میں کود جانے والا۔ مگر تمہیں دیکھ کر پہلی بار گرا ہے۔ ٹوٹ گیا ہے چکنا چور ہو گیا ہے۔ خاک میں مل گیا ہے میں کسے الزام دوں؟''

میں تمہیں منحوس نہیں کہہ سکتی۔ میرے لیے تو تم زندگی کی پہچان بن کر آئے ہو اور لامتناہی غم دینے کے ساتھ تم نے میرے لامتناہی انتظار کا طلسم بھی توڑ دیا۔

مگر چودھری اسے سوچ میں مگن چھوڑ کر غرور سے اپنا ہنٹر گھماتا ہوا ہوا ہو گیا تھا۔

اس نے نگاہ اٹھائی دور بہت پرے اونچے درختوں کے جھنڈ کے اوپر سے اسے بڑے چودھری کی حویلی کا برج نظر آ رہا تھا۔

برج جو چھوٹے چودھری کی پگڑی کے شملے کی طرح اکڑ کھڑا تھا جیسے چھوٹے چودھری کو اپنی سمت بلا رہا ہو۔

اللہ رکھی ایک بار پھر وہی جنگلی بن گئی تھی۔ اس کی جولانیاں اور بڑھ گئی تھیں اب تو وہ تنور پر آنے والے لوگوں سے بھی الجھ پڑتی' اگر غصہ آ جاتا تو ان کا آٹا اٹھا کر تنور میں پھینک دیتی۔ تنور پر گاہک کم ہو گئے تھے اور ماں کے کوسنوں اور گالیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

انہی رواں دواں دنوں میں گاؤں بھر میں تاباں کی شادی کے چرچے ہونے لگے اب رکھی پھر بھیگی بلی بنی تنور پر آ کر بیٹھنے لگی تھی۔ محض اس لیے کہ تنور پر آنے والے لوگوں کی زبانی تاباں کی شادی کی عجیب و غریب باتیں سننے میں آتی تھیں بظاہر وہ منہ پھلائے پیڑے بناتی رہتی مگر در پردہ کان لوگوں کی باتوں پر لگے ہوتے۔

جس دن تاباں کے سسرال والے تاریخ رکھنے آئے تو چالیس من لڈو لے کر آئے تھے۔

بڑی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے ہمارے چودھری نے' سنا ہے چودھری اللہ یار کا باپ ہمارے چودھری کی زمین سے دگنی زمین کا مالک ہے۔ ایک جیپ اور ایک موٹر کار ہے۔ گاؤں میں شہریوں کا سا گھر بنا کر رہتے ہیں۔

اور سنا ہے جو بجلی بنانے والی مشین ہوتی ہے نا۔ وہ انہوں نے اپنی حویلی میں لگا رکھی ہے۔ اس سے ان کے گھر میں بجلیاں اور پنکھے چلتے ہیں۔

''بڑی قسمت والی ہے اپنی تاباں' جیسی صورت ویسے ہی نصیب ہیں۔''

''ہاں جی! اللہ بھی کچھ سوچ کر ہی صورت گھڑتا ہے۔''

اور اسی وقت رکھی کو کسی پیڑے پر طیش آ جاتا اس کا دل چاہتا اپنا گریبان چاک کر دے اور مخاطب سے پوچھے۔

''کیا اس سینے میں دل نہیں ہے! کیا تاباں سے زیادہ حسین نہیں ہوں۔ ایمان داری سے کہو پھر میری صورت اللہ نے کیا سوچ کر بنائی ہے کہ ہر شخص مجھ سے بس نفرت ہی کرتا ہے۔''

مگر وہ ہونٹ چبانے کے سوا کچھ نہ کر سکتی۔ روٹی کو جان بوجھ کر جلا دیتی یا پیڑا تنور میں پھینک دیتی وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اور پھر تاباں نے جان بوجھ کر اس کا سہاگ نہیں چھینا تھا وہ تاباں کے مال کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتی تھی۔

چھی چھی کتنی گھٹیا بات تھی تاباں چودھری کی بیٹی ہی نہیں اس کی سہیلی بھی تھی۔ وہ خود کو بہت لعنت ملامت کرتی اور دل میں فیصلہ کر لیتی کہ اب وہ لوگوں کی باتیں سننے کے لیے تنور پر آ کر نہیں بیٹھے گی لیکن جونہی مختلف آوازیں اس کے کانوں میں پڑتیں اس کا تجسس اسے جھونپڑی سے باہر نکال لیتا۔ مثلاً

''تاباں کا ایک سوا ایک جوڑا کپڑوں کا بن کر آ رہا ہے۔''

''ہائے تاباں تو بڑی خوش نصیب ہے۔ اس کے گھبرو نے شہر سے اسے اپنی تصویر کھنچوا کر بھیجی ہے۔ تصویر میں وہ اپنے سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہا ہے اور پتہ ہے تاباں ہر وقت وہ تصویر اپنے سرہانے تلے رکھتی ہے۔''

''آج تاباں کو گیروا جوڑا پہنا کر مائیوں بٹھا دیا گیا ہے۔''

''آج تاباں کی سسرال والیاں مہندی کی رسم کرنے آئیں گی۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ایسی باتیں سن کر بھلا رکھی کا پاگل من کب مانتا تھا۔ وہ زخمی دل لیے باہر آ جاتی اور یوں باتیں سنتی جیسے زخموں پر انگارے رکھ رہی ہو۔

جس رات تاباں کی مہندی تھی رکھی پاؤں جلی بلی کی مانند منڈیر پر پھر رہی تھی۔

دو چار لڑکیاں جو اچھے کپڑے پہن کر تاباں کے گھر جا رہی تھیں انہوں نے رکھی کو راہ میں ٹوک کر کہا۔

''ایسے کیوں چڑیل بنی پھر رہی ہو کیا آج تجھے تاباں نے نہیں بلایا۔''

''تاباں مجھے کیوں بلاتی؟''

رکھی جل ہی تو گئی۔

''پھر بھی تیری سہیلی تو بنتی تھی نا!''

"اس کی سہیلی بنتی ہے میری جوتی......."

رکھی نے ناک چڑھایا۔

"چہ....... چہ بچاری جل گئی تاباں کی شادی سے۔"

لڑکیوں نے زبانیں نکال کر اسے چڑایا۔

جلتا ہے میرا یہ......."

اس نے انگوٹھا نکال کر دکھایا۔

"جاتی ہو یا تمہاری خبر لوں۔"

لڑکیاں اس کے غرانے سے ڈر کر بھاگ گئی تھیں۔ رکھی کے روئیں روئیں میں آگ کے الاؤ دہکنے لگے۔ تاباں کے گھر سے آتش بازی چھوٹنے لگی۔ اور آوازیں آنے لگیں اس کا دل چاہ رہا تھا آج وہ چودھری کے گھر میں ایسا گولہ پھینکے کہ اس کی ساری حویلی جل جائے اور تاباں کے وہ مہندی والے ہاتھ بھی جنہیں چودھری اللہ یار چومنے والا تھا۔

ساری رات وہ جوگیوں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں گھومتی رہی اور تاباں کو جلانے کی ترکیبیں سوچتی رہی بالآخر وہ گھر آ کر سو گئی۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب سارے گاؤں میں باجوں کا شور طوفان برپا کئے ہوئے تھا۔ گولے اور انار چھوٹ رہے تھے اور ہوائی فائر ہو رہے تھے اور وہ یوں اٹھ بیٹھی جیسے سوتے میں قیامت آ گئی ہو۔

بال بکھرائے وہ دیوانہ وار باہر کو لپکی' بارات موٹروں پر آ رہی تھی ساتھ گھوڑے بھی تھے اور یکے بھی عورتیں ساری موٹروں میں جا بیٹھی تھیں۔ اگلی موٹر پر رنگ برنگ پھولوں کا جال بنا ہوا تھا اس نے دیکھا اور صاف دیکھا کہ چودھری اللہ یار سہرا باندھے پھولوں سے ڈھکا اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایسے خوش جیسے بادشاہی تاج سر پر سجا لیا ہو۔

ہائے....... رکھی کے دل سے اک ٹیس سی اٹھی۔

اور وہ ننگے پاؤں جھونپڑی سے نکل کر رہگذر میں پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گئی' جانے وہ قریب سے نظارہ کرنا چاہتی تھی یا اتنی دیر کھڑا رہنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔

بارات رینگتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آگے آگے بینڈ والے اور آتش بازی والے پیدل چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے باقی کاریں آ رہی تھیں۔

جب باجے والے آگے نکل گئے اور دولہا کی کار اس کے قریب سے گزری تو وہ فرط شوق سے کھڑی ہو گئی اسی لمحے ایک پٹاخہ چھوٹا ...... ہائے کر کے رکھی نے پاؤں اٹھا لیے چودھری اللہ یار نے گھبرا کر باہر دیکھا دوسری طرف سے ڈرائیور دروازہ کھول کر نکل آ گیا۔

"جناب پچھلا پہیہ پنکچر ہو گیا۔"

چودھری اللہ یار نے ایک قہر آلود نگاہ بکھری بکھری وحشت زدہ اللہ رکھی پر ڈالی جس کے اوسان اس طرح خطا تھے جیسے عزرائیل کو دیکھ لیا ہو۔

"یہ منحوس چھوکری جو سامنے آ گئی تھی پہیہ کیسے نہ پنکچر ہوتا۔"

"چودھری چودھری۔"

رکھی کا دل چاہا اس کا سینہ اپنے دو ہتھڑوں سے کوٹ ڈالے اور کہے۔

کاش آج تیری شادی رک جائے تو میری طرح خالی جھولی لے کر یہاں سے واپس جائے پھر مجھے بھی اپنے منحوس ہونے کا یقین آ جائے گا اور میں ساری دنیا سے چیخ چیخ کر کہوں گی۔

"دیکھو لوگو میں منحوس ہوں کیونکہ میری وجہ سے چودھری اللہ یار کا خانہ خراب ہو گیا۔"

"لیکن چودھری تو امیر آدمی ہے تو میرا خانہ خراب کر کے جا رہا ہے۔ میرے واسطے تو تو منحوس ترین آدمی ہے۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور کٹیا میں گھس گئی۔

سارا دن وہ باہر نہ نکلی گاؤں میں چلنے والے پٹاخے اور گولے اس کے خرمن سکون کو خاکستر کرتے رہے۔ شور و غل اور چہل پہل نے اس کو ادھ موا کر دیا۔

آج اس کی ماں نے کئی بار مجبور کر کے اس کو گاؤں کی جانب بھیجنا چاہا کیونکہ چودھری لال دین بیٹی کی شادی کی خوشی میں غریب لوگوں میں کپڑے تقسیم کر رہا تھا کوئی اور دن ہوتا تو وہ بھاگ کر جاتی اور دو چار کپڑے دوسری لڑکیوں سے بھی چھین کر لے آتی مگر آج.......

آج اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے چودھری لال دین کپڑے نہیں بلکہ کفن تقسیم کر رہا ہے۔

اگلے روز دستور کے مطابق تاباں کی بارات کو ڈولی لے کر واپس جانا تھا۔ بارات صبح کاذب کے وقت تاروں کی چھاؤں میں رخصت ہوئی۔

پھر اسی طرح ایک خوبصورت ہنگامہ جاگ اٹھا باجے بجنے لگے۔ گولے چھوڑے گئے ہوائی فائر ہوئے۔ مزارعین نے بھنگڑا ڈالا ......اور آتش بازی کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ بارات اسی طمطراق اور کروفر کے ساتھ رکھی کے جھونپڑے کے آگے سے گزری۔

زخم خوردہ ٹھکرائی ہوئی رکھی کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر ایک نظارہ کر لے۔ آخری نظارہ کہ اس کا جیالا' سپنوں کا شہزادہ اپنے دل کی بازی جیت کر اپنی شہزادی کو لیے کس طرح قائم مسرور منزل کی جانب رواں ہے۔

ذرا اٹھ کر اس کے چہرے پر خوشیوں کا نور پھوٹتا ہوا بھی دیکھ لے۔

اور نہیں تو تاباں کی ڈولی کا پردہ اٹھا کر ہی اس کے حسین چہرے پر دوشیزگی اور سہاگ کے سنگم کا دلفریب منظر دیکھ لے اسے اپنی جیت پر مبارک باد ہی دے لے خواہ وہ اس کے جواب میں اسے گالی دے دے....... اور نہ چاہتے ہوئے بھی باجوں کی گھن گرج کو سن کر وہ جھونپڑی کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی بڑا خوبصورت منظر تھا۔ مشعلیں تھیں باجے تھے۔ خوشیاں تھیں مہکار تھی۔ چھوٹا چودھری ایک خوبصورت اور صحت مند گھوڑے پر سہرا باندھے بیٹھا اترا رہا تھا اور پیچھے پیچھے کچھ کہاروں نے تاباں کی ڈولی اٹھائی ہوئی تھی اردگرد آتش بازی کے گولے چھوڑے جا رہے تھے۔ خوشیوں اور قہقہوں کے اس سمندر میں جانے کس طرح ایک چنگاری آتش بازی کے اس ٹوکرے میں جا پڑی جو ایک آدمی سر پر اٹھائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دھماکے کے ساتھ ہی اس کے پرخچے اڑ گئے اور وہ ٹوکرا سیدھا ڈولی کے اوپر گرا۔

لوگ ہراساں ہو گئے۔ خوبصورت ہنگامہ چیخ و پکار میں بدل گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کہار ڈولی چھوڑ کر بھاگ گئے چودھری کا گھوڑا بدک کر یوں بھاگا کہ کوئی اس کی باگ پر گرفت ہی محسوس نہ کر رہا تھا۔

اذیت پسند رکھی کو بڑا مزا آ رہا تھا۔

''آہا کتنا اچھا ہوا۔ اب کس کی نحوست پڑی ہے ان پر غارت ہوں سارے۔

پھر اس کی نظر تاباں پر پڑی ڈولی بڑی تیزی سے جل رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی اور زیوروں سے لدی تاباں شعلوں کے درمیان بالکل غلہ لگ رہی تھی اور مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ رکھی کا دل چاہا کہ شعلوں کے سامنے کھڑی ہو کر خوب تالیاں بجائے اور جلتی کو اور جلائے وہ دوڑ کر سامنے آئی جونہی تاباں نے اسے دیکھا بے بسی سے اپنے دونوں مہندی لگے ہاتھ پھیلا دیئے اور چلا کر بولی۔

''رکھی خدا کے لیے مجھے بچا لے رکھی' رکھی!''

زیوروں سے لدی ہوئی بانہیں' مہندی میں رنگے ہاتھ اور خوفزدہ پھیلی ہوئی کاجل والی آنکھیں سہاگ کا لال جوڑا۔

شعلے اس کے دوپٹے کو لپٹ گئے تھے اور ڈولی کے چاروں طرف پھیلا ہوا بارود جل رہا تھا کوئی راہ فرار نہ تھی۔
چھینا جھپٹی کرنے والی اور مار دھاڑ سے بھرپور رکھی نے چیتے کی طرح ایک جست لگائی اور تاباں کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر دور پھینک دیا اس کا جلتا ہوا دوپٹہ رکھی کے بازوؤں پر رہ گیا تھا۔
رکھی جو ابھی تک شعلوں میں گھری کھڑی تھی وہ جلتا ہوا راکھ بنتا ہوا سنہری تاروں والا سہاگ کا دوپٹہ اس نے اپنے اوپر اوڑھ لیا تھا۔
سب لوگ رکھی کی اس حرکت پر دنگ تھے تاباں کو بچانے کے واسطے کسی کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ جب رکھی نے اسے اٹھا کر دور پھینک دیا تو سب لوگ اسے اٹھانے کو بڑھے اور اسے آگ کے شعلوں سے بہت دور لے گئے سارا مجمع اس کے اردگرد اکٹھا تھا کوئی زیور اتار رہا تھا' کوئی اسے ہوش میں لا رہا تھا۔ کوئی چھوٹے چودھری کے گھوڑے کو قابو کر کے لا رہا تھا۔
غرض عجیب سراسیمگی اور افراتفری کا عالم تھا جب تاباں نے آنکھیں کھول کر اپنے پرائے کو پہچان لیا اور صبح اچھی طرح نمودار ہو گئی تو لوگوں کا دھیان رکھی کی طرف گیا۔
رکھی جس نے اتنا عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔
جلتی ہوئی ڈولی کے پاس رکھی راکھ ہوئی پڑی تھی۔
اس کے چاروں طرف سہاگ کے دوپٹے کی راکھ تھی۔
تاباں کی پریشانی میں کسی کو رکھی کے بچانے کا خیال ہی نہ آیا۔ اور کسی کو خیال آتا بھی کیوں کر؟
کوئی اسے انسان تو سمجھتا نہیں تھا۔
جانے کیوں اس جلتے ہوئے وجود کے پاس کھڑا چھوٹا چودھری ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے شیشے کی ایک نازک گڑیا اچانک اس کے ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گئی ہو۔

شہزادہ سلیم

میٹرک پاس لڑکی آم کے کچے بور کی مانند ہوتی ہے۔کوری کوری' کومل کومل' لچک دار اور خوشبوؤں سے بھری ہوئی۔جس طرف چاہے موڑلو۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے حسن کو نکھارنے کے لیے کسی کی توجہ چاہیے۔پھر دیکھئے اس کی سنہری' زرد سرخ....... للچا دینے والی رنگت۔

نمو یکایک اپنی ہمجولیوں کے درمیان نمایاں ہونے لگی تو سارا کالج حیران رہ گیا۔وہ دبلی پتلی شرمیلی اور بے ڈھنگے لباس والی اس قدر حسین اور تیز طرار بھی ہو سکتی ہے' کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو سکتا تھا۔

ہر روز نئے کپڑے بدل کر آنا' نت نئے فیشن کے بال بنانا' بھینچے رہنے والے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی بہاریں۔آنکھوں میں ستارے رقصاں گال ایسے کہ چھو لینے کو جی چاہے۔

کالج کی ہوا بعض لڑکیوں پر خاطر خواہ اثر ڈالتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا۔

لیکن اصل وجہ نمو کی سہیلیوں کو معلوم تھی جو اسے رشک اور حسد کے ملے جلے جذبات لے کر ملا کرتیں۔

نمو کے خوابیدہ حسن وجوانی کو نکھارنے والا کوئی جادو اثر اشتہاری صابن نہ تھا' بلکہ ڈاکٹر سلیم کا وجود تھا۔

پہلے پہلے تو ڈاکٹر سلیم کی چغلی نمو کے تھرتھراتے ہونٹ اور مسکاتی آنکھیں کھاتی رہیں۔کچھ سمجھے' کچھ نہ سمجھے۔

رفتہ رفتہ جب کالج کے گیٹ کے باہر چھٹی کے وقت ایک خوش پوش جوان سکوٹر تھامے کھڑا نظر آنے لگا۔اور اسے دیکھ دیکھ کر نمو شرمانے لجانے لگی تو سب لڑکیوں کو یک بیک پوری پہلی سمجھ میں آ گئی۔

وہ سو سو طرح سے اس پر آوازے کستیں۔نمو کو چھیڑ چھیڑ کر عاجز کر ڈالتیں۔مگر دل ہی دل میں اس پر رشک کرتیں۔کئی ایک کا تو دل چاہتا کہ کسی نہ کسی طور سلیم نمو کو چھوڑ کر ان پر فریفتہ ہو جائے ایسا اگر ہو سکتا تو وہ اس بات کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھیں۔

مگر نمو اس لحاظ سے بڑی خوش قسمت تھی کہ سلیم نے اس کے علاوہ کبھی کالج کی کسی دوسری لڑکی پر نگاہ نہیں ڈالی تھی۔گیٹ کے باہر

جب وہ نظر آجاتی تو سرتا پا خلوص بن جاتا۔ نگاہوں میں اپنا دل لے آتا۔

سر کو جھکاوے کر اس کے نزدیک یوں اسکوٹر لاتا جیسے دل پیش کر رہا ہو۔ نمو اس وقت گیٹ کے اندر سے جھانکتی ہوئی لڑکیوں کو فخر و غرور سے دیکھتی اور مسکرا کر اس کے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ پلک جھپکنے میں اسکوٹر ہوا سے باتیں کرتا آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ اور نمو اپنے بازو سلیم کی کمر کے گرد حمائل کر لیتی۔

شروع شروع میں تو نمو کو اسکوٹر پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ڈر لگتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ شرم اڑ گئی اور ڈر غائب ہو گیا۔ محبت میں ان دنوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ پھر تو اس نے اپنے معاشقے کا قصہ پہلے علیحدگی میں ہر سہیلی کو سنایا۔

پھر مجموعی طور پر سب کو بتایا۔ اب ساری کلاسیں جانتی تھیں۔ بلکہ کلاسوں کے علاوہ بھی کئی لڑکیاں جانتی تھیں کہ یہ جو سفید کڑکڑاتے کپڑوں میں ایک خوبرو سا نوجوان باہر کھڑا سگریٹ کا دھواں اور خوشبو کی لپٹیں چھوڑا کرتا ہے۔ یہ ماہر امراض چشم ہے۔

اس کے مطلب کے باہر اس کا بڑا سا بورڈ لگا ہے۔ جس پر بیرونی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں بھی درج ہیں۔

نعیمہ نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے لیے دن رات ایک کر ڈالا۔ کیونکہ دادی اماں نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر تیری فرسٹ ڈویژن نہ آئی تو تجھے کالج میں داخل نہیں کراؤں گی۔

امتحان ختم ہوا تو نمو کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ ان میں سرخی رہنے لگی اور پانی رسنے لگا شروع شروع میں گھر کے ٹونے ٹوٹکے کیے گئے۔ دادی اماں کا خیال تھا۔ مکمل آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ مکمل آرام کے باوجود نعیمہ کی آنکھوں کی حالت ویسی کی ویسی ہی رہی۔

آخر کار میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا نعیمہ کی فرسٹ ڈویژن آ گئی۔ کالج میں داخلہ بھی ہو گیا۔ تب دادی اماں کو فکر لاحق ہوئی ایک آنکھیں ہی تو اس کے چہرے پر بے حد خوبصورت تھیں اگر اس عمر میں عینک لگ گئی تو چہرے کو عیب لگ جائے گا۔

دادی اماں نے ڈاکٹروں کے پاس بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ آج یہ دوائی تو کل وہ نہ تک کر کوئی دوا کی جاتی' نہ ہی آرام آتا۔

کسی نے بتایا کہ ولایت سے ابھی ایک ماہر امراض چشم آیا ہے اور بڑی عمدہ تشخیص ہے اس کی۔ دادی اماں اب تک کافی خوفزدہ ہو چکی تھیں۔ نعیمہ کو بازو سے پکڑا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔

وہاں مریضوں کا ہجوم تھا۔ یہ دونوں اپنی باری کے انتظار میں ایک طرف بیٹھ گئیں۔ کیونکہ دادی اماں ڈاکٹر کو بڑے سکون سے ساری کیفیت بتانا چاہتی تھیں۔

سکون ہوا تو ڈاکٹر نے خود انہیں بلایا۔ ڈاکٹر نے بڑی اچھی طرح معائنہ کیا۔ تشخیص ہوئی اور علاج شروع ہو گیا۔

اب نعیمہ کو روزانہ ڈاکٹر کے کلینک میں جانا پڑتا۔ دس دن میں ہی مہینوں کی بیمار آنکھوں کو آرام آ گیا۔

اب جس روز دادی اماں خود ساتھ نہ جا سکتیں۔ وہ شنو کو ساتھ بھیج دیتیں۔ ڈاکٹر کی سچائی پر تو وہ ایمان لے آئی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ جس روز نعیمہ دوائیں اور ہدایات لے کر رخصت ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنے معائنہ کے کمرے کے سفید پردے گرا کی اس کی آنکھوں میں دوائی ڈالتے وقت چپکے سے کان میں یہ بھی کہہ دیا کہ

''آپ کی بیمار آنکھیں تو اچھی ہو گئیں مگر ہمارا اچھا بھلا دل آپ نے بیمار کر ڈالا''

پہلی مرتبہ نعیمہ نے چونک کر ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ عورت ہو یا معصوم لڑکی محبت کی پہلی نگاہ اور مرد کے تیور خوب پہچان جاتی ہے۔ ابھی ایسی عمر نہ تھی کہ دانستہ انجان بن جاتی۔

چھوئی موئی بن گئی۔

لجا گئی۔

لمبی لمبی پلکوں کو جھپکانے الجھانے میں ہی اس نے ڈاکٹر کا دل مٹھی میں کر لیا۔

''پھر ملنے آؤ گی؟''

ڈاکٹر کو اس لڑکی میں سے کچے آموں کی مہک آنے لگی۔

''آنکھیں تو ٹھیک ہو گئیں۔ اب کیسے آ سکتی ہوں۔'' اس نے بھولپن سے کہا۔

''اگر تمہاری آنکھیں اتنی خوبصورت نہ ہوتیں تو انہیں پھر خراب ہو جانے کی بددعا دیتا۔'' ڈاکٹر نے محبت بھرے لہجے میں کہا ''اب تو کوئی بہانہ تمہیں ہی بنانا پڑے گا۔''

اسی رات ننھی منی نعیمہ کے دل میں محبت کی کرن پھوٹی۔ اس کے چاروں طرف اجالا ہونے لگا۔ جس طرف نگاہ اٹھائی اسے ڈاکٹر سلیم روشنی کے احاطے میں کھڑا نظر آیا۔

محبت ایک آسمانی تحفے کی طرح اس کے دل میں اتری اور سلیم کو اس نے من مندر کا پہلا اور آخری دیوتا سمجھ کر سنگھاسن پر بٹھا لیا۔

پھر کبھی کبھار وہ آنکھوں میں سوزش کا بہانہ کر کے ڈاکٹر کے کلینک میں جانے لگی۔ ہر روز وہاں اسے بہت دیر بیٹھنا پڑتا۔ ملاقات کے ایک ایک لمحے میں کچھ کہنے کی بجائے آنکھوں سے کام لیا جاتا۔ دونوں کی آتش شوق بھڑکنے لگی۔

پھر سلیم نے جرات مندی کا ثبوت دیا اور مردانہ وار اپنے قدم آگے بڑھائے۔ خفیہ جگہوں کا تعین کیا گیا۔ ملاقاتیں بڑھیں۔

حجاب ٹوٹے' عہد و پیماں ہوئے۔ وہ سلیم سے چھمی اور یہ نعیمہ سے نمو بن گئی۔

چھمی اور نمو۔

کالج کی ایک نوخیز کہانی۔

پہلے پہل جب نمو دیر سے گھر جاتی تو اسے ایکسٹرا کلاسز کے یا بس نہ ملنے کے کئی بہانے بنانے پڑتے۔ جھوٹ بھی سلیقے سے نہ بول سکتی۔ جس دن سلیم کے ساتھ میٹنی شو دیکھ کر جاتی خواہ مخواہ چور بنی پھرتی' کسی سے نظر نہ ملا پاتی۔ الٹے سیدھے کام کرنے لگتی کوئی اس کی طرف یونہی نظر بھر کے دیکھتا تو اس کا تنفس تیز ہو جاتا۔ اگر نمو اپنے والدین کے ساتھ نہ رہتی ہوتی تو اس کا چور ابھی تک پکڑا گیا ہوتا مگر اپنی بچیوں کی معصومیت میں پلنے والی لغزش والدین کو کبھی نظر نہیں آتی۔

رفتہ رفتہ وہ نہ صرف دیدہ دلیر ہو گئی' بلکہ چھمی بھی اب برابر کالج آنے لگا تھا۔

''یہ اپنے کلینک میں کیا خاک بیٹھتا ہوگا۔''

لڑکیاں اسے چھیڑتیں۔

''سارا وقت تو کالج کے باہر کھڑا رہتا ہے۔''

اب تو نمو چھٹی ہوتے ہی بڑے فخر کے ساتھ اس کے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ دونوں شہر سے دور کسی ریستوران میں کھانا کھاتے کبھی میٹنی شو دیکھتے اور گھر چلے جاتے۔

گھر والوں کو دھوکہ دینے کے لیے نمو نے ایک ریڈی میڈ برقعہ خرید لیا تھا۔ جو ہر وقت اس کے بیگ میں پڑا رہتا' جسے وہ پکچر ہاؤس جاتے ہوئے یا ہوٹل میں جاتے ہوئے اوڑھ لیتی۔ ہر چند کہ اس کے والدین اس پر بہت اعتماد رکھتے تھے اور کبھی اس کی کارکردگی کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ مگر پھر بھی احتیاط تو لازمی تھی۔

ایک سال کا عرصہ تو خواب کی طرح گزر گیا۔ گرمیوں کی لمبی لمبی دوپہریں آ گئیں تو انہوں نے شالامار میں ملاقاتوں کا پروگرام بنایا۔ وہ حجاب جو ہوٹلوں اور باکسوں میں نہیں ٹوٹے تھے' شالامار کی رومان انگیز فضا میں ٹوٹنے لگے۔

سب سے نچلے تختے میں وہ دو درختوں کے جھنڈ میں جا کر بیٹھ جاتے۔ کچے آموں کے بور کی خوشبو اور کوئل کی کوکو ماحول میں رس گھولتی۔ دور دور ہر شخص اپنے آپ میں مگن رہتا۔ وہ ایک دوسرے سے چہلیں کرتے' اچھلتے کودتے درختوں پر باری باری.......

''چھیمی نمو'' اور ''نمو چھیمی'' لکھتے۔

ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر گنگناتے' ایک دوسرے کی تصویریں اتارتے۔ کبھی اس کی زیادتیوں سے تنگ آ کر نمو روتی تو وہ اس کی آنکھیں چوم لیتا۔ ہنستی تو کائنات کا حسن ان کے قدموں میں آ جاتا اور زندگی ان کی مٹھی میں۔

افوہ! کتنے خوبصورت دن ہوتے۔ جی چاہتا ایک ایک پل کو پلکوں سے چن کر موتی کی طرح دل کے تاروں میں پرو لیں۔ یہ خوشبوئیں قید کر لیں' یہ بہاریں چرا لیں۔ ان لمحوں میں جذب ہو جائیں۔ سوئیں تو پھر آنکھ نہ کھلے۔ مارے حسد کے ایک دوسرے کا بال بھی کسی کو نہ دکھائیں۔ وہ جو ایک دوسرے کو چھونے سے جلترنگ سے بجتے ہیں۔ وہ جو ایک دوسرے کو دیکھنے سے نگاہوں میں انگارے سے بھر جاتے ہیں۔

وہ جو تنفس کی گرمی سے اقدار کے بت پگھلنے لگتے ہیں اور وصال کی گھڑیوں کے رموز کہ دو دلوں کے سوا جن کے سحر کو کوئی نہیں جان سکتا۔

نمو رنگ پکڑ رہی تھی' پیلا پیلا' سنہری سنہری' بھرے بھرے جسم والے آم کی طرح۔ اور کالج کی لڑکیاں حیران تھیں' محلے والیاں رشک کر رہی تھیں۔ رشتے ناطے والیاں بغل میں تصویریں اور ڈگریوں والے کارڈ اٹھائے روز ان کی دہلیز پار کرتیں۔ مگر دادی اماں بڑے فخر سے منہ اٹھا کر کہتیں۔

''میری نمو تو بچپنے سے ہی جیدی کی مانگ ہے۔ یہ تو میرے بڑے بیٹے کی بہو بنے گی۔''

جائیداد اور عہدوں کا لالچ بھی دادی اماں کو بنک میں کلرک پوتے کے خلاف نہ کر سکا۔

نمو کو اگر کوئی خطرہ تھا تو یہی .... گو باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی' مگر بزرگوں نے بچپن میں بات طے کر دی تھی۔ نمو نے یہ بات چھیمی کو بتا دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ سارے شہر میں اگر اسے کسی سے خوف آتا ہے تو وہ جیدی ہے۔ اگر اس نے کبھی ڈاکٹر کے ساتھ اسے دیکھ لیا تو قیامت برپا کر دے گا کیونکہ خاندان بھر میں ایک وہی تھا جس نے اس کے کالج میں داخلے کی بھی مخالفت کی تھی۔

چھیمی کے وسوسوں کے جواب میں نمو ہمیشہ کہتی۔

''تم فکر نہ کرو وہ تمہارے اور میرے راستے میں کبھی حائل نہیں ہو سکتا۔ بی اے کرنے کے بعد میں خود منگنی توڑنے کا اعلان کر دوں گی۔ پھر تم اپنی اماں کو بھیجنا۔ ہاں۔''

مگر بی اے کرنے سے پیشتر ہی ایک دن جیدی نے دونوں کو پکچر ہاؤس سے نکلتے دیکھ لیا۔ اس دن نمو اپنا برقعہ گھر بھول آئی تھی۔

بس پھر کیا تھا۔ گھر جا کر اس نے وہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ نمو کا جینا دوبھر ہو گیا۔ نمو روئی چلائی اپنی بے گناہی کے ثبوت پیش کیے۔ مگر گھر والوں کا دل نہ پسیجا۔ انہوں نے نمو کا کالج جانا بند کر دیا۔ اور گھر سے نکلنے پر پابندیاں لگ گئیں۔

تین مہینے اسی عالم میں روتے پیٹتے گزر گئے۔

چھبی کالج کے چکر لگا لگا کر تھک گیا۔ پھر اس کی ایک سہیلی کی معرفت اسے صورتحال کا علم ہوا تو غم غلط کرنے کی خاطر وہ اسی سہیلی کے ساتھ کئی دن تک پرانی جگہوں پر گھومتا رہا۔

خوبیٔ قسمت سے حالات نے رخ اس طرح موڑا کہ جیدی نے اپنے محلے کی ایک لڑکی سے معاشقہ کر کے اچانک شادی کر لی۔

تب نمو کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقعہ مل گیا۔ رو رو کر اس نے سب کے آگے فریاد کی کہ چونکہ جیدی خود منگنی توڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس پر اتنا سنگین الزام لگا دیا۔

دادی اماں نے اس کے آنسو پونچھے۔ اماں واری گئیں اور ابا نے پھر سے کالج جانے کی اجازت دے دی۔ اب اسے بھی تو جیدی کا دیا ہوا غم غلط کرنا تھا۔

چھبی کا اسکوٹر پھر کالج کے باہر نظر آنے لگا تھا۔ شالامار کی دوپہریں پھر رنگ آمیز ہونے لگیں۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں کا حسن لوٹ آیا اور سینما ہالوں کے باکس حجلۂ عروسی کی مانند حسین نظر آنے لگے تھے۔

”اب تم اپنی ماں کو بھیجو نا رشتہ کے لیے۔“

ایک دن نمو نے چھبی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

”آں...... ہاں“ چھبی جیسے چونک سا پڑا اور پھر بولا ” آخری سال تو ہے تمہارا بی اے کا۔ میں سوچتا ہوں بی اے کر لو تو پھر اماں کو بھیجوں گا۔ کم از کم مجھ پر یہ الزام تو نہ آئے کہ میں نے تمہارے چار قیمتی سال عشق کی نذر کر دیئے۔ ویسے بھی میں چاہتا ہوں تمہارے پاس بی اے کی ڈگری ہو۔ شادی کے بعد ہم وطن سے باہر چلے جائیں گے۔ وہاں یہ ڈگری کام آئے گی۔“

”ہنی مون کا زمانہ اگر جنیوا میں گزرے تو کیا مزہ آئے۔“

اپنی خوش بختی پر نمو جھوم جھوم گئی۔ وہ خلوتیں ان خلوتوں سے کتنی حسین ہوں گی جب ضمیر کی خلش نہ ہو گی۔

بی اے کا رزلٹ آ گیا تو نمو اخبار پکڑ کر بھاگی بھاگی چھبی کے کلینک پہنچی اسے اپنی کامیابی کی خوش خبری سنائی۔

چھبی سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ چپ بیٹھا رہا۔

"تم بولتے کیوں نہیں۔ اماں کو کب بھیج رہے ہو، بتاؤ نا؟"

چھبی نے غور سے نمو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بہار گزر چکی تھی۔ آموں کا موسم بیت گیا تھا اس کا چہرہ بے موسم آم لگ رہا تھا۔ ایک موسم اور بیتنے پر جس میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دلنواز شامیں اور خوشبوئیں اس کے جوبن کے خزانے لے اڑی تھیں۔

"نمو میں کافی دنوں سے بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں؟"

"میری ماں نے زبردستی میری منگنی میری خالہ زاد سے کر دی ہے۔"

نمو پر جیسے سارا شالا مار اوندھا ہو گیا۔

"اور تم نے کوئی احتجاج نہیں کیا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے اتنے دن میں کیا کرتا رہا ہوں۔"

"پھر....... پھر؟" وہ جیسے اینٹوں کے اندر سے بول رہی تھی۔

"میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ جب میں نے انہیں منا لیا تو تمہیں اطلاع دوں گا۔"

"اور اگر نہ مانیں تو........" اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "میں زہر کھا کر مر جاؤں گی یہیں تمہارے کلینک کے آگے۔"

"نمو" چھبی نے لہجہ بدل کر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کہو میں خود تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ چار سال تمہاری قربت میں گزار کر اب میں ساری زندگی تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ فی الحال تم میرے یہاں سے چلی جاؤ۔ مریضوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں تمہیں خط لکھوں گا۔ اس سے پیشتر تم ہرگز یہاں نہ آنا ورنہ میں ملنے سے انکار کر دوں گا۔ یہ میری روزی کا سوال ہے۔ یاد رہے۔

جب وہ باہر نکلی تو اس کا ایک ایک قدم زانیہ کی لاش کی طرح بھاری ہو رہا تھا۔

وسوسے.......

خدشے.......

پشیمانیاں.......

وصال کے جلوے ناگ بن کر ڈس رہے تھے اور آج اسے بری طرح احساس ہو رہا تھا کہ وہ تو ایک لڑکی ہے۔

محض ایک لڑکی۔

مجبور و بے بس۔

کھلونا۔

پھر اتنی اونچی اڑان کے لیے اس نے پر کیوں تولے۔

کئی مہینے اس کے خط کے انتظار میں گزار دیئے۔ جو آب حیات بن کر آنے والا تھا۔ پھر گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اس نے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ رشتے کافی آ رہے تھے اور دادی اماں چاہتی تھیں وہ جیدی کا دیا ہوا غم بھول کر کہیں بیاہ رچا لے۔ جب کہ جیدی بھی اب دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔

ایک دن وہ مردہ دل لیے یونیورسٹی سے لوٹی تو کمرے میں ایک سفید لفافہ پڑا تھا۔ مردہ تن میں جان سی پڑ گئی۔ آخر وہ لفافہ مژدہ جاں فزا لیے آ ہی گیا نا۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ لگن سچی ہو تو اثر ضرور لاتی ہے۔ کھول کر دیکھا۔

تو خوبصورت پھولوں میں بسا شادی کا دعوت نامہ تھا۔ نوید مسرت تھی کہ

"ڈاکٹر سلیم احمد فرزند ارجمند پروفیسر کلیم احمد کی شادی خانہ آبادی ہمراہ مس رخسانہ"

اس سے بڑا طمانچہ کوئی مرد کسی غیرت مند لڑکی کے منہ پر نہیں مار سکتا۔

نمو.......

نمو.......

ایک وہ بھی تو لڑکی ہے جو اس کی دلہن بن رہی ہے' اور ایک تو بھی تو ہے کہ دلہن بننے کے اہل نہ رہی۔

آخر کیا نہیں سہہ لیتا آدمی اس دنیا میں۔ پیاری ہستیاں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ان پر صبر کر لیتا ہے۔ دل کے ٹکڑے اور زندگی کے سہارے چھن جانے پر ضبط کر لیتا ہے۔

نمو بی۔

آنکھیں کھول کر نہ چلنے والی لڑکیاں گڑھے میں گر جاتی ہیں۔ روگ دینے والے علاج نہیں کیا کرتے جس موتی کی تم حفاظت نہ کر سکیں' اس کی حفاظت راہزن کیوں کرتا۔ اور پھر موتی کے بغیر سیپی کا کیا وزن؟

موتیوں کے خریدار سیپیاں اور گھونگھے ساحل پر پھینک جاتے ہیں۔

ایم اے کرنے کے بعد جب اس نے ملازمت کے لیے درخواست دی تو دادی اماں طیش میں آگئیں۔

''اتنے رشتے آئے' ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی۔ اب چھوٹی بھی جوان ہوگئی ہے۔ تیرا ڈولا نہیں اٹھے تو اسے کیسے بیاہوں گی۔''

شنو....... ہاں واقعی....... کل کی ننھی منی شنو بھی تو اب سیانی ہوگئی تھی۔ اور اسی سال اس نے کالج میں داخلہ بھی تو لیا تھا۔ نمو کو اس پر پیار آ گیا۔ یونہی اس کے کمرے کی طرف جا نکلی۔

اندر سے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ غالباً اس کی سہیلیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ نمو اس کے کمرے کے آگے سے گزرنے لگی تو شنو کی سہیلی کہہ رہی تھی۔

''اری! پھر آج اس ڈاکٹر کے بچے کو آنکھیں دکھانے گئی تھی۔ ذرا بچ کے رہنا۔ سنا ہے۔ بڑا خطرناک ہے وہ اور خوبصورت آنکھوں والی لڑکیوں کا تو ازلی شکاری ہے۔''

شنو زور زور سے ہنسنے لگی۔

''لگتا ہے کہ تجھے کوئی تلخ تجربہ ہوا ہے۔''

''اچھا بتا تو سہی آج کیا کہنے لگا۔''

''آج آخری دن تھا نا۔'' شنو اتراتے ہوئے بولی ''میں جب دوائی ڈلوا کر آنے لگی تو پتہ ہے وہ کیا بولا۔''

''کیا؟''

''کہنے لگا آپ کی بیمار آنکھیں تو ٹھیک ہوگئیں۔ مگر ہمارا اچھا بھلا دل آپ نے بیمار کر ڈالا۔''

پیشتر اس کے کہ شنو اپنی سہیلیوں کو کوئی اور جواب دیتی۔ نمو لڑکھڑاتے قدموں اور اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔ سب لڑکیاں ٹھٹک گئیں۔

''شنو....... شنو'' نمو نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''میری آنکھوں میں بہت تکلیف ہے۔ تم ابھی کس ڈاکٹر کو اپنی آنکھیں دکھا کر آ رہی ہو۔''

''جی....... جی....... باجی! وہ جو ہے نا ڈاکٹر سلیم' گلی کی نکڑ پر۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا اور ڈرتے ڈرتے نگاہ اس سے ملائی۔ نمو نے اپنی پوری طاقت سے ایک بھرپور طمانچہ شنو کے منہ پر مار....... اور پھر اسے سینے سے لگا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

◆◆◆

پچھلے پہر کی چاندنی

رات کے آٹھ بجے جہاز نے پرواز کی تو ہرے بھرے اسلام آباد کی خوبصورت گھروندوں میں جلتے ہوئے جگمگ دیے میرے قدموں تلے آگئے۔ ہر شخص چاہتا ہے اس کے قدموں تلے دیپ روشن ہوں۔ یہ خواہش جہاز میں بیٹھ کر پوری ہوتی ہے۔ میں نے ننھے سے شیشے میں سے زمین پر چمکتی ہوئی روشنیوں کی بہار دیکھی۔ قطار اندر قطار جگنو سے چمک رہے تھے۔ اسلام آباد کی زمین پر آسمان کا گمان ہو رہا تھا۔

نیچے دیکھ کر میرے دل کو قرار سا آگیا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ اس کالی زمین کی طرح دل بھی ایک اندھا نگر ہے جس میں زندگی سے ملنے والی یادوں کے دیپ روشن ہیں۔ دل کی اندھیری گلیوں میں سناٹا ہو جائے۔ اگر جا بجا منڈیروں پر یادوں کے دیے چمکتے نہ نظر آئیں۔ دل ایک اندھا کنواں ہوتا ہے اگر اس میں یادوں کی کنکریاں اور پتھریاں نہ گرتی رہتیں۔ جہاز نے اڑان کے سارے مرحلے طے کئے' ٹیڑھا میڑھا ہو کر سیدھا ہو گیا اور پھر بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ فضائی پروازوں نے دنیا کو مختصر کر دیا ہے۔ دنیا سمٹ کے قریب آگئی۔ لوگ ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔

میں نے جہاز کے ایک زاویے سے ایک بار پھر اسلام آباد کی زمین کو دیکھا جو نظروں سے اوجھل ہونے جا رہی تھی۔ دور سے اسلام آباد کا چم چم کرتا شہر الف لیلوی دیس نظر آ رہا تھا۔ انہیں حسین اور جگمگاتے گھروں میں ایک گھر کے اندر میرے دل کا قرار تھا۔ ایک گھر نے میرا سکون گروی رکھ لیا تھا۔

گو میں اس بلندی سے اس گھر کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مگر اس عمل پر مجھے وہ گھر دنیا کا خوبصورت ترین گھر لگ رہا تھا اور اسلام آباد خوابوں کا شہر لگ رہا تھا...... جس کی روشنیاں پرے رہ گئی تھیں۔

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ میری بیوی میری ساتھ والی سیٹ پر آنکھیں موندے بیدم سی لیٹی تھی۔ آج کی دھواں دھار بارش کی وجہ سے چار بجے والی فلائٹ رات کے آٹھ بجے لاہور جا رہی تھی۔ ایک تو سارا دن سفارت خانوں کے چکروں میں گزرا تھا دوسرے ساری فلائٹیں رک جانے کی وجہ سے ائرپورٹ کے لاؤنج میں بے تحاشا مسافر بھرے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان بیٹھے بیٹھے ہم دونوں میاں بیوی ادھ موئے ہو گئے تھے۔ ایک تھکا دینے والے انتظار اور بیزاری کے بعد...... ہمارے جہاز کی پرواز کا اعلان

ہوا۔

میں نے دور تک نظریں گھما کر دیکھا' نور برساتا اسلام آباد دور رہ گیا تھا۔ ان بہت سی روشنیوں میں میں نے ایک گھر کا تصور کیا جس میں سیاہ آنکھوں والی تنہا عورت اپنے وجود سے بے پرواہ بیٹھی....... جانے کیا کر رہی ہوگی؟

میں نے محبت کر کے شادی کی تھی۔

رافعہ ہمارے ہمسائے میں رہتی تھی۔ اور میں اپنے محلے میں بڑا لائق فائق لڑکا گردانا جاتا تھا۔ اس لیے محلے کے بچے اکثر کچھ نہ کچھ پڑھنے میرے پاس آ جاتے تھے۔ ہم چونکہ متوسط لوگوں میں سے تھے۔ اس لیے محلے میں اپنی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ذہانت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے والدین اس بات پر فخر محسوس کرتے تھے کہ جب میں یونیورسٹی سے واپس آتا ہوں' تو طالبان علم کا ایک گروہ میرا منتظر ہوتا ہے۔ انہی میں ایک رافعہ بھی تھی۔ جسے میٹرک کے ہر پرچے میں میں نے مدد دی تھی۔ وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگئی تو دونوں گھرانے قریب ہو گئے....... پھر ایف اے میں اس نے سارے مضمون مجھ سے پوچھ کر لیے۔ سوکس اور انگریزی اسے میں ہی پڑھاتا تھا۔ جب وہ بی اے میں پہنچی تو ملازمت کے سلسلے میں میرا تبادلہ شہر سے باہر ہو گیا۔ پھر بھی کبھی چھٹیوں میں گھر آیا کرتا تھا وہ پولیٹیکل سائنس کے ڈھیر سارے سوالات اور شیکسپئر کے اقتباسات جمع کر کے رکھ چھوڑتی۔

ایک دن اس نے نوٹ بک سمیٹتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔

"آپ اپنی ٹرانسفر اسی شہر میں کیوں نہیں کروا لیتے......!"

"کیوں.......؟" میں نے پوچھا.......

"اتنے دن تو ہو گئے آپ کو گئے ہوئے......."

"تمہارے امتحان نزدیک آ رہے ہیں کیا اس لیے.......؟"

"نہیں......." اس نے سر جھکا لیا۔

"آپ کے بغیر یہاں دل نہیں لگتا۔"

"ارے......." میں نے اسے اس طرح دیکھنا چاہا۔ اس کا مذاق اڑانا چاہا جس طرح کسی معصوم اور بے وقوف بچی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ میرے سامنے جوان ہوئی تھی۔ مجھ سے بارہا اس نے ڈانٹ کھائی تھی۔ تنہائی میں گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر پڑھا

تھا۔ میں نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا....... کچھ کہنے کے لیے جب میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو میں لڑکھڑا گیا .... اس کی سیاہ لمبی پلکیں تیزوں کی طرح اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ اور اس کے ان چھوئے ہونٹ اس طرح پھڑ پھڑا رہے تھے جیسے درخت کی چوٹی پر پتنگ پھنسی ہو اور ہوا کے ہلکے اشارے پر بھی پھڑ پھڑ کرنے لگتی ہو....... اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کے چہرے پر عجیب سا اجالا ہوتا ہے' وہ میں نے ابھی ابھی محسوس کیا تھا۔ اور میرے احساس کو جگانے والی رافعہ تھی....... اس نے دوپٹے سے اپنا پورا تن ڈھکا ہوا تھا۔ اور پنسل سے اپنی ہتھیلی پر گل بوٹے بنا رہی تھی' مگر اس کے سارے تن میں چنگاریاں سی دوڑ رہی تھیں۔ اس وقت وہ مجھے گلاب کی شاخ پر تازہ تازہ کھلا ہوا پھول لگ رہی تھی۔ جس کی پنکھڑیوں پر رات کے کسی لمحے میں شبنم کے موتی گر گئے تھے۔ اور وہ اب اس سے سنبھالے نہ جا رہے تھے۔

"کیوں نہیں لگتا بھئی تمہارا دل میرے بغیر.......؟" میں نے اپنے انداز کو بدلے بغیر اس طرح کہا جیسے مجھے کہنا چاہیے تھا ...."جب کہ سارے محلے کا دل میرے بغیر لگ گیا ہے۔"

"میں سارے محلے کی وکالت کرنے نہیں آئی......." اس نے اپنے دل کا غصہ ہونٹوں میں دبایا۔

"اچھا تم اپنے دل کی وکالت کرنے آئی ہو.......؟"

"اونہہ......." وہ بل کھا کر جانے کو مڑی۔

"اچھا تو تمہارا مشورہ ہے کہ میں واپس اپنے شہر میں ٹرانسفر کرا لوں.......؟"

میں اسے روکنا چاہتا تھا۔ ابھی ابھی اس نے مجھے جگایا تھا۔ اور جاگ کر میں اپنے جاگنے کا خود یقین کر لینا چاہتا تھا۔

"مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں....... اگر آپ کا دل وہاں لگ گیا ہے تو رہنے دیں.......؟"

اس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بڑی ظالم شے ہوتی ہے جوان لڑکی' قدرت نے اس کے ہاتھ میں ایک ان دیکھا نشتر دیا ہوتا ہے۔ جب چاہے مرد کے سوئے ہوئے احساس میں چبھو دے۔

"میں وہاں دل لگانے تو نہیں گیا تھا۔"

"تو کیا کرنے گئے تھے.......؟"

"نوکری کرنے گیا تھا......."

"اچھا تو پھر نوکری کیجیے......."

''تمہارا دل جو نہیں لگتا یہاں میرے بغیر.......'' میں نے بھی اب چوٹ کھائے ہوئے انداز میں کہا۔

اس نے سر کو جھٹک کر دیکھا اور بھاگ گئی۔

یہ ہوتی ہے عورت۔

مرد کے پرسکون سمندر میں ایک کنکری پھینک کر ہلچل مچا جاتی ہے۔ اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہوگا۔ میرا دل بوجھل ہو گیا۔

کبھی کبھی کا ٹکراؤ....... ننھے ننھے فقرے اور غلافوں میں لپٹی ہوئی عام سی لڑکی....... بال آخر میری زندگی کی آرزو بن گئی۔

زندگی کے سفر میں نزدیک تر لوگ ہمراہی بن جاتے ہیں۔

رافعہ اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ زندگی کے ساتھ ہم چل پڑے۔ میں نے بہت محنت کی جس طرح متوسط طبقے کا ہر نوجوان اپنے خاندان کو اعلیٰ مقام دلانے کے لیے کرتا ہے۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ بڑا بیٹا امریکہ میں رہتا ہے۔ دو بیٹیوں کی شادی کر دی ہے۔ پچھلے مہینے میری چھوٹی بیٹی کی شادی تھی۔ اور اب ہم دونوں میاں بیوی مستقل رہائش کے لیے امریکہ رہنے اپنے بیٹے کے پاس جا رہے ہیں۔ میرا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ وہاں بہت اچھی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے میرے لیے بھی ایک جاب کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس کا خیال ہے باقی ماندہ زندگی مجھے اور رافعہ کو اپنی مرضی سے وہاں بسر کرنی چاہیے۔ رافعہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس لیے ہم دونوں سفر کے یہ سارے مراحل طے کرنے اسلام آئے ہوئے تھے۔

محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔

ایک محبت جسم سے ہوتی ہے اور ایک روح سے....... جوانی میں ہم ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ روح کی محبت کیا ہوتی ہے؟

مگر اوائل جوانی میں محبت صرف جسم کی محبت ہوتی ہے۔ اس لیے اس محبت میں انا کے بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ مگر جسم کے تقاضوں کے آگے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ یہی محبت انسان کو بشر کے جامے میں رکھتی ہے۔

دوسری محبت روح کی محبت ہوتی ہے۔

کسی دن اچانک آپ کی ملاقات کسی روح سے ہوتی ہے۔ روح کا جسم نہیں ہوتا وہ کیف ہی کیف ہوتی ہے۔ مدھ ہی مدھ ہوتی ہے۔ اسے ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا۔ اسے چھونے کو جی نہیں چاہتا۔ بس دیکھنے کو اور دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اسے محسوس کر لینے اور دل میں اتار لینے کو جی چاہتا ہے....... وہ کسی دن خود بخود آ کے ہماری روح سے ٹکرا جاتی ہے....... اس کو کسی شے سے تشبیہ نہیں

دی جا سکتی .... نہ ڈوبتی ہوئی شفق رنگ شام سے نہ ابھرتی ہوئی نومولود خوشبودار صبح سے .... نہ چلچلاتی ہوئی سنسان دوپہر سے .... مگر وہ ان سب میں حلول ہو کے زندگی میں اتر جاتی ہے۔

ایسی محبت کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ عام طور پر اس عمر میں ہوتی ہے۔ جب سرکش جذبے تھک ہار جاتے ہیں۔ اگر جسمانی ضروریات ہی آسودگی کا پیمانہ ہیں تو پھر سب کچھ پا لینے کے باوجود آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو پیاسا کیوں محسوس کرتا ہے۔ دولت' آرام' اقتدار' شہرت' آسائشیں سب مل کر بھی زندگی کو مکمل نہیں کرتیں۔ ہمیشہ ایک تشنگی سی باقی رہتی ہے۔ جسے بے وقوف انسان مختلف نام دے کر اپنی کمزوریاں یا اپنی طاقتیں بنائے رکھتا ہے۔ اور اپنی ذات کی جنگ اپنے ذہن کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔

اس کی روح کو اس دن قرار آتا ہے جب وہ اپنی روح سے بچھڑی ہوئی روح سے ملاقات کر لیتا ہے۔

اس روز امریکی سفارت خانے کے اندر جب میں اور میری بیوی داخل ہوئے تو وہ سر جھکائے کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کے دفتر میں ضرورت کی ہر شے تھی۔ اور لگتا تھا وہ مستعدی سے کام کرنے کی عادی ہے۔

اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ کالی آنکھوں میں کاجل کے دائرے تھے۔ مگر سیاہ رات کے عین بیچ آنکھ کی چتلیوں کے پاس کوئی ستارہ چمک رہا تھا۔ جو بھولے بھٹکوں کو زندگی کا راستہ دکھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اتنی روشن تھیں مگر اس کا چہرہ اداس تھا۔ وہ بہت نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔ مگر اس کے لہجے میں بڑی خوشبو تھی۔

میں نے کاغذات اس کے سامنے میز پر رکھ دیئے اور جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری بیوی بیٹھ گئی۔ کارروائی شروع ہو گئی۔ کوئی آ رہا تھا' کوئی جا رہا تھا۔ سب کا کام ہو رہا تھا۔ میں اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

ہمارے بیٹھے بیٹھے وہاں لنچ ٹائم ہو گیا۔ اور اچانک میری بیوی کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ رافعہ کو کچھ عرصہ سے ''ورٹی گو'' Vertigo کی تکلیف ہے۔ اسے چکر آنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ پھر کہنے لگی۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں سائڈ روم میں لٹا آتی ہوں۔'' وہ رافعہ کو ساتھ لے گئی۔ وہاں اسے دوائی دی' چائے پلائی۔ سائیڈ روم میں لٹایا۔ جب وہ سو گئی تو دروازہ آہستہ آہستہ بند کر کے واپس آ گئی۔

میں نے کہا' 'لنچ ٹائم ہے۔ کیا آپ گھر نہ جائیں گی.......؟''

کہنے لگی۔ ''آج آپ کا کام کرنا بہت ضروری ہے' آپ کی بیگم بیمار ہیں۔ اگر آپ کا کام آج ہو گیا تو ان کی طبیعت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔''

”مگر یہ تو آپ کے ساتھ زیادتی ہے.......؟“

اس نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔

پتہ نہیں بعض آنکھیں کیسی ہوتی ہیں....... مسکرا رہی ہوتی ہیں۔ مگر اداس کر دیتی ہیں۔ اتنی ان کہی کہانیاں تھیں ان آنکھوں میں کہ میں راستہ بھول گیا....... وہ ایک گھنٹہ جو میں نے وہاں گزارا میری ساری زندگی پر محیط ہو گیا۔

اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ وہ دس سال سے سفارت خانے میں ملازم تھی....... دس سال پہلے اس کا شوہر ایک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ دو کمروں کا ایک خوبصورت فلیٹ تھا۔ جس میں وہ رہتی تھی۔ فالتو وقت میں پینٹنگ کیا کرتی۔ جب کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو دنیا کی سیر پر نکل جاتی۔

اس کی باتوں میں وہ سب کچھ تھا جو اس نے اس دنیا میں تلاش کر لیا تھا اس کے کام کرنے کے انداز میں بڑی لگن تھی اور وہ زندگی کو سمجھ کر اس کے ساتھ برت رہی تھی۔ تبھی وہ ہر ایک کی بات کو توجہ سے سنتی اور بڑی تشفی سے اس کا جواب دیتی۔ یوں لگتا تھا اس نے گیان کا کوئی بھید پا لیا ہے اور عرفان کی کسی منزل میں ہے۔

اس کا رویہ عام ملازمت پیشہ عورتوں جیسا نہ تھا۔ رعونت سے بھرا ہوا کھردرا' کھردرا یا بناوٹی۔

ملازمت پیشہ عورت دفتر میں خواہ کتنی خندہ پیشانی سے مسکراتی رہے۔ کھردری ہو جاتی ہے۔ خوب صورت لباس اور سلیقہ مند میک اپ کے باوجود اس کے اندر کی ملائمت ختم ہو جاتی ہے....... اگر وہ عورت شادی شدہ ہو تو کئی بار دوران گفتگو اس کے لہجے کی تلخی چھلک چھلک پڑتی ہے....... اس کی نا آسودگی کا اظہار کسی نہ کسی طور ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن وہ....... اپنی زندگی کی داستان یوں سنا رہی تھی۔ جیسے وہ پرائمری سکول میں اپنی کامیابیوں کا قصہ سنا رہی ہو۔

اس ایک گھنٹے کی ملاقات میں میں نے اس سے سب کچھ پوچھا....... مگر دو باتیں دانستہ نہیں پوچھیں....... ایک تو میں نے اس کا نام نہیں پوچھا کیونکہ تختی پر درج تھا ”مسز افگن“ اگر میں اس کا اصلی نام پوچھ لیتا تو مجھے معلوم ہے وہ اس کی شخصیت کی طرح ہی خوبصورت ہوتا اور ہمیشہ کے لیے میرے کلیجے میں پھانس کی طرح اٹک جاتا۔ پھر یہ کہ میں روح کو کوئی نام بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اور دوسرے میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ.......

”اس نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی.......؟“

وہ دل کشی کی مورت تھی۔ کئی طالب راستے میں آئے ہوں گے۔

میں اس کو جاب سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ادراک کے جن جنگلوں کی جوگن بن چکی تھی' وہاں اس کا وجود اس پیالے کی طرح تھا۔ جو بھرتا بھی نہ ہو اور چھلکتا بھی نہ ہو۔ اور اس کیفیت نے اس کے گرد دلکشی کا ایک ہالہ بنا دیا تھا۔

پتہ نہیں بعض لوگوں سے مل کے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم چلچلاتی دھوپ میں سے نکل کر ٹھنڈے میٹھے سائے میں آ گئے ہوں۔ میری اس کی ملاقات کنکریٹ کی ایک سہ منزلہ عمارت کے اندر ہوئی تھی' مگر یوں لگتا تھا۔ ارد گرد ایک سبزہ زار اگ آیا ہے۔ آسمان پر اودے بادل ہیں اور پروا کی ہوا اپنے آپ کمرے کے اندر در آئی ہے۔ تا حد نظر سبزہ ہی سبزہ ہے۔ آنکھوں میں اتر جانے والا۔

اس سے ملنے کے بعد جی اتنا مسرور ہوا کہ میں مسلسل اداس ہوں۔

زندگی میں خوشیاں بھی ملیں...... پریشانیاں بھی آتی رہیں۔ کبھی بچوں کی کبھی ملازمت کی' کبھی روزگار کی' کبھی بیماری کی ...... قربت داریاں' خوشیاں بخشتی رہیں اور تکلیفیں۔ پھول بھی ملتے رہے' کانٹے بھی چبھتے رہے۔ حیات کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ پیارے رشتوں کی جدائی کا کرب بھی جھیلا...... میں پریشان اور دل گرفتہ تو ضرور رہا ہوں' کبھی اداس نہیں ہوا......

اداس تو بس محبت کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

آج عرصہ دراز کے بعد میرا جی عجیب طرح بوجھل ہے۔

اداسی دل زندگی کی علامت ہے۔

اداسی تمنا اور آرزو کی علامت ہے۔

دور کہیں ہولے ہولے جیسے پہاڑ پر اداسی کی برف گر رہی ہے۔

میرے سفید بال اس برف کو سلام کر رہے ہیں۔

آج کی یہ ساری اداسی میں اس خوبصورت سیاہ آنکھوں والی عورت کے نام کرتا ہوں جس کا میں نام بھی نہیں جانتا؟

ابھی ابھی جہاز نے لاہور کے انٹرنیشنل ہوائی اڈے کی زمین کو چھوا ہے۔ میں نے اپنی سوئی بیوی کا کندھا ہلایا۔

اور اب میں اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کے اتر جاؤں گا؟